اسلام اور مستشرقین

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (۲۷۶۰۰۱)

اسلام اور مستشرقین

جلد ہفتم

اسلامی علوم واشخاص کے بارہ میں مستشرقین کی غلطیوں کی تصحیح پر مشتمل
معارف کے مقالات، ترجمے، تلخیص وتبصرے، ان کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ
اوران کی بین الاقوامی کانفرنسوں کی روداد

مرتبہ
ڈاکٹر محمد عارف عمری

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، یو۔ پی (الھند)

بحق دارالمصنفین سلسلہ نمبر: ۱۹۳

نام کتاب : اسلام اور مستشرقین (جلد ہفتم)

مرتب : ڈاکٹر محمد عارف عمری

صفحات : ۳۲۴

طبع اول : ۲۰۰۶ء

ناشر : دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (یو۔ پی)

مطبع : معارف پریس شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ (یو۔ پی)

باہتمام

عبدالمنان ہلالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ الکریم

محمد الامین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

مسلمانوں نے ابتدا ہی سے علم وفن کی تحصیل پر پوری توجہ دی اور اپنے دور عروج میں نہ صرف مذہبی بلکہ ہر طرح کے علوم طبیعیات، سائنس، طب، ریاضی، جغرافیہ اور ہیئت وغیرہ میں ایسا شاندار اور قابل فخر علمی ذخیرہ یادگار چھوڑا جس کی مثال کسی اور قوم کے یہاں نہیں ملتی۔

لیکن جب ان کے تنزل کا دور شروع ہوا اور ان کی حکومتیں داخلی انتشار اور عدم استحکام کا شکار ہوئیں تو ان کی علمی ترقی رک گئی پھر جب یورپ کا سیاسی غلبہ وتسلط ہوا تو علم وفن اور حکمت ودانش کی باگ ڈور بھی اسی کے ہاتھوں میں چلی گئی، جہاں جہاں اہل یورپ کا قبضہ ہوا وہاں وہاں کے جو علمی ذخائر ان کے ہاتھ لگے انھیں یورپ لے گئے، اس طرح مسلمانوں کی بہت سی بیش قیمت اور نادر ونایاب کتابیں وہاں پہنچ گئیں، جس کے متعلق ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے:

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

تاہم یورپ کے علما اور مستشرقین کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے اسلامی دنیا کے قیمتی سرمایے کو شائع کر کے از سر نو زندہ کیا اور باوجود اس کے کہ انھیں اسلام سے کوئی واسطہ نہیں تھا انھوں نے مسلمانوں کے علوم وفنون کی نادر ونایاب کتابوں کی فراہمی، ترتیب وتدوین اور تصحیح وتحشیہ میں بڑی عرق ریزی اور محنت کی، مارگولیتھ نے مسند امام احمد بن حنبلؒ کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا جس کی توفیق اکثر مسلمانوں کو بھی نہیں ہوئی ہوگی۔ یہ مستشرقین کا بڑا

احسان ہے اور اس کے لئے وہ شکریے کے مستحق ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ علمی خزانے ان کے نہیں تھے، اس لئے اولاً تو ان کو ان سے اس درجہ کی واقفیت نہیں تھی، جس درجہ کی واقفیت مسلمانوں کو ہے ثانیاً ان کو اسلامی علوم سے وہ ہمدردی و محبت بھی نہیں ہوسکتی تھی جو مسلمانوں کو ان سے ہے، اس بناپر مستشرقین سے کچھ نادانستہ بھی غلطیاں ہوئیں، لیکن ان کی اکثر غلطیاں دیدہ و دانستہ اور ان کے عناد و تعصب کا نتیجہ ہیں انھوں نے حق شناسی اور غیر جانب داری سے کام نہیں کیا، تحقیق کا مقصد حق و صحیح کو آشکارا کرنا ہے، مگر انھوں نے حقائق کے انکشاف کے بہ جائے کتمان حق، تلبیس، تدلیس، فریب دہی اور حق و باطل کو گڈمڈ کیا ہے۔ ان کی تحقیقات اور بحث و استنباط کے نتائج کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھنے اور ان کے علوم کو سیکھنے کا کام ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے علوم و فنون، تاریخ و تمدن، قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو اعتراضات کا نشانا بنا کر مسلمانوں کو گم راہی اور شک وشبہ میں ڈالا اور ان کے علوم و معارف سے بے گانہ کردیا جائے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کے یہ اعتراضات نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں ہی میں نہیں بعض علمائے اسلام میں بھی سرایت کر گئے ہیں۔

مستشرقین مسلمانوں کے جو علمی خزائن منظر عام پر لائے ان میں اور اپنی اسلام سے متعلق تصانیف میں بھی انھوں نے صحیح واقعات کو توڑ مروڑ کر نیا اور غلط رنگ دے کر ان کا اصلی اور حقیقی رنگ غائب کردیا، جس حقیقت کو چاہا افسانہ اور جس افسانے کو چاہا اپنی رنگ آمیزی سے حقیقت بنادیا اور سچائی اور اصلیت کو اپنی ملمع کاری سے جھوٹ اور فریب ثابت کردیا، وہی مارگولیتھ جس نے مسند احمد کی چھ جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا تھا جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری لکھتا ہے تو بہ قول مولانا شبلی ”دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کذب و افترا اور تاویل و تعصب کی مثال پیش نہیں کرسکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو نہیں ہوسکتا، صرف اپنی طباعی کے

زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔ (مقدمہ سیرۃ النبیؐ حصہ اول ص ۹۶ مطبوعہ معارف پریس ۱۹۸۱ء)

انیسویں صدی میں عیسائی مشنریاں اور مستشرقین دونوں ہی اسلام کے لئے خطرہ بنے ہوئے تھے، عیسائی مشنریوں کے اعتراضات کا جواب دینا آسان تھا اور یہ کام اس زمانے کے متعدد قدیم طرز کے علمانے بہ خوبی انجام دیا، مگر دوسرے گروہ کا جواب دینا آسان نہیں تھا کیونکہ مستشرقین بہت پڑھے لکھے تھے، ان کا جواب وہی لوگ دے سکتے تھے جو قدیم تعلیم سے بہرہ ور اور اپنے مذہب سے پوری طرح باخبر ہونے کے ساتھ جدید علوم وافکار اور نئے خیالات ونظریات سے بھی واقف ہوں، اس زمانے کے علما میں مولانا شبلیؒ میں یہ دونوں خوبیاں بہ درجہ اتم پائی جاتی تھیں چنانچہ اس وقت مستشرقین کے جو اعتراضات بہت عام تھے ان کا جواب مولانا نے بہت مدلل ومحققانہ اور اتنے دلنشیں اور دل کش انداز میں دیا کہ مستشرقین کے اعتراضات کے تار وپود بکھر گئے۔

مولانا شبلیؒ کی یہ وراثت دارالمصنفین کے حصے میں بھی آئی، مولانا سید سلیمان ندویؒ بھی مستشرقین کے زہر کا تریاق مہیا کرنے میں منہمک رہے اور معارف کے صفحات بھی ان کے لئے وقف کردئے، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی جدوجہد سے ۱۹۸۲ء میں ''اسلام اور مستشرقین'' کے عنوان سے دارالمصنفین میں ایک سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس ہوئی، پھر ان کو خیال ہوا کہ اس میں پڑھے گئے سارے مقالات اور دارالمصنفین کی کتابوں اور معارف سے بھی اس سے متعلقہ مواد ومضامین کو اکٹھا کر کے شائع کردیا جائے، اس سلسلے کے کئی حصے ان کی زندگی ہی میں شائع ہوگئے تھے، جو بہت مقبول ہوئے۔

اب اسی سلسلہ زریں کا یہ ساتواں حصہ مولوی محمد عارف عمری صاحب کی محنت و جانفشانی سے ترتیب پایا ہے، یہ بھی وقیع مضامین پر مشتمل ہے، اسے شائع کر کے ہمیں خوشی ہو رہی ہے امید ہے کہ علمی حلقوں میں اس کی بھی پذیرائی ہوگی۔

ناچیز

ضیاء الدین اصلاحی

یکم صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

فہرست مضامین

اسلام اور مستشرقین (جلد ہفتم)

مستشرق نولدیکی اور قرآن

مولانا محمد اویس ندوی نگرامی مرحوم، سابق رفیق دارالمصنفین

''مستشرقین یورپ'' جن کے فضل وکمال کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا، اور جن کی تلاش وتحقیق کا رعب دماغوں پر چھایا ہوا ہے، وہ اسلام کی عداوت میں کبھی ایسی عامیانہ اور جاہلانہ روش اختیار کرتے ہیں جس پر سطحی معلومات والا انسان بھی ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا، چنانچہ مشہور جرمن محقق و مستشرق نولدیکی جس کے علمی افلاس کا یہ عالم ہے کہ وہ قرآن پاک کو (نعوذ باللہ) تصنیف محمدیؐ بتلاتا ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا[1] میں قرآن مجید پر ریویو کرتے ہوئے حضرت محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے متعلق لکھتا ہے، کہ عرب سے تو انھیں واقفیت تھی لیکن بیرون عرب کا جہاں ذکر کرتے ہیں، وہاں ان کی بے خبری (لفظ کا اصلی ترجمہ جہالت ہے) کی پردہ دری ہو جاتی ہے چنانچہ مصر کی زرخیزی کو جہاں کہ بارش تقریباً نہیں دیکھی جاتی ہے وہ دریائے نیل کے سیلاب کے بجائے بارش پر منحصر رکھتے ہیں، واقعہ کی اصل صورت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب قید خانہ میں تھے، تو مصر کے بادشاہ نے خواب دیکھا، کہ سات موٹی گائیں ہیں، اور سات دبلی دبلی گائیں موٹی کو نگل گئیں، اور سات شاداب بالیں ہیں، اور سات خشک، خشک بالوں نے سبز بالوں کو کھالیا شاہ مصر کے خواب کی حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر دی جس کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ	آپ نے فرمایا کہ تم سات سال متواتر غلہ بونا، پھر جو فصل کاٹو اس کو بالوں میں رہنے دینا، ہاں مگر تھوڑا سا جو تمہارے کام میں

(۱) جلد ۱۵ صفحہ ۹۰۰ طبع یازدہم کیمبرج یونیورسٹی

ذٰلِکَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْکُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۞ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ وَفِیْهِ یَعْصِرُوْنَ.

(یوسف: ۴۷-۴۹)

آئے، پھر اس کے بعد سات برس اور ایسے سخت آئیں گے، جس کو تم نے ان برسوں کے واسطے جمع کیا ہے، مگر تھوڑا سا جو تم رکھ چھوڑو گے، پھر اس کے بعد ایک برس ایسا آئے گا، جس میں لوگوں کے لئے خوب بارش ہوگی (یا فریادرسی ہوگی) اور اس میں شیرہ بھی نچوڑیں گے۔

اس تعبیر میں ایک لفظ (یغاث) ہے جس کا مفہوم یہ لیا گیا ہے، کہ بارش ہوگی جرمن مستشرق کے نزدیک مصر کے سلسلہ میں بارش کا ذکر نعوذ باللہ صاحب قرآن کی بے خبری کی دلیل ہے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

بے خبر انسان کو خدائے علیم وخبیر کے کلام پر تنقید کی جرأت؟ ذیل کی سطروں میں اس تنقید کی اصل حقیقت آشکارا کی گئی ہے۔

(۱) اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ (یغاث) کے معنی صرف پانی برسنے کے نہیں ہیں مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے، کہ یہ غیث (بمعنی بارش) سے مشتق نہیں ہے، بلکہ اس کا مادہ غوث ہے جس کے معنی فریادرسی کے ہیں، یعنی اس قحط کے بعد ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں کی فریادرسی ہوگی اور قحط دور ہوگا اس قحط کے خاتمہ کا سبب بارش ہوگی، یا نیل کا سیلاب؟ اس کا یہاں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

روح المعانی[1] میں ہے:

ای یصیبهم غیث ای مطر کما قال ابن عباس ومجاهد والجمهور فهو من غاث الثلاثی الیائی وقیل هو من الغوث ای الفرج یقال اغاثنا اللہ تعالی اذا

یعنی ان کو پانی پہنچے گا، جیسا کہ ابن عباس، مجاہد اور جمہور نے کہا ہے، اس وقت اس کا مادہ غیث ہوگا، اور کہا گیا ہے کہ اس کا مادہ غوث ہے، یعنی فریادرسی اور مصیبت کا دور کرنا، کہا جاتا ہے:

(۱) جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۹

اغاثنا امدنا برفع المكاره حين اظلتنا فهو رباعي واوی.

اغاثنا الله جب کہ خدا ہماری مصیبتوں کو دور کرے۔

بیضاوی[1] میں ہے:

يمطرون فيه من الغيث او يغاثون من القحط من الغوث.

بارش ہوگی جب کہ مادہ غیث ہو، اور اگر مادہ غوث ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قحط ان سے دور کیا جائے گا۔ ان کی فریادرسی ہوگی۔

ثعالبی کی جواہر الحسان[2] فی تفسیر القرآن میں ہے:

جائز ان يكون من الغيث وهو قول ابن عباس وجمهور المفسرين اي يمطرون وجائز ان يكون من اغاثهم الله اذا فرج عنهم ومنه الغوث وهو الفرج.

جائز ہے کہ غیث سے ہو جیسا کہ ابن عباس اور جمہور مفسرین کا قول ہے، یعنی بارش ہوگی اور جائز ہے کہ غوث سے ہو، جس کے معنی فریادرسی کے ہیں یعنی ان کی مشکل دور کی جائے گی۔

(۲) اور اگر عام مفسرین کے مسلک کے مطابق بارش ہی کے معنی لئے جائیں، تو بھی فاضل مستشرق کا یہ دعویٰ کہ مصر میں بالکل بارش نہیں ہوتی ہے، غلط ہے، بارش کم سہی لیکن اس کا مطلقاً انکار خلاف واقعہ ہے۔

یعقوبی کتاب البلدان میں کہتا ہے کہ مصر میں سواحل پر کسی قدر بارش ہوتی ہے۔[3]

الحضارۃ المصریہ[4] میں ہے کہ یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ وادی نیل بارش سے محروم ہے۔

ای بارسڈن وٹی آسفورڈ اسمتھ کے جغرافیہ عالم میں ہے[5]۔

''بارش یہاں بہت ہی کم یعنی قاہرہ میں ایک انچ سالانہ اور اسکندریہ میں جو سمندر سے متصل واقع ہے، ۱۸ انچ سالانہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔

(۳) مصر کے وہ مقامات جہاں فراعنۂ مصر کا قیام تھا، ان کا بارانی ہونا تو بہرحال ثابت ہے، چنانچہ مصر کے سواحل اور قاہرہ جو ساحل دریائے نیل پر چودہ میل مربع رقبہ میں آباد ہے۔ وہاں بارش کا ہونا معلوم ہو چکا ہے، تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ فراعنۂ مصر کا قیام قاہرہ سے قریب ہی

(۱) بیضاوی ج ۱ ص ۳۹۹ (۲) جواہر الحسان ج ۲ ص ۲۴۱ (۳) کتاب البلدان، صفحہ ۳۴۰ (۴) الحضارۃ المصریہ، صفحہ ۸
(۵) جغرافیہ عالم ج ۲ ص ۱۶۳، حیدرآباد

منف اور عین شمس میں رہا کرتا تھا، ابوالفداء کی تقویم البلدان میں ہے کہ عین شمس کو مدینۂ فرعون کہا جاتا ہے اور یہ قاہرہ سے نصف مرحلہ پر واقع ہے۔ (۱)

یاقوت نے معجم البلدان میں منف کو فرعون کا شہر بتلایا ہے اور یہاں کے آثار قدیمہ کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ یہیں حضرت یوسف علیہ السلام کا مکان تھا یہیں فرعون کا قیام بھی رہا کرتا تھا، اور یہیں فرعون کا عین شمس تھا اور اس وقت فسطاط کا جو محل وقوع ہے وہ عین شمس اور منف کے درمیان ہے۔ (۲)

اصل یہ ہے کہ عین شمس ایک ہیکل تھا، لوگ اس کی زیارت کو آتے تھے، پھر یہاں آبادی قائم ہوگئی اور رفتہ رفتہ اس آبادی نے شہر کی حیثیت اختیار کر لی، ورنہ یہ منف سے الگ نہیں ہے۔ (۳)

خطط مقریزی میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حضرت یعقوب علیہ السلام اور پورے خاندان کو جس میں ۷۳ مرد اور عورتیں شامل تھیں، فرما اور عین شمس کے درمیان ٹھہرایا تھا اور یہاں کی زمین بہت شاداب ہے۔ (۴)

اب بھی عین شمس قاہرہ کے مضافات میں موجود ہے، مسلمان اس کو عون اور یورپی لوگ ہیلوپوس کے نام سے یاد کرتے ہیں، اب یہاں بڑے بڑے مکانات اور شاندار ہوٹل ہیں، قاضی ولی محمد صاحب اپنے سفرنامۂ مصر ۱۹۲۴ء میں لکھتے ہیں:

> ''کہتے ہیں کہ اس جگہ کو حضرت موسیٰ کی اقامت گاہ کا شرف حاصل ہوا تھا اور فرعون کا محل بھی یہیں کہیں تھا، اور یہیں عزیز مصر کے بنگلہ میں زلیخا رہتی تھی، اس جگہ ہیکل شمسی تھا، جہاں آفتاب پرستی ہوتی تھی۔'' (۵)

ان تفصیلات سے معلوم یہ ہوا کہ فراعنۂ مصر قاہرہ کے قریب ہی آباد تھے، اور وہاں بارش ہوتی تھی، اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب میں اگر بارش کا ذکر تسلیم کیا جائے، تو یہ کوئی خلاف واقعہ بات نہیں ہے۔

(۴) محقق مستشرق نے مصر کی زرخیزی کو دریائے نیل پر منحصر رکھا ہے، لیکن اس پر غور نہیں کیا کہ خود دریائے نیل کا پانی بھی بارش ہی کے پانی کا نتیجہ ہے۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ مصر اور اس کے دیہاتوں کا کام نیل سے چلتا ہے، اور نیل کے پانی

---

(۱) تقویم البلدان ص ۱۱۸ (۲) معجم البلدان ج ۴ ص ۱۸۱ (۳) مقریزی ج ۱ ص ۳۱۸ (۴) ایضاً ج ۱ ص ۲۹۷

(۵) سفرنامہ مصر قاضی ولی محمد۔ ص ۱۱۴

میں بارش کے اس پانی سے زیادہ ہوتی ہے، جو گرمی میں برستا ہے۔

الحضارة المصر یہ میں ہے:

''اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ نیل کا فیضان اس بارش کا نتیجہ ہے جو مارچ میں وسط افریقہ میں ہوتی ہے جہاں کہ دریائے نیل کا منبع ہے، اور وہاں سے مصر کی طرف یہ پانی سرسبزی اور شادابی لے کر آتا ہے۔''[1]

عہد حاضر کے مشہور عالم علامہ سید رشید رضا مرحوم جن کی پوری زندگی تقریباً مصر ہی میں گذری وہ اپنی تفسیر[2] میں فرماتے ہیں کہ مصر کو بارش کے پانی سے مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا ہے، کہا جاتا ہے کہ مصر کی زندگی بارش سے نہیں بلکہ نیل کے پانی سے ہے حالانکہ خود نیل کا پانی بارش ہی کا ممنون ہے، نیل کا فیضان اور اس کی کمی درحقیقت ان مقامات کی بارش پر منحصر ہے، جہاں سے نیل میں پانی آتا ہے، اس ضمن میں علامہ مرحوم نے قرآن پاک کی یہ آیت نقل فرمائی ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَآءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْاَرْضِ (زمر: ۲۱)	کیا نہیں دیکھا تم نے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کو زمین کے سوتوں میں داخل کر دیتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ چھوٹے دریا جو نیل کے ینابیع ہیں وہ بارش ہی کے پانی سے ہیں۔

یہاں فرعون کا وہ مقولہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے، جس کو قرآن پاک نے نقل فرمایا ہے:

قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهَارُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (زخرف: ۵۱)	اے میری قوم! کیا مصر کی سلطنت میری نہیں ہے اور یہ نہریں میری پائیں میں بہہ رہی ہیں۔

اس سلسلہ میں قرآن پاک کی ایک دوسری آیت بھی قابل توجہ ہے، قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی بتائی ہے کہ ہم ان مقامات پر پانی پہنچاتے ہیں جہاں بارش نہیں ہوتی ہے، یا اگر ہوتی ہے تو اس قدر کم کہ اس سے پورا نفع نہیں اٹھایا جاسکتا ہے۔ فرمایا:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَاءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا	کیا انھوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ ہم خشک افتادہ زمین کی طرف پانی پہنچاتے

(۱) الحضارة المصر یہ ص ۸ (۲) جلد ۲، ص ۶۵

تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ (سجدہ۔۲۷)

ہیں پھر اس کے ذریعہ سے کھیتی پیدا کرتے ہیں، جس سے ان کے مواشی اور وہ خود بھی کھاتے ہیں تو کیا دیکھتے نہیں ہیں۔

مفسر ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ''ارض جرز'' کے یہ معنی نقل کیے ہیں:

قال الجرز التی لا تمطر الا مطرا لا یغنی عنها شیئا الا ما یاتها من السیول.[1]

جرز وہ ہے، جہاں ناکافی بارش ہوتی ہو سوا اس کے کہ جو پانی سیلاب سے پہنچ جائے۔

حافظ سیوطی حسن المحاضرہ[2] میں کہتے ہیں کہ ایک جماعت کے نزدیک ارض جرز سے مراد مصر کی سرزمین ہے، حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر[3] میں فرماتے ہیں کہ مفسرین عموماً ''ارض جرز'' کے لئے مثال میں مصر کا نام پیش کر دیتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے مراد محض ''مصر'' ہے، بلکہ ارض جرز میں مصر بھی ہے، مصر کا ''ارض جرز'' میں ہونا قطعی ہے، وہاں کی زمین کی حالت یہ ہے کہ اگر بارش حسب ضرورت ہو تو مکانات منہدم ہو جائیں، اس لئے اللہ تعالیٰ وہاں بارش کے بجائے اس پانی کو لے جاتے ہیں، جو بلاد حبشہ میں برستا ہے۔

اسی مفہوم کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے رسالہ عرشیہ[4] اور منہاج السنہ[5] میں بیان کیا ہے۔ منہاج السنہ میں ابن تیمیہ کے الفاظ یہ ہیں:

فالارض الجرز لاتمطر ما یکفیها کارض مصر لو امطرت المطر المعتاد لم یکفها فانها ارض ابلیز وان مطرت مطراً کثیرًا مثل مطر شهر (ازار) خربت المساكن فكان من حكمة البارى ورحمته ان امطر ارضا بعيدة ثم ساق ذلک الماء الى ارض مصر فهذه

ارض جرز میں اتنا پانی نہیں برستا ہے جو اس کے لئے کافی ہو جیسے مصر کی زمین کہ اگر معمولی بارش ہو تو وہ اس کو کافی نہیں، اس لئے کہ مصر کی زمین کیچڑ والی ہے اور اگر زیادہ پانی برسے (مثلاً جتنی بارش کہ مارچ میں ہوتی ہے) تو مکانات برباد ہو جائیں، پس خدا کی حکمت اور رحمت ہے کہ ایک دور مقام پر پانی برساتا ہے

(۱) تفسیر ابن جریر ج ۱ص ۶۶ (۲) ج ۱ص ۴ (۳) ج ۳ص ۴۶۴ (۴) ص ۱۳ (۵) ج ۳ص ۱۱۱ مطبوعہ بولاق مصر ۱۳۲۲ھ

الآية يستدل بها على علم الخالق وقدرته ومشيته وحكمته.	پھر اس پانی کو مصر لے جاتا ہے، اس آیت سے خدا کے علم، اس کی قدرت، اس کی مشیت اور اس کی حکمت پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔

کس قدر دلچسپ بات ہے کہ جو چیز نولدیکی کے نزدیک نعوذ باللہ صاحب قرآن کی بے خبری پر دلالت کرتی ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اسی سے خدا کے علم، اس کی قدرت، اس کی مشیت اور اس کی حکمت پر استدلال کرتے ہیں، یہ امر بھی خاص طور سے لائق توجہ ہے کہ یہ قحط مصر ہی میں نہ تھا بلکہ اس کے اثرات دور دور تک تھے، برادران یوسف علیہ السلام کا غلہ کے لئے مصر آنا خود قرآن میں مذکور ہے، تورات میں بھی ان کا کنعان سے مصر تک غلہ کے آنا مصرح موجود ہے[(۱)]، نہ صرف کنعان بلکہ اور بہت سے ملکوں کے لوگ غلہ کے لئے مصر آتے تھے۔[(۲)]

عرب کے جنوبی علاقہ یمن تک اس کے اثرات تاریخ سے ثابت ہیں، چنانچہ ریونڈ رفارسٹر کے انگریزی ''تاریخی جغرافیۂ عرب'' میں[(۳)] ابن ہشام کے حوالہ سے درج ہے کہ ملک یمن میں سیلاب کے اثر سے ایک قبر کھل گئی، جس میں ایک عورت کی لاش نظر آئی، اس کے گلے میں موتیوں کے سات گلوبند، ہاتھوں اور پیروں میں بازوبند، کڑے اور سات سات چھڑے بھی تھے، ہر ہر انگلی میں نگینہ کی بیش قیمت انگوٹھی تھی، سرہانے زر و مال سے لبریز ایک صندوقچہ تھا، قبر میں ایک کتبہ بھی ملا جس میں پہلے فقرہ کے بعد پانچ اشعار درج ہیں، اس کی نقل حسب ذیل ہے:

(۱) باسمک اللهم اله حمير انا تاجه بنت ذى شقر بعثت مايرنا الى يوسف فابطأ علينا فبعثت لاذتي	تیرے نام سے اے خدا اے خدائے حمیر میں تاجہ بنت ذی شقر ہوں، میں نے اپنے شاہی داروغہ کو یوسف کے پاس بھیجا، پھر جب واپسی میں دیر ہوئی تو میں نے اپنی خواص کو بھیجا، چاندی کی ایک مقدار دے کر کہ اس کے عوض میں آٹے کی ایک مقدار لائے، پھر جب وہ نہ مل سکا تو پھر میں نے سونا دے کر بھیجا۔
(۲) بمد من ورق لتاتينى بمد من طحين فلم تجده فبعثت بمد من ذهب.	

(۱) پیدائش باب ۴۲ (۲) پیدائش باب ۴۱ (۳) ص ۱۰۳

(۳) فلم تجده فبعثت بمد من بحري فلم تجده فامرت به فطحن فلم انتفع به فاقتفلت فمن سمع فليرحمني.	جب اس سے بھی نہ مل سکا تو پھر میں نے موتی بھیجے اور جب اس سے بھی نہ مل سکا تو میں نے ان موتیوں کو پسوا ڈالا وہ کسی کام نہ آسکے، سو اب میں یہاں دفن ہوتی ہوں، جو کوئی میری خبر پائے اسے چاہئے کہ میرے اوپر ترس کھائے۔
(۴) واية امرأة لبست حليا من حليتي فلاماتت الا متيتي.	اور اگر کوئی عورت میرے زیوروں پر طمع کرے اور انہیں پہننا چاہے تو اس کو میری ہی جیسی موت نصیب ہو۔

اس کتبہ سے معلوم ہوا کہ یمن تک اس قحط کے اثرات یقینی تھے، تورات تو صراحۃً اس کی عالمگیری کی قائل ہے:

- ''(۵۳) اور سات برس ارزانی کے جو زمین مصر میں تھے، آخر ہوئے، اور گرانی کے سات برس جیسا کہ یوسف نے کہا تھا، آنے شروع ہوئے۔ (۵۴) اور سب زمین میں گرانی ہوئی، پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی۔ (۵۵) پر جب ساری زمین مصر بھوک سے ہلاک ہونے لگی تو خلق روٹی کے لئے فرعون کے آگے چلائی، فرعون نے سب مصریوں کو کہا کہ یوسف کنے جاؤ، وہ جو تمہیں کہے سو کرو۔ (۵۶) اور تمام روئے زمین پر کال تھا اور یوسف نے ذخیرے کے کھتے کھول کے مصریوں کے ہاتھ بیچے اور مصر کی زمین کا کال بہت بڑھا۔ (۵۷) اور سارے ملک مصر میں یوسف کنے مول لینے آئے، کیونکہ سب ملکوں میں سخت کال تھا۔''(۱)

ان حوالہ جات سے بیرون مصر قحط کے اثرات کا جب ثبوت موجود ہے تو مسئلہ اور واضح ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر مصر کو بارش سے محروم تسلیم بھی کر لیا جائے، تو سارا عالم تو بارش سے محروم نہ تھا، اور قرآن پاک میں (یغاث) کے ساتھ (الناس) لوگ کا لفظ ہے، صرف اہل مصر کی تخصیص نہیں ہے۔

(۷) اس موقع پر نفس آیت پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہئے اور قرآن پر تنقید کے بجائے، اس کے اعجاز و بلاغت اور اس کی صداقت کا اعتراف کرنا چاہئے۔

(۱) پیدائش باب ۴۱

تورات کی منقولہ بالا آیات سے معلوم ہو چکا ہے کہ جب سارے عالم میں لوگ بھوک سے پریشان تھے، اس وقت مصر میں خوشحالی تھی، آیت یہ ہے:

"اور سب زمین میں گرانی ہوئی، پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی۔"

یہ خوشحالی درحقیقت حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب کے طفیل میں تھی، جس میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا:

تزرعون سبع سنین دابا فما حصدتم فذروہ فی سنبلہ الا قلیلا مما تاکلون. (یوسف۔ ۴۷)	تم سات سال متواتر غلہ بونا پھر جو فصل کاٹو اس کو بالوں میں رہنے دینا، مگر تھوڑا سا جو تمہارے کھانے میں آئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی اس تنبیہ کے باعث اہل مصر کو کسی قدر غلہ مل گیا تھا اور دوسرے ملکوں والے چونکہ بالکل بے خبر تھے، اس لئے کوئی انتظام نہ کر سکے۔

اب قابل غور امر یہ ہے کہ اس پوری آیت میں (یغاث۔ فریادرسی ہوگی، یا بارش ہوگی) اور یعصرون (شیرہ نچوڑیں گے) کے سوا جتنے صیغے ہیں، وہ سب حاضر کے ہیں، (تزرعون تم غلہ بونا) حصدتم (تم فصل کاٹو) تاکلون (تم کھاؤ) تحصنون (تم جمع کرو گے) گویا ان مخاطب صیغوں کا تعلق صرف اہل مصر سے ہے اور اسی لئے وہ نسبۃً نفع میں رہے، اور ان کے بعد جو صیغے ہیں یعنی (یغاث) اور (یعصرون) وہ غائب کے صیغے ہیں۔

یہ التفات[1] بے سبب نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارش یا فریادرسی کا تعلق چونکہ دوسرے ملکوں سے بھی تھا، اس لئے یہاں غائب کے صیغے استعمال کئے گئے تاکہ مفہوم میں عموم پیدا ہو اور نولدیکی جیسے محققین کو یہ شبہ نہ پیدا ہو کہ مصر کی زمین تو بارانی نہیں ہے اس لئے وہاں بارش کیسے ہو سکتی ہے، اور کاشت نیز غلہ کے جمع کرنے کا تعلق چونکہ صرف اہل مصر سے تھا اسی لئے وہاں خطاب کے صیغے استعمال کئے گئے۔ واللہ اعلم بالصواب

التفات علم معانی و بیان کی ایک اصطلاح ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک ہی ضمن کی گفتگو میں صیغوں اور طرز خطاب کا تغیر و تبدل مثلاً ابھی گفتگو میں حاضر کے صیغے استعمال ہو رہے تھے، یکایک غائب یا متکلم کے صیغے استعمال ہونے لگے، ابھی ماضی کا استعمال تھا کہ مضارع کا استعمال ہونے لگا وغیرہ ذلک یہ علم بلاغت کا ایک اہم شعبہ ہے اور قرآن پاک کے التفات میں بے انتہا نکات ہیں، جو علم بلاغت سے دلچسپی رکھنے والوں پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

جمع وتدوین قرآن اور مستشرقین

تلخیص وتبصرہ
محمد عارف اعظمی عمری، رفیق دارالمصنفین

حال ہی میں مستشرقین کی مرتب کردہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد پنجم کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا ہے۔ یہ انگریزی اور فرنچ دونوں زبانوں میں ہے، اس ضخیم کتاب میں ''قرآن'' کے عنوان کے تحت مستشرق ولش کا ایک مفصل مضمون شامل ہے، جس میں انھوں نے وہ سب اعتراضات یکجا کر دیئے ہیں جو تقریباً دو صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔

عہد نبویؐ میں جمع وترتیب کی کیفیت

جمع وتدوین قرآن کو مستشرقین نے خاص طور پر اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا ہے جس کا اصلی اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید کے متن کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کردیں، اس سلسلہ میں ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ پورا قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مدون نہیں ہوا، پھر وہ اس بے بنیاد اعتراض کا جواب بھی اپنے ہی مفروضات وقیاسات کی روشنی میں ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ بعض کے نزدیک کاتبین وحی کی کمی سے ایسا ہوا اور بعض مستشرقین نے تو اس کی یہ مضحکہ خیز توجیہ کی ہے کہ ''چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرب قیامت کا حد درجہ شدید احساس تھا اور آپؐ جانتے تھے کہ یہ تمام علوم قیامت آنے کے ساتھ ہی فنا ہو جائیں گے اس لئے آپؐ نے قرآن مجید کو جمع کرنے کی ضرورت پر سرے سے زور ہی نہیں دیا۔''

دراصل مستشرقین کی یہ دونوں باتیں لغو اور حقیقت کے برعکس ہیں، ان کا یہ کہنا کہ کاتبان وحی کی قلت تعداد اس میں مانع ہوئی ان کے مطالعہ اور غور وفکر کی کمی کا نتیجہ ہے، مختلف روایتوں کے مطابق کاتبین وحی کی تعداد چوالیس تھی۔ چالیس کا اعتراف تو خود مستشرق بلاشیر نے کیا ہے، نزول قرآن کے زمانہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کاتبین کے ذریعہ نازل شدہ قرآن مجید کا املا کراتے

تھے اور خود آپ ان آیتوں کے محل و مقام کو بھی متعین فرما دیتے تھے جیسا کہ حضرت زید بن ثابتؓ کے اس ارشاد سے بخوبی واضح ہوتا ہے:

کنا عند رسول الله صلى الله عليه وسلم نؤلف القرآن من الرقاع.	ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مختلف ٹکڑوں سے قرآن مجید کو مرتب کرتے تھے۔

اسی طرح مستشرق کازانوف کا یہ خیال ہے کہ قرب قیامت کے شدت احساس کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کو مدون کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، مسلمان دانشوروں سے پہلے خود مستشرقین کے طبقہ میں رد کیا جا چکا ہے، چنانچہ بلاشیر نے اس پر سخت تنقید کرتے ہوئے یہ تبصرہ کیا ہے:

> ''کازانوف کی اس رائے کا نہ تو علمی حلقوں میں کوئی وزن ہے اور نہ ہی اس کا علم سے کوئی تعلق ہے۔''

تاہم بلاشیر نے اس کی تردید میں اپنے خود ساختہ خیالات کی ترجمانی کی ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''یوم آخرت کا انذار اور دھمکی صرف مکی دور تک محدود تھی مدنی عہد میں جو اسلامی شریعت کی ترقی کا دور تھا یہ چیز مفقود ہے۔''

کازانوف کے اس غیر علمی خیال کی سب سے عمدہ تردید فرانس کے ایک مسلمان مصنف ناصر الدین دینیہ نے اپنی کتاب ''الشرق فی نظر الغرب'' میں کی ہے۔

علمائے اسلام نے عہد نبویؐ میں قرآن مجید کے مدون نہ ہونے کے اسباب و وجوہ پر مفصل بحث و گفتگو کی ہے، ان کے خیال میں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ چونکہ قرآن مجید وقتاً فوقتاً تیئیس برس کی مدت میں نازل ہوتا رہا اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تردد لاحق رہتا تھا کہ معلوم نہیں کب کون آیت نازل ہو اور کون سی منسوخ ہو جائے یا کسی آیت کا حکم تو برقرار رہے مگر اس کی تلاوت منسوخ کر دی جائے تاہم یہ امر واقعہ تھا کہ پورا قرآن مجید عہد نبویؐ ہی میں لکھا جا چکا تھا گو وہ ایک مصحف میں بین الدفتین جمع نہ تھا، بلکہ وہ متفرق کاغذ کے پرزوں اور دوسری چیزوں پر لکھا ہوا تھا علاوہ ازیں وہ صحابہ کرامؓ کے سینوں میں بھی محفوظ تھا، جن کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ عربوں کے حفظ و ضبط کی غیر معمولی قوت پر بہت لکھا جا چکا ہے۔

جمع وتدوین کا زمانہ مستشرقین کی جانب سے ایک سوال یہ بھی پیدا کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کا جامع اول کون ہے، اس بارہ میں اس گروہ نے غیر معتبر روایتوں کا بھی سہارا لیا ہے چنانچہ انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

''ایک روایت میں ہے کہ کسی موقع پر حضرت عمرؓ نے کوئی آیت دریافت کی تو انہیں بتایا گیا کہ وہ فلاں صاحب کو یاد تھی جو غزوۂ یمامہ میں شہید ہوگئے، اس پر حضرت عمرؓ کو سخت افسوس ہوا اور انھوں نے قرآن مجید کو جمع کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ اس امر کے بموجب سب سے پہلے قرآن مجید ایک مصحف میں جمع کیا گیا لیکن بعض دوسری روایتوں کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے یہ کام شروع کیا تھا اور حضرت عمرؓ نے ان کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ ہی نے جمع قرآن کا کام انجام دیا اور حضرت عمرؓ نے اس کی تدوین کی۔''

حقیقت یہ ہے کہ ناقابل اعتبار اور متضاد روایتوں کو یکجا کر کے انہیں اپنے مفاد میں استعمال کرنے میں مستشرقین کو بڑی مہارت اور چابکدستی حاصل ہے، یہاں بھی انھوں نے متن قرآن کی جمع وترتیب میں غلط فہمیاں پیدا کر کے اس کے بارے میں مسلمانوں کو شکوک وشبہات میں مبتلا کر دینے اور اس کی تاریخی حقیقت کو مجروح کرنے کے لئے روایتوں کے دامن میں پناہ لی ہے۔

مقالہ نگار نے حضرت عمرؓ کی جس روایت کا ذکر کیا ہے اس کو حافظ ابن حجرؒ (ف:۸۵۲ھ) نے منقطع قرار دیا ہے اور جن روایتوں سے اس بارہ میں حضرت عمرؓ کی اولیت کا ثبوت ملتا ہے ان کے متعلق بھی حافظ ابن حجرؒ نے تصریح کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے اس کام کا مشورہ دیا تھا۔

اسی طرح مقالہ نگار کا یہ بیان کہ حضرت ابوبکرؓ نے جمع قرآن کی ابتدا کی مگر اس کی تدوین حضرت عمرؓ کے ہاتھوں ہوئی، دراصل مستشرق بلاشیر کا ایک خود ساختہ خیال ہے جس کی تردید صحیح بخاری کی ایک مشہور روایت سے بھی ہوتی ہے۔ جس کے آخری حصہ میں حضرت زید بن ثابتؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے:

حتی وجدت آخر سورة التوبة بالآخر مجھ کو سورہ توبہ کے آخر کی آیت

مع ابی خزیمة الانصاری لم اجدها مع احد غیرہ (لقد جاء کُم رسُوْلٌ مِّنْ انفُسکُم عزیزٌ علیہِ ما عنتم)	(لقد جاء کم رسول ... الخ) حضرت ابوخزیمہ انصاریؓ کے پاس ملی جو اور کسی کے پاس نہ تھی۔

حضرت زیدؓ بن ثابت کے اس ارشاد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جمع قرآن کا کام عہد صدیقی ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

عام صحابہ کو نظر انداز کرنے کا الزام

بلاشیر کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع و تدوین قرآن کے مشورہ میں عام مسلمانوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا بلکہ یہ تمامتر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی ذاتی دلچسپی اور جدوجہد کا نتیجہ تھا جس کو عام مسلمانوں میں بھی رائج کردیا گیا، وہ لکھتے ہیں:

> "طبعاً مسلم معاشرہ کو وحی الٰہی کے ایک مدون نسخہ کی حاجت تھی اور ظاہر ہے یہ نسخہ ایسا ہی ہوسکتا تھا جو عام مسلمانوں کی رائے سے مدون کیا گیا ہوتا کہ اس کو عوامی مقبولیت حاصل ہو، حضرت ابوبکرؓ کے صحیفے اس معیار پر پورے نہیں اترتے، کیونکہ ان کی حیثیت حضرت ابوبکرؓ کی ذاتی ملکیت کی تھی، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کسی کے ذہن میں یہ بات نہ تھی کہ وہ بحیثیت خلیفہ عام مسلمانوں پر اس کو لازم قرار دیں"

جمع قرآن کا بنیادی محرک بلاشبہ غزوۂ یمامہ میں ستر حفاظ صحابہ کی بیک وقت شہادت کا واقعہ تھا جس کے بعد ہی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی توجہ اس اہم کام کی طرف مبذول ہوئی۔ مگر کیا اس کو ان دونوں بزرگوں کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے یا اس میں عام مسلم معاشرہ کی مصلحت مضمر تھی، بالفرض اگر ایسا ہی ہوتا تو ان دونوں بزرگوں کے لئے عام مسلمانوں کے تعاون کے بغیر خود ہی یہ کام انجام دینا کس طرح ممکن ہوتا، سب سے بڑا تعاون تو حضرت زیدؓ بن ثابت کا تھا جن کو جب اس کام کی زحمت دی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ:

فواللہ لو کلفونی نقل جبال ماکان أثقل علیّ مما أمرونی بہ من جمع القرآن.	بخدا اگر وہ لوگ مجھ سے پہاڑ کا بوجھ بھی اٹھانے کے لئے کہتے تو یہ کام میرے لئے قرآن کریم کو جمع کرنے کے مقابلے میں زیادہ ہلکا ہوتا۔

بلاشیر نے اس بارے میں اس امر سے یہ غلط فہمی بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ

حضرت ابوبکرؓ سے پہلے ہی بعض صحابہ کرامؓ نے بھی انفرادی طور پر اس کام کو انجام دیا تھا، مثلاً حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت ابودرداءؓ ابن السکینؓ وغیرہ۔

ایک تاریخی غلطی کا اعادہ

دراصل الکامل ابن اثیر اور کتاب النشر ابن جزری میں حضرت عثمانؓ کے عہد مبارک میں قرآن مجید کے مستند نسخہ کی نقلیں تیار کرنے کا سن ۳۰ھ لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ کام ۲۵ھ میں ہوا، جیسا کہ ابن حجرؒ نے فتح الباری جلد ۹ ص ۱۰ پر اس کی مکمل وضاحت کردی ہے مگر جو مستشرقین قرآن مجید کے تاریخی پہلو پر بحث کرتے ہیں وہ اپنی مقصد برآری کے لئے قصداً اس غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

بلاشیر نے بھی اس تاریخی غلطی کا اعادہ کرتے ہوئے اس میں یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ ابن ابی داؤد کے بیان کے مطابق حضرت ابی ابن کعب بھی اس وقت موجود تھے، جبکہ دوسرے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۳۰ھ سے کم از کم دو سال پہلے ہی انتقال کرچکے تھے۔

حضرت زید بن ثابتؓ کی مخلصانہ جدوجہد پر اثر پذیری کا بہتان

اکثر مستشرقین نے اس باب میں حضرت زیدؓ بن ثابت کی شخصیت کو بھی متہم کیا ہے ان کے خیال میں وہ مختلف عوامل سے متاثر تھے جن کے اثرات کی کارفرمائی لامحالہ اس کام پر بھی اثرانداز ہوئی لیکن یہ ساری باتیں بے بنیاد ہیں۔ حضرت زیدؓ اسی وقت سے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کتابت وحی پر مامور کیا تھا اپنی وفات (۴۵ھ) تک ممتاز سیرت وشخصیت کے مالک رہے۔ سوسائٹی میں ان کے اونچے درجہ ومرتبہ نیز ان کی حفظ و یادداشت کی قوت وصلاحیت کا اعتراف مستشرقین کو بھی ہے، صحابہ کرامؓ کی پوری جماعت میں وہ ان اوصاف وخصوصیات کے لحاظ سے بے نظیر تھے، اکثر صحابہؓ نے ان کی عظمت شان غیر معمولی فضل وکمال اور کتابت وحی کی عظیم الشان خدمت انجام دینے کا ذکر بھی کیا ہے، امیر المومنین حضرت ابوبکرؓ کو اس بارہ میں ان پر کتنا اعتماد تھا اس کا اندازہ ان کے اس ارشاد گرامی سے کیا جاسکتا ہے:

انک رجل شاب عاقل لانتھمک وقد کنت تکتب الوحی	بیشک تم نوجوان اور ہوش مند شخص ہو، تم پر کوئی اتہام بھی نہیں ہے اور تم وحی بھی لکھا کرتے تھے۔

حافظ ابن حجرؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کی چار صفات گنائی

ہیں جو تمام اس کام کے لئے مخصوص تھیں۔ (۱) نوجوان ہونا تا کہ وہ اس اہم کام کو تندہی اور محنت سے انجام دے سکیں۔ (۲) ہوش مند ہونا اس بنا پر کہ وہ اس کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ (۳) متہم و مجروح نہ ہونا کہ ان کا نفس کسی برائی اور غلط رجحان کی طرف مائل ہو۔ (۴) کاتب وحی ہونا کہ یہ مہارت اور شرف ان کو پہلے سے حاصل ہے یہ چاروں اوصاف فرداً فرداً تو اور لوگوں میں بھی مل سکتے ہیں مگر حضرت زیدؓ کے اندر ان سب کا جمع ہونا ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔''

مزید براں حضرت زیدؓ بن ثابت اس وقت بھی موجود تھے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری دنوں میں حضرت جبریل علیہ السلام نے دو مرتبہ آپ سے قرآن مجید سنا اور خود آپ کو سنایا، علاوہ ازیں وہ تمام صحابہ میں قرآن مجید کے حفظ وضبط اور اس کی مختلف قرأت سے واقفیت میں مشہور وممتاز تھے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے یہ کام تنہا نہیں انجام دیا، ابن ابی داؤد کی روایت ہے:

ان ابابکرؓ قال لعمرؓ ولزیدؓ اقعدا علی باب المسجد فمن جاء کما بشاھدین علی شیء من کتاب اللہ فاکتباہ۔	حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ اور حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ تم دونوں مسجد نبویؐ کے دروازہ پر بیٹھ جاؤ اور جو شخص دو گواہوں کے ساتھ قرآن کا کوئی حصہ پیش کرے اسے لکھ لو۔

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت گو منقطع ہے لیکن اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اسی طرح ابن ابی داؤد ہی کی ایک دوسری روایت ہے کہ ''تدوین قرآن کے وقت حضرت عمرؓ نے اعلان کیا کہ جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کا کوئی حصہ سنا یا لکھا ہو وہ اسے پیش کرے، صحابہ کا معمول تھا کہ وہ قرآن مجید کو اوراق، پتھر کی تختیوں اور کھجور کی شاخوں پر لکھ لیا کرتے تھے اور کسی سے بھی قرآن کا کوئی حصہ بغیر دو گواہوں کی شہادت کے قبول نہیں کیا جاتا تھا۔''

ان دونوں روایتوں میں اس کا ذکر ہے کہ اس اہم کام میں حضرت عمرؓ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کی معاونت کی تھی، مگر اس بارہ میں خود حضرت زیدؓ کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ وہ محض حافظہ پر اعتماد نہیں کرتے تھے، چنانچہ سورہ توبہ کے آخری آیت کے سلسلہ میں ان کا بیان ہے کہ وہ انھیں

حضرت ابوخزیمہ انصاریؓ کے علاوہ اور کسی کے یہاں نہیں ملی، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیت صرف انہیں کے پاس لکھی ہوئی موجود تھی ورنہ یہ زبانی تو انھیں خود بھی اور دوسرے بہت سے صحابہ کو بھی یاد تھی اور حفظ کے باوجود اس کے مطابق لکھے ہوئے کی تلاش سے ان کی انتہائی احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے۔

مصحف عثمانی اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

مقالہ نگار کا یہ بھی بیان ہے کہ ''حضرت عثمانؓ نے قرآن مجید کے دوسرے تمام نسخوں کو جلا دیا اور صرف سرکاری نسخوں کو برقرار رکھا اور یہی حکم تمام شہروں میں نافذ کر دیا گیا، البتہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے ہمنواؤں نے اس کی پرزور مزاحمت کی'' پھر اس مخالفت کے اسباب وعلل پر طویل گفتگو کرتے ہوئے طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کیے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین کے ایک بڑے طبقہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علاحدہ مصحف کا ذکر مبالغہ آرائی سے کیا ہے اور اس کو بنیاد بنا کر مصحف عثمانی کی مسلمہ صحت وصداقت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے، مقالہ نگار نے بھی یہی کیا ہے اور اس نے اس بارہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی جانب منسوب اس تقریر کو بھی نقل کیا ہے:

یا معشر المسلمین: اعزل عن نسخ المصاحف ویتولاہ رجل واللہ لقد أسلمت وانہ لفی صلب رجل کافر	اے مسلمانو! میں مصاحف کی نقل نویسی سے معزول کر دیا گیا اور ایک ایسے شخص کو اس پر مامور کیا گیا جو اس وقت ایک کافر کے صلب میں تھا جبکہ میں مسلمان ہو چکا تھا۔

بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کا کلام ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ جمع وتدوین قرآن مجید کے مخالف تھے، بلکہ ان کی تنقید محض جمع قرآن کے ذمہ داروں پر تھی، چونکہ وہ حضرت زیدؓ بن ثابت کے مقابلہ میں معمر اور قدیم الاسلام تھے اور پھر ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فن قرأت کے ائمہ میں شمار کیا تھا، چنانچہ آپؐ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا:

خذوا القرآن عن اربعة؛ عبداللہ وسالم مولی ابی حذیفة ومعاذ بن جبل و ابی بن کعب.	قرآن مجید چار آدمیوں سے سیکھو؛ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت سالمؓ غلام حضرت ابوحذیفہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ۔

اس بنا پر حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اپنے آپ کو اس کے لئے زیادہ موزوں سمجھتے رہے ہوں گے مگر جب ان کو اس حقیقت کا اچھی طرح علم ہو گیا اور اپنے موقف کی غلطی کا بخوبی احساس ہو گیا تو انھوں نے اس سے رجوع کر لیا اور برضاء ورغبت امت اسلامی کی وحدت واجتماعیت کو برقرار رکھا۔

خاتمہ یہ مستشرقین کے بعض اعتراضات اور غلط بیانیوں کی ایک جھلک ہے جن کو وہ اپنی تمام کتابوں میں بار بار دہرا کر قرآنی متن کو مشکوک اور نامعتبر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ان کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے، ارشاد باری ہے:

انَّا نحنُ نزّلنا الذِّكرَ وانّا لهُ لحافظُونَ (الحجر: ۹)	بیشک ہم ہی نے اس نصیحت کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ومحافظ ہیں۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ اسلامی کتب خانوں میں ایسی مستند اور محققانہ کتابوں کی کمی ہے جن میں متن قرآن کی تاریخ مرتب اور مرحلہ وار درج کی گئی ہو، صرف ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف اس سلسلہ میں واحد ماخذ ہے جس کو مستشرق جفری نے شائع کیا ہے، مگر اس کو بھی دوبارہ ایڈٹ کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کتاب کے عمیق مطالعہ کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے تاریخی مباحث تشنہ ہیں اور اس میں ایک موضوع سے متعلق مختلف متضاد روایتیں یکجا کر دی گئی ہیں، اگر یہ اہم کام مسلمانوں کی جانب سے انجام پا جائے تو متضاد روایتوں کا سہارا لے کر کتاب اللہ پر طعن وتشنیع کی جو کوشش مستشرقین کر رہے ہیں اس کا سد باب ہو جائے گا۔

مستشرقین کے نزدیک نبوت اور وحی کے دلائل

تلخیص وتبصرہ

مولانا ضیاء الدین اصلاحی ناظم دارالمصنفین

مستشرقین نے نبوت اور وحی کے جو دلائل بیان کئے ہیں ان میں پہلی دلیل کا تعلق ایمان باللہ کے عقیدہ سے ہے۔

اسلام میں ایمان باللہ کی اولین بنیاد توحید کا عقیدہ ہے، یہ اپنی خصوصیات اور تفصیلات کے ساتھ اس قدر ستھری اور نکھری ہوئی صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ایسی صورت میں نہیں تھا، یہاں تک کہ ان حنفاء کے یہاں بھی امتداد زمانہ سے توحید کا عقیدہ خالص نہیں رہ گیا تھا جو ملت ابراہیمی کے متبع سمجھے جاتے تھے، وہ اگرچہ خدائے واحد کو زمان ومکان اور جسم وجہت سے منزہ سمجھتے تھے، لیکن اس کی حاکمیت، تشریع اور تجرید کے بارہ میں ان کا ذہن صاف نہیں تھا۔

اسی طرح تورات میں الٰہ کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، وہ عام اور ہمہ گیر نہیں ہوسکا، بلکہ یہ صرف بنی اسرائیل اور ان کے انبیاء کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا۔

موجودہ اناجیل کی توحید میں تثلیث کا تصور ہے، ان میں تین اقانیم کا اعتبار کیا گیا ہے جو الگ الگ بھی خدا سمجھے جاتے ہیں اور ان کا مجموعہ بھی خدا کہلاتا ہے، اسی لئے حضرت مسیحؑ کی ذات کے متعلق عیسائیوں کے مختلف فرقے ہو گئے ہیں۔

بعثت نبویؐ سے قبل توحید سے متعلق اسی قسم کے تصورات لوگوں میں رائج تھے، لیکن اسلام اور پیغمبر اسلامؐ نے ان سے الگ توحید کا ایسا نیا تصور پیش کیا جس کو نہ آپؐ نے تورات وانجیل میں پڑھا تھا اور نہ کسی حنفی (ملت ابراہیمؑ کے متبع) سے سیکھا تھا، چونکہ یہ تصور اور عقیدہ عین بشری میلانات اور انسانی فطرت کے مطابق تھا، اس لئے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور نبوت کی ایک

دلیل ہے۔

اسی حقیقت کو مشہور مستشرق کونٹ ہنری ڈی کاسٹری نے اپنی کتاب ''اسلام،شخصیات اور تصورات'' میں بھی بیان کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ اس بات کو باور کرنا محال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم توحید کے جس فکر وتصور کے داعی تھے، اسے آپ نے تورات اور انجیل کے مطالعہ سے حاصل کیا تھا کیونکہ اگر آپؐ نے یہ کتابیں پڑھی ہوتیں تو آپؐ نے تثلیث کی تردید ضرور کی ہوتی، کیونکہ یہ آپؐ کی فطرت اور وجدان کے سراسر خلاف چیز تھی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عقیدہ کا ظہور خود آپ کی زندگی کا نہایت مہتم بالشان واقعہ ہے جو بذات خود آپ کے سچے اور صادق وامین نبی ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے، (یورپ اور اسلام ص۴۲) نیز یہی اسلام کے برحق ہونے کی غالباً سب سے واضح دلیل بھی ہے، کیونکہ اسلام میں توحید کا جو عقیدہ ہے، اس سے یہ دوسرے مذاہب سے بالکل ممتاز نظر آتا ہے۔

اسلام میں معبود صرف ایک ہی ہے، اسی کی ہم عبادت اور پیروی کرتے ہیں، ہمارے نزدیک سب سے اہم اور مقدم یہی عقیدہ ہے، کوئی ہستی بھی اتنی مقدس اور پاکیزہ نہیں ہے کہ ہم اس کو خدا کا شریک اور ساجھی بنائیں، یہ کیسی عجیب وغریب بات ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے، ایسی پستی اور بے وقوفی پر اتر آئے اور ایسے اوہام وخرافات کو اپنا عقیدہ بنالے جو اس کی نگاہوں سے اس کے اس مقدس باپ (خدائے قہار) کو اوجھل کردیں، جو اپنے بندوں اور مخلوقات سے ہر وقت متصل اور جڑا ہوا رہتا ہے، خواہ یہ بندے اس کے نافرمان اور باغی ہوں یا مطیع وفرمانبردار۔

قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بلیغ معجزہ ہے

عربی زبان وادب کے ماہر مستشرقین اسلوب اور مضمون کے اعتبار سے قرآن مجید اور احادیث نبویؐ کے درمیان موازنہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ان کا اسلوب بیان بھی مختلف ہے۔ اور معانی ومحتویات کے اعتبار سے دونوں کے مضامین بھی جدا جدا ہیں۔

قرآن مجید کا اسلوب لفظی ومعنوی دونوں حیثیتوں سے ایسا معجزانہ ہے جو اس کے کلام ربانی ہونے کا پتہ دیتا ہے، اور حدیث کے اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک فائق وبرتر انسان کی قوت بلاغت کا نمونہ ہے، اسی طرح قرآن کے مضامین ومطالب زیادہ تر عام اور کلی نوعیت کے ہوتے ہیں، جب کہ حدیث کے مندرجات ومشمولات قرآن کے بنیادی احکام کی تفصیل، توضیح اور تشریح پر مبنی ہوتے ہیں، گو کہیں کہیں اس میں بعض نئے احکام وقوانین بھی پائے جاتے ہیں؛

قرآن مجید نے برابر چیلنج کیا ہے اور ہمیشہ کرتا رہے گا کہ لوگ لفظاً و معناً اس کے جیسی کوئی کتاب پیش کریں، اس سے لازماً یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایسی وحی ہے جس کا سرچشمہ کوئی بالاتر ہستی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

ڈاکٹر لورا ویشیا واگلیر ی نے بھی ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کا معجزہ اس کی بلاغت ہے اور اس کی وہ خبریں ہیں جو اس کی سورتوں اور آیتوں میں بیان کی گئی ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''اسلام کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے، جو تواتر و تسلسل کے ساتھ نقل ہوتا چلا آ رہا ہے اور اس کے واقعات پورے یقین اور کامل وثوق کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، اس برحق کتاب کی نقل و محاکات کی کوئی گنجائش نہیں، اس کی تمام آیتیں بلاغت کے یکساں معیار پر ہوتی ہیں اور وہ ایک موضوع چھوڑ کر دوسرے موضوع کی جانب منتقل ہو جاتا ہے، مگر اس کا زور بیان برقرار رہتا ہے، ہم کو اس کے اندر گہرائی کے ساتھ شیرینی بھی ملتی ہے، حالانکہ عموماً یہ دونوں خوبیاں ایک ساتھ جمع نہیں ہوتیں، ایسی معجزانہ کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اختراع قرار دینا بعید از عقل ہے، کیونکہ آپ ایک عرب امی تھے۔'' (اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۰۵)

مستشرق ایٹن ڈینہ لکھتا ہے کہ:

''قرآن کا اعجاز اس انداز کا ہے جس کو اختیار کرنا بڑی سے بڑی علمی و ادبی اکیڈمی کے امکان سے باہر ہے اور یہ اس کے اعجاز ہی کا نتیجہ ہے کہ گو عربی زبان ساری دنیا میں پھیل چکی ہے لیکن اگر آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی صحابی دوبارہ تشریف لائیں تو انھیں عربی زبان بولنے والوں کی باتیں سمجھنے اور مختلف قبیلوں سے باتیں کرنے میں کوئی دقت اور دشواری نہ پیش آئے گی، اس کے برخلاف اگر پندرھویں صدی کے فرانسیسی رابیلے کا کوئی معاصر آج کے فرانسیسی لوگوں کی بڑی تعداد سے تخاطب کرتے تو اسے بڑی دشواری پیش آئے گی۔ حالانکہ پندرھویں صدی قرآن کی صدی کے مقابلہ میں ہم سے زیادہ قریب ہے۔

گو قرآن کی زبان کے اصول و ضوابط صدیوں پہلے مرتب و مدون

کیے جا چکے ہیں، مگر اس میں اتنی لچک اور وسعت ہے کہ موجودہ ایجادات اور نئی نئی اختراعات کی تعبیر سے نہ تو عربی زبان قاصر ہے اور نہ اس کی وجہ سے اس کی روانی اور سلاست میں کوئی فرق آسکتا ہے۔'' (اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۰۵)

قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی تاریخ بھی تائید کرتی ہے

جس طرح بعض مستشرقین کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امی ہونا اور گذشتہ آسمانی کتابوں سے کوئی خوشہ چینی نہ کرنا ثابت ہے، اسی طرح وہ اسے بھی تسلیم کرتے ہیں اور تاریخ بھی اس پر شاہد ہے کہ قریش میں سے اکثر لوگ قرآن کی اثر انگیزی اور دلآویزی کی وجہ سے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے، انھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے اس کے نبیؐ پر اتاری گئی ہے، اس لئے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کی اور آپؐ پر ایمان لائے، گذشتہ طویل تاریخ اس کی بھی شہادت دیتی ہے کہ قرآن مجید کا نص نہایت صحیح ہے، اور ہر قسم کے مادی انقلابات اور گوناگوں فکری رجحانات کے رونما ہونے کے باوجود ہر قسم کے تغیر وتحریف سے محفوظ ہے، آج مسلمان جس قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، وہ بعینہ وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا گیا تھا، کیا یہ بات خود ایک معجزہ نہیں ہے کہ تاریخ کے گوناگوں واقعات وحوادث کے باوجود مسلمان قرآن کی تلاوت میں اس کے اسی طریقہ کو مشروع سمجھتے ہیں جس پر یہ آنحضرتؐ پر وحی کے ذریعہ اتارا گیا تھا، یہ بھی قرآن کا معجزہ ہے کہ موجودہ دنیا کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی کا اس پر ایمان ہے اور اس تعداد میں برابر اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

قرآن مجید کے اس اعجاز کی طرف بہت سے مستشرقین بھی مائل ہوئے اور انھوں نے اس کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کی ہے، کاؤنٹ ہنری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ عقل حیران ہے کہ اس طرح کی آیتیں بھلا ایک امی شخص کس طرح بیان کر سکتا ہے، سارے مشرق کو اعتراف ہے کہ لفظاً ومعنیً ایسی آیتیں پیش کرنے سے انسانی فکر قاصر ہے، یہی وجہ ہے کہ عتبہ بن ربیعہ نے قرآن کی جب آیتیں سنیں تو وہ مبہوت ہو گیا، قرآن کی عظمت کے لئے یہ کافی ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب اس کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور خدا پر ایمان لائے، اور جعفرؓ بن ابی طالب نے جب نجاشی کے سامنے قرآن کی ایک سورہ کی تلاوت کی تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، کوزان ڈی بیرسو پھال نے اس طرح کی تمام روایتوں کو نقل کیا ہے۔ (یورپ اور اسلام ص ۴۲)

ڈاکٹر لوراویزیا قرآن کے الہامی اور امتداد زمانہ کے باوجود اب تک ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتی ہیں "ہمارے نزدیک قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ وہ اپنے نازل کئے جانے کے بعد سے اب تک ہر قسم کی تحریف وتغیر سے محفوظ ہے، اور اللہ کے حکم سے وہ آئندہ بھی ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ (اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۰۷)

قرآن کے قوانین کی جامعیت

قرآن مجید کا مکمل وجامع قانون ودستور ہونا بھی نبوت محمدیؐ کی تائید کا ایک ثبوت ہے، کیونکہ خواہ کوئی شخص حیرت انگیز قانونی ذہن ودماغ اور غیر معمولی قانونی مہارت ہی کیوں نہ رکھتا ہو، اس درجہ مکمل شریعت اور جامع قوانین پیش نہیں کرسکتا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک امی تھے، آپؐ نے نہ تو شرائع وقوانین کی کسی کتاب کا مطالعہ کیا تھا اور نہ ہی انسانی حقوق ومعاملات کی کسی کتاب سے آپ کو واقفیت تھی، ایسی صورت میں آپؐ کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ایسا قرآن پیش کردیں جو انسان کی دنیوی واخروی زندگی کے لئے مکمل لائحہ عمل اور جامع دستور ہو۔

آپؐ کی بعثت سے پہلے دنیا میں متعدد آسمانی وانسانی قوانین رائج تھے، قانونِ حمورابی سے لے کر قانون روما تک موجود تھے، گذشتہ انبیاءؑ کی شریعتیں بھی تھیں، جن میں حق، عدل، نظام حکومت، حقوق اور فرائض کے کلی وجزئی پہلوؤں کی وضاحت کی گئی تھی، اور ان کے علاوہ بہت سے قوانین وشرائع محو اور معدوم ہوجانے کے قریب ہوگئے تھے، ان کے مقابلہ میں اسلام کے نظام قضاء، دستور حکومت اور اس کی اقتصادی، مالیاتی اور فوجی تنظیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی قانون و شریعت کسی شخص کے ذہن وفکر کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر خدا کے سارے احکام موجود ہیں، جن کا الہام رسول اللہؐ پر ہوا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صحت وصداقت کی یہ بھی دلیل ہے کہ آدمی کے احترام، عدل، مساوات، رواداری، مسلم وغیر مسلم کے تعلقات اور امن وجنگ کے زمانہ کے احکام کے متعلق اسلامی حکومت کے منظم ضوابط چودہ سو برس سے دنیا میں رائج چلے آرہے ہیں، اور آئندہ بھی یہ جاری رہیں گے۔

تمدنی اور تہذیبی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول علم، مکارم اخلاق، احترام عقل، اثبات حق اور عام انسانی معاملات کی جانب توجہ کرنے کی جو دعوت دی ہے، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے احکام اور تمدنی افکار آپ کو خدا کی جانب سے عطا کئے گئے تھے۔

دیانا یونیورسٹی کے لاکالج کے پرنسپل ڈاکٹر شیرل نے ۱۹۲۷ء میں قانون دانوں کی ایک کانفرنس میں کہا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے امی ہونے کے باوجود کئی صدی پیشتر دنیا کو ایک ایسا مکمل قانون اور جامع دستور عطا کیا تھا جس کی بلندی پر اگر ہم یورپ والے دو ہزار برس بعد پہونچ جائیں تو خوش قسمت ہوں گے۔ (اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۹۶)

ایک ولندیزی مستشرق ڈاکٹر کرستان اسنوک ہرجرنج نے ہالینڈ کی حکومت کے کونسلر کی حیثیت سے سترہ برس مشرقی ہند میں گذارے، تقریباً ربع صدی تک اس نے اسلامی ملکوں کی سیاحت بھی کی، اس عرصہ میں اس کو اسلامی قوانین کے مطالعہ کا موقع بھی ملا، اس نے ان ملکوں کی دینی تحریکوں کا جائزہ بھی لیا، وہ رقمطراز ہے کہ "عیسائی مشنریوں کو امید ہے کہ تمام مذاہب ان کے اندر ضم ہو جائیں گے لیکن اسلام کے بارہ میں ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ ایک طاقتور، متحرک اور فعال مذہب ہے اور اس کے احکام و قوانین انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ سے متعلق ہیں، ڈاکٹر شبلے شمیل کا کہنا ہے کہ قرآن نے جو اجتماعی اصول بیان کئے ہیں وہ عام اور ہمہ گیر ہیں، اور ان کے اندر نرمی اور لچک بھی ہے، اس لئے وہ ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لئے مناسب اور موزوں ہیں۔

قرآن مجید نے انسان کے لئے دنیا و آخرت دونوں کے دروازے وا کردیے ہیں، اور اس کے جسم و روح دونوں کو ترقی کے اسباب و وسائل مہیا کردیے ہیں، جب کہ دوسرے مذاہب نے عمل و ترقی کے دروازے مسدود کر کے آدمی کو اس دنیائے فانی سے بالکل دامن کش اور بیزار رہنے پر مجبور کردیا ہے۔ (اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۱۲)

اسلام کی دوامی اور استمراری حیثیت اور اس کی مقبولیت

صدیوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی اپنی اصلی حالت اور حقیقت پر اسلام کا باقی اور پائیدار رہنا دراصل اس کے ہر زمانہ کے لئے مناسب اور سازگار ہونے کی دلیل ہے، اس کی دعوت ماضی کی طرح حال و مستقبل میں بھی قائم اور پائدار رہے گی، جس کو لوگ گرم جوشی سے قبول و اختیار کرتے ہیں اور اس کے آئین و احکام کی پابندی کرنے کے لئے پریشان رہتے ہیں، یہ اس کے کامل و مکمل دین ہونے کا ثبوت ہے، یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے سوا دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی دعوت کو شوق، رغبت اور محبت کے ساتھ قبول کرنے والوں کی تعداد میں اس طرح روز بروز اضافہ ہوتا رہا ہو اور وہ اس کی تبلیغ و اشاعت کی خاطر اپنی جان تک قربان کردینے میں کوئی دریغ

محسوس نہیں کرتے، مستشرق اٹین ڈینہ نے اس دلیل کو زیادہ موثر طریقہ پر بیان کیا ہے، وہ لکھتا ہے ''گذشتہ چند برسوں میں یورپ کے مختلف علاقوں کے بہت سے عیسائی مسلمان ہوگئے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے، لندن اور لیورپول میں صحیح اسلامی مزاج رکھنے والی بعض جماعتوں کے اندر سرکردہ نومسلم انگریز بھی شامل ہیں'' (مشرق، مغرب کی نظر میں بحوالہ یورپ اور اسلام ص ۲۱۲) اس کا یہ بھی خیال ہے کہ جو عیسائی دائرۂ اسلام میں داخل ہورہے ہیں، خواہ وہ یورپ کے یا امریکہ کے ہوں، ان سب کا تعلق خواص کے طبقے سے ہے، ان کے اخلاص اور نیک نیتی میں کوئی شبہ نہیں، ان کے پیش نظر کوئی مادی غرض نہیں ہے، اس نے مثال میں ایک انگریز لارڈ ہیڈلی اور ایک مسیحی شرمسنی کا نام بھی دیا ہے، عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں اب ایسی کتابیں مرتب کی جاچکی ہیں، جن میں ہزاروں افراد اور جماعتوں کے حلقہ بگوش اسلام ہونے والوں کے ناموں کی فہرست درج ہے، اس فہرست میں مرد اور عورتوں دونوں کے نام ہیں۔

گستاپ لیبان کہتا ہے کہ قرآن کی حیثیت ایک دینی، سیاسی اور اجتماعی قانون کی ہے، اس کے احکام کا نفاذ دس صدیوں سے زیادہ سے ہورہا ہے، گبن کہتا ہے کہ بحراوقیانوس اور اٹلانٹک کے ساحلوں سے لے کر دریائے جانجس تک قرآن کو ایک اساسی دستور کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے، اس کے اندر صرف دین کے اصول ہی بیان نہیں کئے گئے ہیں، بلکہ جنایات اور شہری زندگی کے احکام اور وہ قوانین بھی بیان کئے گئے ہیں جن پر اسلامی طرز زندگی کا دارومدار ہے۔ (اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۰۰)

جو لوگ اسلام کو جھوٹا اور غلط مذہب قرار دینے پر مصر ہیں ان پر اظہار تعجب کرتے ہوئے کارلائل لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس پیغام کی دعوت دی ہے، وہ کروروں انسانوں کے لئے چودہ سو برس سے آفتاب درخشاں کے مانند جگمگا رہا ہے، بھلا یہ کسی جھوٹے کا جھوٹ اور مکار کا فریب ہوسکتا ہے، اگر جھوٹ، فریب، گمراہی اور ضلالت کا اتنے بڑے پیمانے پر رواج ہوجائے تو زندگی بے سود، عبث اور معدوم ہوجائے۔

بعثت سے قبل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور امانت کی اس قدر شہرت ہوگئی تھی کہ آپؐ امین کے لقب سے موسوم کئے جاتے تھے، مستشرقین نے آپؐ کے اس لقب پر اتنا زور دیا ہے کہ بعض لوگوں کو آپ کا نام ہی مشتبہ ہوگیا ہے، اور وہ آپؐ کے اصلی نام (محمدؐ) کا سرے سے ذکر ہی نہیں کرتے۔

جھوٹ خواہ اپنے اوپر گھڑا جائے یا دوسروں کے خلاف افترا پردازی کی جائے، یہ دونوں ہی صورتیں ایک ایسی دعوت کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں جو دنیا کو اپنی روشنی سے منور کرنا چاہتی ہے، اور کسی بھی داعی کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی دعوت کی کامیابی کی خاطر اپنے لوگوں میں یا دوسروں کے سامنے مستقل اور مسلسل کذب و دروغ سے کام لے، کارلائل کہتا ہے:

"کیا کوئی جھوٹا آدمی جو تعمیر کے مختلف قسم کے ساز و سامان اور ان کی خصوصیات سے ناواقف ہو، اینٹوں کا کوئی مکان بنا سکتا ہے، اگر وہ بنائے بھی تو یہ ملے جلے ساز و سامان کا ایک ڈھیر ہی تو ہوگا، ایسی صورت میں تمہاری اس شخص کے متعلق کیا رائے ہوگی جس نے ایسی عمارت بنائی ہے جس کے ستون گذری ہوئی متعدد صدیاں ہیں اور اس کے اندر لاکھوں، کروڑوں انسان رہ رہے ہیں، اس بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا، ریاکار، نمائش پسند اور حیلہ ساز سمجھنا انتہائی غلط ہے، آپؐ نے کسی مقصد یا لالچ کی خاطر کبھی غلط وسائل و ذرائع نہیں اختیار کئے، آپؐ نے جو پیغام دنیا کو پہونچایا وہ سچا اور برحق تھا اور آپؐ کا کلمہ بھی ایک صدائے حق تھا جو نامعلوم عالم سے ظاہر ہوا تھا، اس نے ساری دنیا کو روشن کر دیا تھا، یہ سب کچھ خدا کے حکم اور فضل سے ہوا، اور اللہ اپنا فضل جسے چاہتا ہے، دیتا ہے۔

دوسری جگہ کارلائل آپؐ کے اوصاف و خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رہن سہن، اکل و شرب، لباس اور پوشاک اور دوسرے تمام معمولات و معاملات میں نہایت سادگی پسند تھے، آپ کی غذا عموماً پانی اور روٹی ہوتی مہینوں گذر جاتے مگر آپ کے گھر میں چولھا بھی نہیں جلتا تھا، کیا اس سے بڑھ کر بھی عزت و فخر کے لائق کوئی بات ہو سکتی ہے، محمدؐ قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ایسی سادہ زندگی بسر کی اور اللہ کے دین کی اشاعت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھا اور لوگ جن چیزوں کی حرص و طمع کرتے ہیں یعنی عہدہ، منصب، حکومت اور اقتدار، انھوں نے ان چیزوں کی کبھی طمع نہیں کی۔"

مستشرقین نے ان کے علاوہ بھی آپ کی نبوت کے دوسرے دلائل بیان کئے ہیں جو احادیث سے ماخوذ و مستنبط ہیں، یا ان کا تعلق ان بشارتوں سے ہے جن کا ذکر گذشتہ آسمانی کتابوں میں ہے، یا غیب کے بارہ میں آپ کی پیشین گوئیوں سے ہے۔

وحی الٰہی کی صورتیں اور قسمیں دلائل نبوت اور اقسام وحی کے مسئلہ میں معتبر اور اعتدال پسند مستشرقین ان اسلامی مصادر و مآخذ پر اعتماد کرتے ہیں جو کتب احادیث و سیر سے ثابت ہیں، اور گذشتہ نبیوں اور پیغمبروں کے حالات و سوانح کے سلسلہ میں ان کا دار و مدار تاریخ کے واقعات و حقائق پر ہوتا ہے مگر اسی کے ساتھ وہ اپنے نفسیات اور علم الاجتماع کے مطالعہ اور ذاتی رائے کو بھی شامل کر دیتے ہیں، پس جن مباحث میں ان کا اعتماد ثابت اور تسلیم شدہ اسلامی مآخذ پر ہوتا ہے وہ یقیناً قابل قبول ہیں، ان میں کسی بحث و کلام یا اختلاف و نزاع کی گنجائش نہیں، رہا نبوت کے بارہ میں ان کا تاریخی حقائق پر اعتماد تو اس سے بھی ان کے دلائل و شواہد کو تقویت حاصل ہوتی ہے، مگر جب وہ ان کے اندر اپنے ذاتی اجتہاد و تاثر اور جائزہ و مطالعہ کو بھی شامل کر دیتے ہیں تو اس وقت قیل و قال، رد و کد اور بحث و نزاع کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے، اسی بنا پر نبوت اور وحی کی قسموں کے بارہ میں مستشرقین کے کئی موقف ہو گئے ہیں۔

محمد رسول اللہؐ مستشرقین کی کتابوں میں رسولؐ کی نبوت اور وحی کی مختلف قسموں جیسے رویائے صادقہ اور حضرت جبرئیلؑ کی لائی ہوئی وحی پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، ایٹن ڈینیہ نے رسول اللہؐ کی خلوت اور تنہائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ آپؐ کے قلب کو مصفی و مجلی بنا دیتی تھی اور دنیا کے مشاغل سے اسے پاک و صاف کر دیتی تھی۔ رویائے صادقہ کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سچے اور روشن خواب دیکھتے تھے اور آپ کو ایسی ندا سنائی دیتی تھی جس کے متعلق آپ کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ کہاں سے آرہی ہے۔ وحی کے بارہ میں وہ بیان کرتا ہے کہ جب خدائے رحمان کی رافت و رحمت اپنے بندوں پر نازل ہوتی ہے تو وہ ان کے پاس اپنے رسول کے واسطہ سے وحی بھیجتا ہے۔ ایک یادگار رات یعنی شب قدر میں پورا قرآن لوح محفوظ سے دنیوی آسمان پر نازل کیا گیا۔ اسی مبارک شب میں قرآن کی پہلی آیتیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئیں۔ حضرت جبرئیلؑ کو حضرت محمدؐ نے دیکھا، یہ وہی فرشتے ہیں جو خدا کے نبی حضرت دانیال اور حضرت مریمؑ کے پاس بھی آئے تھے۔ حضرت جبرئیلؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مختلف شکل و صورت میں تشریف لاتے تھے۔

پھر وہ صحیح حدیثوں کی روشنی میں حضرت جبرئیلؑ کی ان سب مختلف صورتوں کا ذکر کرتا ہے۔

قرآن مجید حضرت محمدؐ کی تصنیف نہیں ہے قرآن مجید کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

تصنیف نہ ہونا ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے، لیکن اس کے برعکس مفسد مستشرقین کا یہ دعویٰ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ قرآن کا اختراع ہے، یا وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کی جولانی طبع اور باطنی عقل وبصیرت کے فیضان کا ایک مظہر ہے، اور وہ خدا کی وحی والہام نہیں ہے۔

ایٹن ڈینیہ لکھتا ہے کہ میرے لئے یہ سخت تشویش اور پریشانی کی بات ہے کہ بعض مستشرقین یہ خیال کرتے ہیں کہ آپؐ نے غار حرا کی تنہائی اور فرصت میں اپنے مستقبل کا لائحۂ عمل مرتب کیا اور اسی میں آپ کو قرآن کی تصنیف وتالیف کا خیال ہوا، کیا واقعی انھوں نے ایسا کیا؟ تو پھر کوئی اور کتاب اس سے پہلے کہاں ایسی مرتب ہوئی، خود اس کی ہر سورہ دوسری سورہ سے الگ ہے اور اس کی سورتیں آپ کو نبوت ملنے کے بعد کسی خاص واقعہ کے سلسلہ بیس برس سے زیادہ طویل مدت میں نازل ہوئی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان واقعات کا پہلے سے متوقع رہنا اور ان کا مشاہدہ کر لینا کیسے ممکن تھا۔ درحقیقت قرآن مجید ایک اعجاز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے انبیاء کو وقتی معجزات عطا کئے گئے تھے اور وہ بہت جلد فراموش بھی کر دیے گئے، مگر قرآنی آیات کا معجزہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے، اس کی اثر آفرینی دائمی ہے، اور یہ ہمیشہ موثر رہے گا، بندۂ مومن کے لئے کسی بھی جگہ اور کسی بھی زمانہ میں محض قرآن کی تلاوت کر کے اس معجزہ کا مشاہدہ کر لینا آسان ہے، قرآن ہرگز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں، یہ اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں کہ اس کی واضح اور روشن آیتوں کو اللہ نے املاء کرایا۔

(محمد رسول اللہؐ، مصنفہ ایٹین ڈینیہ حصہ اول، ص ۱۰۶)

دل ڈیورانٹ سیرت وحدیث کی کتابوں پر اعتماد وانحصار کرنے کے باوجود ضعیف اور موضوع حدیثیں بھی نقل کر دیتا ہے، نیز بعض دور از کار اور جہالت پر مبنی چیزیں تحریر کرنے میں بھی اسے تکلف نہیں ہوتا، جو قاری کو شک وخلجان میں مبتلا کر دیتی ہیں، وہ لکھتا ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر جب چالیس برس کے قریب ہوئی تو آپ کا دینی امور میں انہماک بہت بڑھ گیا، جب رمضان کا مہینہ آتا جو اشہر حرم (۱) میں ہے تو آپ تنہا اور کبھی پورے خاندان کے ساتھ حرا پہاڑ پر

(۱) یہ غلط ہے، اشہر حرم مندرجہ ذیل ہیں:
ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم، رجب، رمضان ان میں شامل نہیں، سیرت ابن ہشام میں ہے کہ آپؐ ہر سال ایک مہینہ غار حرا میں مقیم رہتے۔ ابن ہشام نے رمضان کے مہینہ کی صراحت نہیں کی ہے۔

تشریف لے جاتے، یہ مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا، یہاں پہونچ کر شب و روز قیام فرماتے اور روزہ، نماز اور غور وفکر میں وقت گذارتے، اسی اثناء میں جب کہ آپؐ غار میں تنہا معتکف تھے کہ ۶۱۰ء کو شب میں وہ عظیم الشان واقعہ پیش آیا جو پوری اسلامی تاریخ کا محور بنا۔"

پھر دل ڈیورانٹ نے نزول وحی کی ابتداء کے بارہ میں ابن اسحاق کی روایت نقل کی ہے اور اس کے بعد کی چیزیں سیرت ابن ہشام کے حوالہ سے تحریر کی ہیں۔ (قصۃ الحضارۃ ج ۲ ص ۲۴)

نبوت اور وحی کے مسئلہ میں مستشرقین کے مختلف نہج

نبوت اور وحی کے مسئلہ میں مستشرقین کی بحث و تحقیق کا نہج جدا جدا ہے، کبھی ان کا انداز خالص روایتی ہوتا ہے، کبھی وہ اپنی بحث کو دقیق و غامض بنا دیتے ہیں اور کبھی صرف ذاتی احساسات و تاثرات کا اظہار کرتے ہیں، بعض مستشرقین وحی کی صرف ایک ہی صورت پر بحث کرتے ہیں، مثلاً رویائے صادقہ کو مانتے ہیں، مگر حضرت جبرئیلؑ کے وحی لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کو مستبعد قرار دیتے ہیں۔

(الف) بیڈلی کا بیان ہے کہ عمر زیادہ ہونے کے بعد غور وفکر کی وجہ سے آپؐ کے اندر عصبیت کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، نیز کھانے پینے، چلنے پھرنے اور آزاد زندگی ترک کرنے اور روزے اور شب بیداری کے نتیجہ میں آپ کی صحت متاثر ہوگئی تھی، اس لئے نیم خوابی میں آپ کو عجیب وغریب خواب دکھائی دیتے تھے، جو غنودگی اور غفلت کی کیفیت زائل ہونے کے بعد آپؐ کو اچھی طرح یاد آجاتے تھے۔" یہ بیان کرنے کے بعد وہ آپؐ کے پیغام کو اس طرح برحق ثابت کرتا ہے "کسی یہودی، عیسائی اور بودھ نے اپنی نگاہ کے سامنے اپنے دین کو اس قدر معجزانہ سرعت کے ساتھ نشو ونما پاتے نہیں دیکھا ہوگا اور نہ کسی دوسرے دینی رہنما کو اپنی زندگی ہی میں اپنی دعوت کی کامیابی کو اس طرح دیکھنا نصیب ہوا ہوگا جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا، بیڈلی یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری رسول اور اسلام اس کا آخری دین ہے، آپؐ کا اصلی امتیاز وحی ہے، آپ جو کچھ کرتے تھے اس کی ہدایت آپؐ کو خدا کی طرف سے ہوتی تھی، آپؐ نہ فرشتہ تھے اور نہ آپؐ کی حیثیت عیسائیوں کے قدیس (سینٹ) کی طرح تھی، آپؐ کی زندگی طرز رہائش کے اعتبار سے دوسرے لوگوں سے ممتاز اور مختلف نہیں نظر آئے گی، آپؐ کے نام کا سکہ نہیں چلتا تھا اور نہ آپؐ کے پاس دولت و ثروت کی فراوانی تھی۔

(ب) فلپ ہٹی کے نزدیک وحی خواب اور فکر کا نام ہے، مگر آخر میں وہ اسے حضرت

جبرئیلؑ کی آواز بتاتا ہے، چنانچہ لکھتا ہے"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پے در پے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے جن کی وجہ سے فکر و تامل آپ کی عادت ثانیہ بن گئی تھی، اسی غرض سے آپؐ ایک غار میں تشریف لے جاتے تھے جو مکہ کے شمال میں دو فرسنگ کے فاصلہ پر حرا پہاڑ کی بلندی پر تھا، یہاں آپ غور و فکر میں منہمک رہتے اور وحی والہام کے بھی منتظر رہتے تھے، چنانچہ اسی غار میں ایک روز آپؐ نے سونے کی حالت میں یہ آواز سنی:

اِقْـرَأْ بِـاسْـمِ رَبِّـکَ الَّـذِیْ خَلَقَ (علق: ۱)
پڑھ اپنے اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔

یہاں تک کہ جب مدنی سورتیں نازل ہونا شروع ہوئیں تب بھی یہی آواز آپ کو سنائی دیتی تھی، اس کو مسلسل سننے کی وجہ سے آپ سمجھ جاتے تھے کہ یہ حضرت جبرئیلؑ کی آواز ہے۔"
(تاریخ العرب ج ۱ص ۱۵۷)

ہٹی کی کتاب کی ایک فصل کا عنوان ہے"قرآن خدا کی کتاب ہے" اس میں وہ لکھتا ہے:
"قرآن کا مطالعہ کرنے والے جدید علوم کے مبصرین اس کے موجودہ متداول نسخہ کے صحیح ہونے پر متفق ہیں، آج کے سارے قرآنی نسخے تقریباً حضرت زیدؓ کی اصل کے مطابق ہیں، نیز قرآن اپنی موجودہ شکل و صورت میں بعینہٖ وہی ہے جو حضرت محمدؐ پر نازل ہوا تھا، مسلمانوں کے نزدیک قرآن مجید خدا کا وہ کلام ہے جس کو حضرت جبرئیلؑ نے حضرت محمدؐ کے سامنے پڑھا، اور یہ کلام لوح محفوظ میں تھا جو ساتویں آسمان پر ہے۔"

وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت نبوت کے کمالات کی طرح قانون سازی کے اوصاف کی جامع تھی، آپؐ میں امانت و دیانت کی خوبیاں بھی تھیں، اور آپؐ قضا اور قوت فیصلہ کے مالک بھی تھے، آپؐ فوجوں کے سپہ سالار اور ریاست و حکومت کے سربراہ بھی تھے۔"

(ج) ایک مستشرق ڈرمنگھم نے وحی کا ذکر بالکل افسانوی انداز میں کیا ہے، اس نے اپنی کتاب "حیات محمدؐ" میں بہت سی گمراہ کن اور باطل چیزیں جمع کی ہیں اور روایتوں کو ایک دوسرے میں گڈمڈ بھی کیا ہے، اس طرح خود اس کی کتاب میں افسانوی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

ڈرمنگھم نے وحی اور نبوت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں گو بعض باتیں صحیح ہیں، مگر اکثر غلط اور بے بنیاد ہیں، اس نے صحیح اسلامی مآخذ و مصادر اور مستند تاریخی حقائق و واقعات پر انحصار و اعتبار کرنے کے بجائے اپنے ذاتی اجتہاد و تاثر پر زیادہ بھروسہ کیا ہے، نیز اس نے صحیح اور غلط حدیثوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

ہجرت کے بارے میں مستشرقین کا موقف

تلخیص وتبصرہ

مولانا عبدالرحمن پرواز اصلاحی مرحوم سابق رفیق دارالمصنفین

مستشرقین کا مطالعہ بڑا وسیع ہے، وہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو اپنا موضوع بحث بناتے ہیں تو تاریخی واقعات کے سلسلے میں جدید ادبی انداز سے تنقید بھی کرتے ہیں اور اپنا خاص نقطۂ نظر پیش کرنے سے باز نہیں آتے۔

مستشرقین میں بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے پوری سیرت نبویؐ پر قلم اٹھایا ہے اور حیات نبویؐ کے تمام پہلو پر ولادت سے لے کر وفات تک بلکہ اس کے بعد کے واقعات بھی بیان کیے ہیں، انھیں میں سے ہجرت نبویؐ کا مہتم بالشان واقعہ بھی ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا اہم پہلو ہی نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کا بھی ایک اہم حصہ ہے، یہ دعوت اسلامی کا ایک بنیادی مرحلہ بھی ہے اور ایسی تاریخی یادگار بھی جس نے نہ صرف جزیرۂ عرب پر اپنا خاص اثر چھوڑا بلکہ اس کے دور رس اثرات تہذیب انسانی پر بھی پڑے۔

بڑی بات یہ ہے کہ مستشرقین اپنے بعض جزئی اختلافات کے باوجود واقعۂ ہجرت کے وقوع پر اتفاق رکھتے ہیں، اور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ پوری دنیا میں اپنے ہمہ گیر اثرات کی بنا پر یہ تاریخ انسانی کا ایک اہم واقعہ ہے۔

کچھ مستشرقین ایسے بھی ہیں جنھیں ہجرت کے بعض واقعات بیان کرنے میں سخت لغزش ہوئی ہے، حالانکہ وہ واقعات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں، لیکن انھیں اس پر بڑا تعجب ہے، ان کے خیال میں یہ ایسے انوکھے واقعات ہیں جو ہجرتوں کی تاریخ میں کبھی رونما نہیں ہوئے، اپنے اسی خیال کی بنا پر انھوں نے غیر حقیقت پسندانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان کی کتابوں میں بے بنیاد باتیں داخل ہوگئی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) صحابہ کی ہجرت کے بعد مکہ میں کچھ روز رسول اکرمؐ کا قیام۔
چنانچہ اٹین ڈین اپنی کتاب ''حیات محمدؐ'' میں کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین کے چلے جانے کے بعد اپنے ساتھی ابوبکرؓ و علیؓ کے ساتھ مکہ میں ٹھہرے رہے، حالانکہ وہ اس وقت جن خطرات میں گھرے ہوئے تھے، ان سے لاعلم تو نہیں تھے، باوجودیکہ ابوبکرؓ نے نہایت عاجزانہ درخواست بھی کی، لیکن اس صورت میں بھی آپ نے چاہا کہ اپنے ہم وطنوں کو دائرۂ اسلام میں لانے کی آخری تدبیر کرلیں، پھر یہ بھی کہ ہجرت کے وقت نہ ان پر پریشانی تھی اور نہ خوف و ہراس کا عالم۔

(۲) رسول اکرمؐ کے اپنے گھر سے نکلنے کے متعلق روایات کا اختلاف۔ ایک روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ اپنے گھر سے نکلے تو اپنے مخلص چچا کے لڑکے علیؓ کو ایک چادر اڑھا کر اپنے بستر پر چھوڑ دیا، یہ روایت بہت مشہور ہے جس سے آپ کے معجزہ کا بھی اظہار ہوتا ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ آپ نے آہستہ سے اپنے گھر کا دروازہ کھولا، قریش مکہ اس وقت آپ کی تاک میں مسلح کھڑے ہوئے تھے، آپؐ نے ایک مٹھی خاک لی اور ان کے سروں پر پھینک دی، اور وہاں سے اس طرح نکل گئے کہ وہ آپ کو بالکل نہ دیکھ سکے، اس کا ذکر قرآن کی ۳۶ ویں سورت میں بھی آیا ہے، فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (یٰسین) تو ہم نے ان کو اوپر ڈھانک دیا اور وہ دیکھ نہ سکے۔

لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت محمدؐ نے دیوار کے اوپر چھلانگ لگائی اور ان کے ایک خادم نے دیوار سے اترنے میں مدد کی، اس نے آپؐ کے لئے اپنی پیٹھ جھکا کر سیڑھی بنادی اور پھر آپ اس کے ذریعہ اتر گئے اور اس طرح اپنے مکان سے نکل جانے میں کامیاب ہوگئے، حالانکہ یہ روایت سراسر جھوٹی ہے اور عربی مصادر میں کہیں بھی نہیں پائی جاتی۔

(۳) سراقہ ہجرت سے نہ روک سکا۔ ہجرت کے سلسلے میں مستشرقین میں چاہے ڈین ہو یا ہٹی یا ازونگ سب اس بات پر متفق ہیں کہ سراقہ ہجرت کے اقدام کو نہ روک سکا، البتہ ارونگ کہتا ہے کہ رسول اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ سواروں کا ایک دستہ آگیا اور سراقہ ان کی قیادت کر رہا تھا، (حالانکہ سراقہ تن تنہا تھا) پھر مہاجرین میں سے کچھ لوگ آئے اور آپ کو اور ابوبکرؓ کو قبا تک لے گئے۔

ڈین کا خیال ہے کہ پہلی روایت میں جو بات سراقہ کے قول سے تعلق رکھتی ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہے، سراقہ نے کہا کہ میں تھوڑی دیر ٹھہرا، پھر اپنے گھر گیا اور اپنی لونڈی سے کہا کہ چپکے سے

میرے گھوڑے کو وادی میں لے چل، میں نے ایک غلام کو جو سیاہ فام، طاقتور اور بہادر تھا، حکم دیا کہ میرے لئے ایک خچر لائے اور وہاں تک پہنچادے، اور پہنچنے کے بعد میرا انتظار کرے، پھر میں دروازے کے پیچھے سے جھک کر آہستہ نکلا، میں نے اپنے نیزے کی انی بھی زمین میں گاڑ دی تاکہ اس کی چمک کسی کو دکھائی نہ دے، اور یہ سب میں نے اس لئے کیا کہ اس کام میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو سکے اور اس کا سہرا میرے سر رہے۔

(۴) **غار کے متعلق ڈین کا بیان** ۔ڈین نے بیان کیا ہے کہ پہلے حضرت ابوبکرؓ تن تنہا غار میں گئے تاکہ اس کے اندر جا کر دیکھ لیں کہ کوئی موذی جانور وغیرہ تو نہیں ہے، پھر انھوں نے غار سے پتھر کے ٹکڑوں کو جمع کیا اور اپنے کپڑے میں رکھا اور دور لے جا کر پھینک آئے، اور ان سوراخوں کو بھی اچھی طرح دیکھ لیا، جس میں اندیشہ تھا کہ سانپ وغیرہ زہریلے جانور ہوں گے، اپنے کپڑے پھاڑے اور تمام سوراخوں کو چیتھڑے سے بند کردیا، غار میں راحت کے لئے تمام سامان کر چکے تو رسول اکرمؐ اس میں داخل ہوئے کچھ دیر کے بعد رسولِ اکرمؐ کو گہری نیند آگئی، آپؐ اپنا سر حضرت ابوبکرؓ کی ران پر رکھ کر سو رہے تھے، اتنے میں ابوبکرؓ کی حالت دگرگوں ہونے لگی کسی موذی زہریلے جانور کا زہر ان کے خون میں سرایت کر چکا تھا، رسول اکرمؐ نے اپنا لعابِ دہن زخم پر لگایا اور تھوڑی دیر اسے سہلایا، فوراً ہی تکلیف اور سوجن دور ہوگئی۔

غار میں جب تک رہے ابوبکرؓ کا غلام عامر بن فہیرہ جوان کی بکریاں چرایا کرتا تھا، شام کو آپ کے پاس دودھ اور گوشت لے کر آتا، پھر صبح کو بکروں کے ریوڑوں میں چلا جاتا، چلتے وقت وہ نشانات قدم بھی مٹاتا جاتا۔

(۵) **رسول اکرمؐ کا مدینہ میں فتحمندانہ داخلہ** ۔مستشرقین میں سے تین اس بات پر متفق ہیں کہ انصار نے رسول اکرمؐ کا بڑا پر جوش خیر مقدم کیا، مہاجرین اور انصار آپؐ کے پاس اکٹھا ہو گئے، اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ آپ ان کے کامیاب قائد ہیں، چنانچہ ہٹی کہتا ہے کہ ہجرت رسول اکرمؐ کی زندگی میں ایک نئے دور کا دیباچہ تھی اسی سے مکی دور کا خاتمہ اور مدنی دور کا آغاز ہوتا ہے، کہاں یہ حال تھا کہ آپؐ اپنے شہر میں ایک کمزور اور ناقابل التفات شخصیت تھے اور اب یہ حال ہے کہ یثرب کی سرزمین میں ایک نہایت باعزت رہنما کی حیثیت آپؐ کو حاصل ہوگئی، اسی جگہ سے آپ کی توجہ ایک سیاسی نظام قائم کرنے کی طرف ہوئی، اور آپ نے سیاسی امور کی طرف توجہ دینا شروع کیا، اس کے علاوہ ڈین ہمیں اور زیادہ تفصیلات بھی فراہم کرتا ہے، اس نے

اس سلسلے میں ذرا دقت نظر سے بحث کی ہے، وہ کہتا ہے کہ آپ بنی سالم بن عوف کی زمین سے گذر رہے تھے کہ نماز کا وقت آ گیا، اور آپ سواری سے اتر پڑے، آپ نے پہلی مرتبہ نماز جمعہ مدینہ میں ادا کی، آپ کے پیچھے مسلمانوں کی بڑی جماعت نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ صف بستہ کھڑی ہوگئی نماز ختم ہونے پر آپ مسلمانوں کی طرف مخاطب ہوئے، اور انھیں نصیحت فرمائی۔ پھر آپ ناقہ پر سوار ہو کر یثرب میں فتحمندانہ طور سے داخل ہوئے، قبائل پرا باندھے ہوئے کھڑے تھے اور ان کے دل جوش وولولہ سے لبریز تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پرجوش استقبال اور خاص طور سے مہاجرین کے ساتھ ان نئے پیروؤں کے سلوک سے بہت متاثر ہوئے، آپؐ نے اپنی گہری بصیرت سے انھیں ایک ایسے موثر رشتے میں جوڑنے کی کوشش کی جس سے ان میں جذبۂ رشک ورقابت نہ پیدا ہوسکے۔

''اروِنگ'' نے صرف اس کی تاریخی حقیقت کو پیش نظر رکھا ہے، وہ اس کی تفصیلات میں نہیں گیا ہے، وہ کہتا ہے کہ حضرت محمدؐ کی اونٹنی قصواء بیٹھ گئی اور چلنے کے لئے تیار نہ ہوتی تھی، اس وقت رسول اکرمؐ کو خیال ہوا کہ قباء میں ٹھہر کر مدینہ میں داخل ہونے کی تیاری کرلیں، اس نے آپ کا مدینہ میں داخلہ یوم جمعہ ۱۶ ربیع الاول قرار دیا ہے، جس دن آپ مدینہ میں داخل ہوئے تو ستر سوار آپ کے جلو میں تھے، ان کے سردار بریدہ رسول اکرمؐ کے محافظ کے طور پر تھے، مدینہ سے تھوڑی دور کے فاصلے پر تھے کہ نئے مسلمانوں کی جماعت استقبال کے لئے جمع ہوگئی، اس وقت تیز دھوپ تھی، لیکن لوگ پھیلی ہوئی مٹی پر کھڑے رسول اکرمؐ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے، آپ اگرچہ اپنے وطن کو چھوڑ کر نکلے تھے لیکن مدینہ میں داخل ہوئے تو اس شان سے کہ معلوم ہوتا تھا کوئی تاجدار ہے اور کسی فاتح ومنصور کا استقبال کیا جارہا ہے، یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ یہ کوئی مہاجر ہے جو پناہ کے لئے یہاں آیا ہو۔

(۲) **ہجرت کی اہمیت** ۔ ہجرت کی اہمیت کے بے شمار پہلو ہیں، مستشرقین کا قلم اس موضوع پر لکھتے وقت کبھی حقیقت سے قریب ہوتا ہے اور کبھی دور، وہ اس پر کبھی اجمالی طور سے اظہار خیال کرتے ہیں اور کبھی تفصیلی لیکن ان کی تحریروں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی اہمیت بہرحال ان کے نزدیک رہی ہے۔

(الف) **ہجرت سیرت نبویؐ کا سب سے اہم واقعہ** ۔ ''ڈین'' نے بڑے پرزور طریقے سے ہجرت کی اہمیت پر کلام کیا ہے، پہلے تو اس کی پسندیدگی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے

لیکن یہ حیرت اس وقت بالکل ختم ہو جاتی ہے جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک رسول اللہؐ کی زندگی کا یہ کوئی اہم واقعہ نہیں ہے، اور نہ اسلام کی اشاعت پر اس کا کوئی زبردست اثر پڑا، اس کے خیال میں حضرت محمدؐ مکہ میں بھی رہتے تو بھی دشمنوں کے مقابلے میں آخر کار انھیں کامیابی حاصل ہو جاتی، اسلام آپ کے ساتھ باقی رہتا اور نہ آپ کے ہم وطن آپ کو تکلیف پہنچا سکتے تھے اور اسلام کی روشنی پوری دنیا میں پھیل سکتی تھی۔

(ب) **ھجرت دعوت اسلامی کا ایک اہم مرحلہ** ۔لیکن ''ارونگ'' دعوت اسلامی کے سلسلے میں ہجرت کی اہمیت کا قائل ہے، وہ مسلمانوں کی دلیری اور ان کی عزت و تکریم کے تذکرہ میں کہتا ہے کہ اس کی وجہ سے اسلام مرکز توجہ بن گیا، مدینہ میں جب حضرت محمدؐ آئے اور وہاں کے لوگوں نے مدد کی تو وہ آپ کی جانب سے ''انصار'' کے لقب سے سرفراز ہوئے، دوسری جگہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ہجرت ہی کا واقعہ ہے جو تاریخ عربی کا سر آغاز بنا، مسلمان اسی بنا پر اس کا احترام کرتے ہیں اور یہ واقعہ ۶۲۲ عیسوی میں ہوا۔

(ج) **ھجرت کی شرعی اور تنظیمی یادگاریں** ۔ہٹی ایک ایسا شخص ہے جس نے ہجرت کے بعض دوسرے گوشوں سے بحث کی ہے، اس کے قول کے مطابق ہجرت کے بعد قانون شریعت کا اجرا ہوا اور مسلمانوں کی حکومتی تنظیم عمل میں آئی، داخلی اور خارجی معاملات طے پائے اور عالمی طور پر تعلقات کی وسعت ہوئی، اسی مدنی دور میں مسلمانوں کی تنظیم ایک عربی قومیت کی شکل میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، رسول اللہؐ نے یہودیت اور نصرانیت سے تعلقات ختم کر کے از سر نو تعلقات پیدا کئے آپ نے جمعہ کی نماز قائم کی، نرسنگھا اور گھنٹے کے بجائے اذان کا طریقہ جاری کیا، رمضان کے مہینے میں روزے مقرر کئے، قبلہ بیت المقدس سے مکہ کی طرف بدلا گیا، خانہ کعبہ کا حج، حجر اسود کا بوسہ ضروری قرار دیا گیا، مدینہ کی اسی دینی سوسائٹی سے بعد میں اسلامی حکومت کی نشو و نما ہوئی، دین کی اجتماعی اساس قائم ہوئی، مہاجرین و انصار میں بھائی چارگی ہوئی، جزیرۃ العرب کی تاریخ میں یہ پہلی تبدیلی تھی کہ عربوں کی تنظیم ایک ایسے انداز سے ہوئی، جس سے وہ کبھی آشنا نہ تھے، ماضی کی طرح اس کی بنیاد بجائے خون و نسل کے خالص دین پر رکھی گئی، رشتۂ توحید میں آ کر وہ ایک زبردست سیاسی تنظیم بن گئے۔

اس نئے دینی ماحول میں نہ تو کاہنوں کی کوئی اہمیت رہ گئی اور نہ مذہبی پیشواؤں کی، جیسا کہ عیسائیت میں پاپاؤں کو حاصل ہے۔

(د) **عربیت سے عالمیت کی طرف**

(۱) فرانسیسی مستشرق ''ڈیسن'' اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ محمدؐ کے بارے میں جاننے کی چیز یہ ہے کہ اسلام جو ایک کمزور مذہب تھا ہجرت نبوی کے بعد مدینہ میں اسے زبردست سہارا مل گیا اس کی حمایت میں چمکدار تلواریں بھی تھیں اور دھڑکتے ہوئے دل بھی، ان میں یہ بلند حوصلہ پیدا ہوا کہ اسلام کی آواز جزیرۂ عرب سے لے کر دنیا کے دور دراز حصوں تک پہنچا دیں، پہلے لوگ مختلف ٹولیوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے، مگر اسلام نے انھیں ایک رشتہ اخوت میں جوڑ دیا، ان کے اندر عدل وانصاف قائم کیا جس کی مثال کبھی جزیرۂ عرب کے اندر دیکھنے میں نہ آئی۔

اسلام کی بدولت جزیرۂ عرب طاقتور بن کر ابھرا اور عربوں کی شان بڑھ گئی، یہاں تک کہ تھوڑے عرصہ میں جزیرۂ عرب کا بڑا حصہ اس کا پیرو بن گیا، پھر تو اس کرۂ ارض کے بادشاہوں تک اپنی دعوت پہنچائی، یہ صرف اس لئے کہ یہ دین صرف عربوں کا دین نہیں ہے بلکہ تمام انسانیت کا دین ہے اور پوری دنیا کے لئے آیا ہے۔

(۲) انگریز مستشرق ٹامس کارلائل نے اپنی کتاب ناموران عالم میں بتلایا ہے کہ ہجرت کی ایک صدی بھی گذرنے نہ پائی تھی کہ اسلام سارے عالم میں پھیل گیا، اس واقعہ کے بعد حال یہ تھا کہ عرب کا ایک شخص ہندوستان میں ہے تو دوسرا اندلس میں، اسلامی حکومت کے محاسن اور حق و صداقت کی روشنی نصف کرۂ ارض تک پہنچ گئی اور پھر ان میں ایک ایسا ایمان پیدا ہوا جو قوت وحیات کی صورت میں نمایاں ہوا۔

(۳) فرانسیسی مستشرق ''درمنگھم'' اپنی کتاب حیات محمدؐ میں ہجرت سے آگے بیعت عقبۂ ثانیہ سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتا ہے، بیعت عقبۂ ثانیہ ہی کے وقت یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ بیعت کرنے والے لوگ دنیا کی تاریخ میں ایک عظیم الشان انقلاب لائیں گے، وقت کبھی سازگار رہتا ہے اور کبھی ناسازگار، لیکن اصحاب عقبہ کا شاید اس کا اندازہ نہ تھا کہ ان کا یہ سفر تاریخ عالم کے رخ کو بدل دے گا تقریباً یہی بات ''آر، اف، بودلی'' نے اپنی کتاب ''حیات محمدؐ'' میں کہی ہے، اس وقت دنیا نے اس مذہب کو قابل التفات نہ سمجھا، لیکن مدینہ کی سرزمین میں پہنچتے ہی اس میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے، اور پھر لوگوں نے سمجھا کہ ہجرت کے اندر کیا حقیقت پوشیدہ تھی یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد جب حضرت عمرؓ کی خلافت کا دور آیا تو آپ نے اس دن کو تاریخ اسلامی کی ابتدا قرار دیا، اور اسی وقت سے دنیا کے تمام مسلمان اپنی تاریخیں ہجری کے حساب سے لکھنے لگے۔

(۴) امریکی مستشرق ''فیلپ ہٹی'' بھی اپنی کتاب ''تاریخ عرب'' میں ہجرت کی عالمی

حیثیت پر بحث کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہجرت کوئی ناگہانی واقعہ نہ تھا، بلکہ دو سال کی ایک سوچی سمجھی اسکیم تھی، یہ نئے دور کا دیباچہ تھی، مدینہ کی سرزمین سے نکل کر اسلام کی تعلیمات پہلے جزیرۂ عرب کے اطراف تک پہنچیں، پھر مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے بڑے بڑے حصوں تک پھیل گئیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایک حکومت کی بنیاد پڑی، جس کے حدود تھوڑے عرصہ میں دور دراز تک وسیع ہو گئے، اس زمانے میں دنیا کے تمام متمدن ملکوں میں اس سے اچھی کوئی حکومت نہ تھی۔

(۳) مستشرقین کے موقف کا جائزہ۔ کوئی شخص مستشرقین کے ایجابی اور معتدل موقف کا بغور مطالعہ کرتے تو اس کے سامنے بہت سے پہلو آئیں گے، کبھی ان میں دلی مقصد چھپا ہوا ملے گا اور کبھی واضح طور سے محسوس ہوگا کہ وہ علمی اور تاریخی حقائق بیان کریں یا اپنے تاثرات کا اظہار، انھیں بغیر تنقید کے ماننا مناسب نہیں ہے، بعض لوگ سرسری نگاہ سے انھیں پڑھتے ہیں تو دھوکہ کھا جاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں تحقیر اور حیرت کے جذبات ملے جلے ہوتے ہیں، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ انصاف سے کام لیں اور اعتدال کی روش اختیار کریں، وہ جب لکھتے ہیں تو حق اور ناحق دونوں کو شامل کر دیتے ہیں، اس لئے تحقیقی نظر سے مطالعہ کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھیں، ان کی یہ روش صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہی کے بارے میں نہیں ہے بلکہ اسلام کی تمام مشہور شخصیتوں کے متعلق ان کا یہی رویہ ہے، اس سلسلے میں مندرجۂ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) مستشرقین انسانی حقائق پر قدرت کے باوجود رسول اکرمؐ کے اوصاف کا ذکر کرتے ہیں، تو ان کا انداز عام تاریخ نویسی سے الگ ہوتا ہے، ان میں ان کے فکر وعقیدہ اور اپنے ماحول کے اثرات بھی کارفرما ہوتے ہیں، وہ تاریخی واقعات کے ذکر میں تو عام پہلو اختیار کرتے ہیں، لیکن رسول اللہ کی سیرت جب بیان کرتے ہیں تو ان کا انداز بدل جاتا ہے، اگرچہ عام طور سے ان کا دعویٰ یہی ہے کہ انھوں نے اپنے اگلوں کی پیروی کی ہے اور نہایت انصاف اور غیر جانبداری سے کام لیا ہے، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حالات کے بیان کرنے میں ان کے اصلی مصادر سے رجوع کیا ہے، معقولیت اور منطقی انداز سے ان کے ہر پہلو کی وضاحت کی ہے، ایمانداری اور غیر جانبداری سے اظہار خیال کیا ہے۔

بلاشبہ انھوں نے بعض تاریخی حقائق کے اظہار میں ایسی ہی روش اختیار کی ہے، چنانچہ ارباب کلیسا کے شاہانہ محلوں اور کاہنوں کے وسیع اور کشادہ مکانات کے سلسلے جو کچھ لکھا ہے وہ مغربی

مصنفوں سے بالکل ہٹ کر لکھا ہے، انھوں نے مغرب کے بااقتدار لوگوں کی کچھ پرواہ نہیں کی ہے، اس قسم کی مثالیں زیادہ تر رنیان، ٹالسٹائی، ہیڈلے اور لورود یشیا وغیرہ کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

(۲) سیرت نبویؐ کے لئے مخصوص اصول اور قاعدے ہیں، سیرت نبویؐ کے موضوع پر لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سب سے قدیم ماخذ قرآن، حدیث اور تاریخ کو پیش نظر رکھا جائے، واقعات کے سلسلے میں جہاں شک اور خلجان ہو تو روایتوں کے جانچنے کے لئے معیار ہیں، لغت سے واقفیت اور فکر سلیم بھی درکار ہے، یہ ضرور ہے کہ شخصیت کے بارے میں سب کے تاثرات یکساں نہیں ہوتے، مگر جب رسول کی سیرت پر بحث ہو تو ان عوامل اور اسباب کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہئے، جن کی بنا پر معاشرہ کی اصلاح، نیک اور مفید کام انجام پائے اور جب تمام عناصر یکجا پائے گئے تو آپ کو اسلام کی امانت دے کر تمام لوگوں کے پاس بھیجا گیا۔

رسول کی شخصیت کے متعلق مستشرقین کے طریقۂ تحقیق اور اسلوب سے مسلمانوں میں عقاد، زیات، مازنی اور ہیکل وغیرہ خاص طور سے متاثر ہوئے ہیں اور ان کے بعد بھی کچھ لوگوں پر اس کا اثر پڑا ہے، لیکن اس سلسلے میں جن اصولوں کی نشاندہی کی گئی ہے اس سے پہلے مسلمانوں نے اپنی ان کتابوں میں کام لیا ہے جو فن تراجم ورجال سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۳) شاطرانہ انداز تحسین، مستشرقین رسول اللہ کی سیرت کے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں کچھ پہلو مخفی بھی رکھتے ہیں، ان کے سوچنے کا انداز ہر زمانہ میں یکساں رہا ہے، دور وسطی میں بھی اور دور جدید میں بھی، انھوں نے رسول اللہ کی بشریت پر بھی اظہار رائے کیا ہے، اور آپ کی عبقریت کو بھی مانا ہے، لیکن جب نبوت اور رسالت کی بات آتی ہے تو صاف بچ کر نکل جاتے ہیں اگر اس کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو اس میں گروہی عصبیت موجود ہوتی ہے، وہ ہمیشہ نبوت کے اسرار پر کنایہ اور اشارہ میں گفتگو کرتے ہیں، وہ زیادہ تر رسول اللہ کی شخصیت کو عرب کے ایک ممتاز قائد کی صورت میں پیش کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آپ کی بدولت عرب انسانیت کے مختلف میدانوں میں آگے بڑھے، ترقی یافتہ تہذیب کی قیادت ان کے ہاتھوں میں آئی، آپ کے اعلیٰ اور شریفانہ اوصاف کا اثر آپ کے ماننے والوں پر بھی پڑا اور وہ بھی اعلیٰ اوصاف کے مالک بن گئے۔

ایک طرف سیرت رسول کا یہ انداز ہے، لیکن دوسری طرف جب وہ دوسرے اسلامی موضوعات پر لکھتے ہیں تو ان کا موقف بدل جاتا ہے، حالانکہ جہاں آپ کی شخصیت دوسروں سے بالاتر ہے وہاں آپ کی تعلیمات بھی سب پر فوقیت رکھتی ہیں۔

(۴) انسانی اور تمدنی ترقی کا اقرار: مستشرقین نے ایجابی موقف بھی اختیار کیا ہے، فکری اور مادی ترقیوں کا جائزہ لیا ہے، اس کے لئے کافی جدوجہد کی ہے، اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ مواد کی فراہمی میں صرف کیا ہے، وہ جہاں رسول اللہ کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہیں وہاں اسلامی فتوحات پر بھی عقلی اور عسکری نقطۂ نظر سے روشنی ڈالتے ہیں، اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فتوحات دنیا کے لئے خیر و برکت کا باعث ہوئیں، بعض نے معرکہ بواتیہ کا جو ۷۳۲م میں ہوا اس کے ذکر میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اندلس کے عربوں کو شکست اٹھانی پڑی اور اس کے بعد یورپ کی تہذیب صدیوں پیچھے چلی گئی۔

اسی طرح جب رسول اللہ کو ایک اجتماعی مصلح کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں تو آپ کی غیر معمولی شخصیت اور انقلاب آفریں پہلو کا ضرور تذکرہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ آپ کی بدولت دنیا میں زندگی نے نئی کروٹ لی، آپ نے پرانی دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا، آپ نے عدل و رحمت اور قانون اور اخلاق کی بنیادیں استوار کیں۔

''لیبری'' عرب کے متعلق کہتا ہے کہ اگر عربوں کا نام تاریخ سے حذف کر دو تو یورپ کا دور جدید صدیوں پیچھے چلا جائے گا، علم کے تمام میدانوں میں عربوں کی بدولت روشنی آئی، بحث و تحقیق کے منصفانہ اصول قائم ہوئے اور ان کے علماء نے کوئی ایسا دروازہ نہیں چھوڑا جسے انھوں نے کھٹکھٹایا نہ ہو۔

(۵) مستشرقین کے جائزہ میں قابل غور پہلو: مستشرقین کے دلکش اور شیریں اقوال سے متاثر ہو جانا مسلمانوں کی بڑی کمزوری ہے، وہ جب دیکھتے ہیں کہ مستشرقین آپ کے اوصاف نہایت عمدہ انداز سے بیان کر رہے ہیں، اور آپ کو نہ صرف غیر معمولی انسان مانتے ہیں بلکہ مصلحین کی صف میں اولیت کا درجہ دے رہے ہیں تو بہت خوش ہو جاتے ہیں، لیکن مستشرقین کی مدح رسول میں بھی ان کا دلی مقصد چھپا ہوتا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ مدح و تعریف کے پہلو سے آپؐ کے نبی اور رسول ہونے کی اہمیت کو ختم کر دیا جائے، اور لوگوں میں آپ کی قائدانہ حیثیت اتنی نمایاں ہو جائے کہ بحیثیت رسول کے آپؐ نے خدا کی جو تعلیمات بیان کی ہیں اور ایمان و عقائد اور عبادات سے متعلق جو شرعی احکام دئے ہیں، وہ باقی نہ رہیں۔

ان چالاک اور عیار لوگوں میں بعض تو اسلام کے ہمدرد بن کر سامنے آئے ہیں وہ تمام ممالک اسلامیہ میں جاتے ہیں تو ان کی پذیرائی ہوتی ہے، یہ لوگ علماء کا لباس زیب تن کر کے بہت

سے علمی اداروں میں گھس گئے ہیں، اور اپنی اسی اسکیم کے تحت کام کر رہے ہیں۔ قاہرہ، دمشق، بغداد اور بیروت کے تحقیقی اداروں کے چوتھائی ارکان اسی قسم کے لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں، نمایاں لوگوں میں ''مارگیولیتھ'' کی کارستانیوں سے کون واقف نہیں، اس نے شعر جاہلی کے پورے ذخیرہ کو مشکوک بنا دیا ہے، اور ''ماسینون'' نے قرآن کے متعلق لوگوں کے عقائد متزلزل کر دئے ہیں، تعجب ہے کہ قاہرہ کے عرب ان کے افکار و خیالات سے متاثر نظر آتے ہیں۔

''زدلیر'' اور ''لامانس'' نے اگرچہ رسول اللہ کی بڑی تعریف کی ہے لیکن پڑھنے والوں کو ایسا تاثر دیا ہے کہ آپ محض ایک اعلیٰ درجہ کے لیڈر تھے اور بحیثیت نبی کے آپ کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اسی طرح قرآن کی تمام خوبیوں کے باوجود یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ یہ کلام الٰہی ہے اور اللہ کی طرف سے بذریعۂ وحی آپ پر اترا ہے، بہرحال ان مستشرقین کی کتابوں میں رسول اللہ کی تعریف کا بڑا حصہ محض آپ کی قیادت، عبقریت اور معاشرتی اصلاح تک محدود ہوتا ہے، اسے وہ متعدد فصلوں میں بیان کرتے ہیں، لیکن دوسرے پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔

''ڈرمنگھم'' نے اپنی کتاب ''حیات محمدؐ'' میں خاص طور سے یہی طریقہ اختیار کیا ہے، البتہ ''کارلائل'' نے اپنی کتاب ناموران عالم میں اس سے کچھ مختلف انداز اختیار کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ دور وسطی میں ایسی دینی عبقریت کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

ان کے علاوہ مستشرقین جن باتوں پر اتفاق رکھتے ہیں ان میں ایک جہاد کا مسئلہ ہے، انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا، پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کو صرف دفاع و حمایت کے لئے وقتی طور سے جہاد کرنا پڑا، آپ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے لئے جہاد درست نہیں۔

اسی طرح حکومت، زکوٰۃ، شرعی احکام کے نفاذ سے متعلق مسائل میں ایسے خیالات ظاہر کئے ہیں جن سے مسلمان دین اور اپنے نبی کے متعلق بدظن ہو جائیں، نہ تو دین سے ان کا رشتہ قائم رہے اور نہ اسلامی تعلیمات سے۔

اہل علم مسلمانوں کو ان کی سوچی سمجھی اسکیم سے ہوشیار رہنا چاہئے، انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ عقیدہ و فکر میں جو گمراہی پھیلانے کی کوشش کی ہے اور مغربیت کے مسموم اثرات ڈالے ہیں ان سے بچنا چاہئے اس سلسلہ میں اسلامی موضوعات پر جو کچھ لکھا جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صحیح معیار اور اصول کے مطابق ہو، ان میں دو باتوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے، ایک عام تنقیدی

اصول، دوسرے خاص تنقیدی اصول، حدیث، تاریخ اور ادب سے متعلق جب گفتگو ہوگی تو اس میں نہ اپنی خواہش اور پسند کو دخل دیا جائے گا، اور نہ سابقہ افکار اور موروثی خیالات کو، اس پر جب تنقید کی جائے گی تو نقد حدیث کے جو اصول ہیں ان کو سامنے رکھنا پڑے گا، فن قرأت اور فقہ اللغہ کی واقفیت درکار ہوگی اور پھر ان سے استنباط کے بعد ہی بات قابل قبول ہوگی، علمائے اسلام نے احادیث کی تنقید کے جو اصول بنا دئے ہیں ان کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی، انھوں نے اپنے اسی اصول کے تحت صحیح اور غلط کو پرکھا ہے، فقہ، حدیث، تفسیر، تاریخ اور لغت کے سلسلے میں اسی اصول سے وہ کام لیتے رہے ہیں، یہ نہایت معروف اور متوازن طریقہ ہے اور ایک منصف مزاج شخص کو چاہئے کہ اظہار رائے میں وہ اسی طریقے کو اختیار کرے، انحراف، خلط مبحث اور تکذیب کا طریقہ نہ اختیار کرے، ہمارے محقق علماء نے ہمیشہ یہی طریقۂ اعتدال ملحوظ رکھا ہے، آپ احمد محمود شاکر کا مقدمہ ''مفتاح کنوز السنۃ'' پڑھیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے ''وینسنک'' کے کارنامے کو بہت سراہا ہے، لیکن کسی موضوع پر اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں کسی مستشرق کی تحریر پڑھیں گے، تو آپ دیکھیں گے کہ احمد محمود شاکر نے جگہ جگہ نوٹ لکھ کر اس کی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے، پس یہ دو جدا جدا انداز ہیں۔

اسی طرح جب آپ ڈاکٹر عبدالحلیم کی کتاب ''یورپ اور اسلام'' کا مطالعہ کریں گے تو اس میں بھی یہی انداز نظر آئے گا۔

''گولڈزیہر'' کی ''مذاہب التفسیر الاسلامی'' کا مقدمہ جس کا ترجمہ ڈاکٹر نجار نے کیا ہے، جہاں اس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ یہ اول درجے کا کارنامہ ہے، وہاں یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں پچاس غلطیاں ہیں اور اس کی نہایت اچھے انداز میں تردید بھی کر دی ہے۔

علمائے اسلام نے تنقید کا صحیح رخ اختیار کیا ہے اور بہت سی کتابوں میں ان کا انداز بہت متوازن ہے، ''السنۃ ومکانتہا فی الاسلام'' یعنی سنت اور اس کا درجہ اسلام میں، ''والرد علی الادب الجاہلی'' یعنی ادب جاہلی کی تردید، ''ومایقال عن الاسلام'' یعنی اسلام کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے، ''الاسلام حقائقہ واباطیل خصومہ'' یعنی اسلام مجموعہ حقائق ہے اور اس کا ضد مجموعہ اباطیل، ''الاسلام والحضارۃ الاسلامیہ'' یعنی اسلام اور اسلامی تہذیب، ''المستشرقون والدراسات الاسلامیہ'' یعنی مستشرقین اور ان کا اسلامی مطالعہ وغیرہ بیشمار مقالات میں جو عربی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں انھوں نے اسی اصول سے کام لیا ہے۔

سیرت نبویؐ کے متعلق مستشرقین کی بعض غلطیوں کی تصحیح

تلخیص و تبصرہ

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

''الاستاذ نذیر حمدان کی کتاب ''الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فی کتاب المستشرقین'' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مستشرقین کی کتابوں کے آئینہ میں) کے بعض حصوں کا ترجمہ اس سے پہلے کیا جا چکا ہے، اس حصہ میں مستشرقین کی بعض غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے واقعات کو مسخ کرنے اور انھیں توڑ مروڑ کر کیا سے کیا بنا دینے میں مستشرقین نے کس قدر تلبیس و تدلیس سے کام لیا ہے، ان سے ان کی فتنہ پردازی، بدنیتی اور تعصب کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے، قرآن مجید نے مستشرقین کے پیش رو اہل کتاب کے متعلق جو یہ کہا تھا کہ

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (آل عمران: ۷۱)	اے اہل کتاب! تم حق کو باطل میں کیوں گڈمڈ کرتے ہو اور حق کو کیوں چھپاتے ہو، درآنحالیکہ تم جانتے بھی ہو۔

دوسری جگہ ہے:

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ

(آل عمران:۷۸)

اوران اہل کتاب میں بعض ایسے ہیں کہ کتاب (تورات) کو زبان مروڑ مروڑ کر پڑھتے ہیں تا کہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھتے ہیں کتاب میں سے ہے، حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہوتا اور کہتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا اور خدا پر جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں۔

تو وہ ان مستشرقین پر بھی پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔ (مترجم)

شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی مستشرقین کی غلطیوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اسلام اور مسلمانوں کے واقف کار اور ماہر فرنگیوں کی تصنیفات عجیب وغریب اغلاط کا مجموعہ ہوتی ہیں، جنھیں دیکھنے اور پڑھنے کے بعد ان سے اوران کی تحقیقات دونوں سے نفرت اور بدگمانی ہوتی ہے۔'' (مجلۃ المجمع العلمی العربی دمشق ۲۱۔۳ ۱۹۴۶ء)

محمد کرد علی نے مستشرقین کی غلطیوں کی متعدد قسمیں بتائیں ہیں (۱) لفظی (۲) فکری یا حسی (۳) موضوع سے مصنف کی عدم واقفیت کے نتیجہ میں سرزد ہونے والی غلطیاں، اس قسم کی غلطیاں کرنے والوں کا دارومدار غیر معتبر کتابوں پر ہوتا ہے، چنانچہ یہ لوگ سفرناموں، افسانوں، ناولوں اور مزاحیہ نگار صحافیوں کی کتابوں پر اعتماد کرتے ہیں، حالانکہ ان کتابوں کے مصنفین اپنے قارئین کی دلچسپی کے لئے نادر اور انوکھی باتیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتے ہیں اور جب اس میں انھیں ناکامی ہوتی ہے تو وہ خود اپنے ذہن وتخیل سے اس طرح کی باتوں کا اختراع کرتے ہیں اور انھیں حقائق بنا کر پیش کرتے ہیں، بعض غلطیاں جان بوجھ کر قصد وارادہ سے کی جاتی ہیں، ان میں دینی عصبیت یا سیاسی غرض کارفرما ہوتی ہے، اور بعض دفعہ بیک وقت ان دونوں ہی باتوں کو دخل ہوتا ہے۔ (مجلۃ المجمع العربی دمشق ۲۱۔۳ ۱۹۴۶ء)

ان تہہ بہ تہہ اور زبردست غلطیوں کے اسباب وعوامل یہ ہیں، علوم ومعارف اسلامیہ کی وسعت، مستشرقین کا مبہم انداز بیان وجہالت، نیز اسلام وپیغمبر اسلامؐ کے خلاف ان کی سازش وریشہ دوانی۔

یہ کہنا کہ ہر بحث و تحقیق کرنے والے کی نگاہ سے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں اور اس سے سہواً کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں اور کبھی کبھی تو تحقیق کے مقدمہ و بنیاد ہی کے اندر ایسی خرابی اور غلطی راہ پا جاتی ہے جس کے نتیجہ میں صحیح کے ساتھ غلط اور رطب کے ساتھ یابس شامل ہو جاتا ہے، پس اگر غلطیوں کے بارے میں اس سے دوبارہ گفتگو کی جائے اور ان کی نشاندہی کر دی جائے تو بحث و مباحثہ میں شدید اختلاف اور جھگڑے کی نوبت نہ آئے بلکہ وہ حق کی طرف رجوع کر لے گا کیونکہ رجوع الی الحق ایک علمی فضیلت و برتری ہے جو علماء و ثقات کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے، مگر مستشرقین عموماً دیدہ و دانستہ ایسی قبیح غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں جن کی غرض و غایت اگر تعلیم یافتہ مسلمانوں پر واضح ہو جاتی ہے، اور وہ ان سے انھیں متنبہ کر دیتے ہیں تو وہ کبھی تو معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہیں اور کبھی ان غلطیوں پر اصرار کرتے ہیں، لیکن اگر یہ لوگ خود مستشرقین کی غلطیوں سے واقف نہ ہو سکے تو ان کی غلطیاں تسلیم شدہ علمی حقائق و مسلمات بن جاتی ہیں جنھیں علمی و ادبی بحث و گفتگو میں بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔

عرب محققین میں رافعی، عقاد، کرد علی، جندی اور قطب وغیرہ نے مستشرقین کی بعض غلطیوں کو نمایاں کیا ہے اور خود بعض مستشرقین نے بھی اپنے ساتھیوں کی تاریخی، ادبی، لغوی، دینی اور علمی و فنی غلطیوں کی حقیقت ظاہر کر دی ہے۔

بالقصد و بالارادہ کی جانے والی اکثر غلطیاں شکوک و شبہات اور طعن و تشنیع کی حیثیت رکھتی ہیں، جن میں خرافات کے علاوہ فتنہ و فساد انگیزی کا بھی دخل ہوتا ہے۔

ذیل میں مستشرقین کی غلطیوں کی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں، پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کی زندگی کے چند واقعات پیش کئے جاتے ہیں اور آخر میں بعثت کے بعد کے واقعات زندگی کے بارہ میں ان کی بعض غلط بیانیوں کا ذکر کر کے ان کی تصحیح کی جائے گی۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کھیل کے بارہ میں غلط بیانی

ارنج لکھتا ہے "اس اثنا میں کہ محمدؐ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ کھیتوں میں کھیل رہے تھے...... (سیرت پر مصنف کی کتاب ص ۳۴) اس کے بعد اس نے شق صدر (سینہ مبارک چاک کئے جانے کا واقعہ) نقل کیا ہے، حالانکہ وہاں نہ کھیت تھے، اور نہ جھاڑیاں جیسا کہ سیر کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، سیرت ابن ہشام میں صرف اس قدر ہے کہ "حلیمہ کا بیان ہے کہ ہم انھیں (محمدؐ) کو لے کر جب اپنے گھر لوٹے تو چند ماہ بعد ایک روز وہ اپنے (رضاعی) بھائی کے ساتھ ہمارے گھروں کے پیچھے بھیڑ بکریوں کے

گلے میں تھے کہ دفعۃً ان کا بھائی دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا اور مجھ سے اور اپنے باپ سے کہنے لگا کہ ''ہمارے قریشی بھائی کو دو آدمیوں نے پکڑ کر...... (سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۷۳)

اسی مفہوم کی روایت البدایہ والنہایہ میں بھی ہے۔

''حلیمہ فرماتی ہیں کہ ہمارے یہاں آنے کے دو تین ماہ بعد وہ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بھیڑ کے ریوڑ میں ہمارے گھروں کے پیچھے تھے کہ ان کا بھائی دوڑتا ہوا آیا[1] ...... (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۷۴)

۲۔ نوجوانی میں بھی اللہ کی جانب سے آپ کی مراسم شرک وجاہلیت سے حفاظت

ڈرمنگھم کا بیان ہے کہ ''محمد کو دو بار خیال ہوا کہ شہر کے اطراف میں پہنچ شہوت اور نوجوانی کے لطف ولذت سے متمتع ہوں، مگر اچانک ایسی صورت پیش آگئی کہ وہ اس سے باز رہے۔''

(ڈرمنگھم کی کتاب ص ۶۹)

صحیح یہ ہے کہ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں امام بیہقی کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے جو حضرت علیؓ کی سند سے ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ اہل جاہلیت عورتوں کے قصد وارادہ سے جو کام کیا کرتے تھے، مجھے دو راتوں کے سوا کبھی اس قسم کا جاہلانہ خیال تک نہیں آیا مگر ان دونوں موقعوں پر بھی اللہ نے میری حفاظت کی، ایک رات میں مکہ کے بعض نوجوانوں کے ساتھ تھا، ہم لوگ بکریاں چرا رہے تھے، میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا تم میری بکریاں دیکھتے رہنا تاکہ میں مکہ جاکر قصہ گویوں کی مجلس میں حصہ لوں، چنانچہ جب میں مکہ میں داخل ہوا اور پہلے ہی گھر کے قریب پہنچا تو وہاں گانے بجانے کی آواز سنی، لوگوں سے دریافت کیا یہ کیا ہو رہا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ فلاں شخص کی فلاں عورت سے شادی ہوئی ہے، میں یہ منظر دیکھنے کے لئے بیٹھا مگر مجھے ایسی نیند آئی کی سورج نکلنے کے بعد ہی آنکھ کھلی، دوسری شب میں

(۱) یہ روایت ابن اسحاق کی ہے اور محققین کے نزدیک صحیح نہیں ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں ''اب رہ گئی وہ روایت جس میں حلیمہ سعدیہ کے ہاں قیام کے زمانہ میں شق صدر کا ذکر ہے، یہ روایت سات مختلف سلسلوں سے اور مختلف صحابیوں سے لوگوں نے نقل کی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان میں دو سلسلوں کے علاوہ بقیہ سلسلے صحت اور قوت سے تمام تر خالی ہیں اور ان میں بعض ایسی لغو باتیں شامل ہیں، جو اس کو درجۂ اعتبار سے گرادیتی ہیں۔'' (سیرۃ النبی ج ۳ ص ۴۹۰)

بھی اسی طرح کا واقعہ پیش آیا۔[۱] (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۸۷)

کامل ابن اثیر کے الفاظ اس سے مختلف ہیں، ملاحظہ ہوں:

"جاہلیت کے زمانہ میں لوگ جو کام کرتے تھے میں نے بجز دوبار کے کبھی ان کا قصد و ارادہ نہیں کیا، مگر دونوں بار اللہ تعالیٰ میرے اور اس کام کے درمیان حائل ہو گیا اور پھر میں نے اس طرح کے کام کا کبھی ارادہ نہیں کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی نبوت سے سرفراز فرمایا۔" (الکامل ج ۲ ص ۴۸)

طبری کے الفاظ بھی قریب قریب اسی طرح کے ہیں۔ (تاریخ طبری ص ۱۷۹)

۳۔ عبادت نبویؐ

ڈرمنگھم نے آپ کی عبادت کے متعلق بھی یہ غلط بیانی کی ہے کہ "آپؐ نے عزیٰ کے نام پر ایک سفید بکری کی قربانی کی تھی"[۲] مگر سیرت ابن ہشام میں عبادت نبویؐ کے سلسلے میں اس طرح کی نجس و ناپاک حرکت کی مطلق نفی کی گئی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ آپؐ جوان ہو گئے مگر جاہلیت کی خباثت اور ناپاکی سے کبھی آلودہ نہیں ہوئے، اللہ تعالیٰ کو آپ سے کرامت اور نبوت مقصود تھی اس لئے اس نے آپ کو جاہلیت کی آلائشوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔

(سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۹۴)

(۱) یہ روایت نہایت ضعیف ہے، علامہ ابن کثیر نے اسے نقل تو کیا ہے مگر اس کے متعلق صراحت کر دی ہے کہ یہ نہایت غریب ہے اور اس کے بعض سلسلے حضرت علیؓ ہی پر جا کر ختم ہو گئے ہیں، یعنی یہ روایت مسند کے بجائے موقوف ہے۔ صحیح واقعہ علامہ شبلیؒ کے بیان کے مطابق صرف اس قدر تھا کہ "عرب میں افسانہ گوئی کا عام رواج تھا، راتوں کو لوگ تمام اشغال سے فارغ ہو کر کسی مقام میں جمع ہوتے تھے، ایک شخص جس کو اس فن میں کمال ہوتا تھا، داستان شروع کرتا تھا، لوگ بڑے ذوق و شوق سے رات رات بھر سنتے تھے، بچپن میں ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس جلسہ میں شریک ہونا چاہا تھا، لیکن اتفاق سے راہ میں شادی کا کوئی جلسہ تھا، دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے، وہیں نیند آ گئی، اٹھے تو صبح ہو چکی تھی۔
ایک دفعہ اور ایسا ہی اتفاق ہوا۔ اس دن بھی یہی اتفاق پیش آیا۔ چالیس برس کی مدت میں صرف دو دفعہ اس قسم کا ارادہ کیا لیکن دونوں دفعہ توفیق الٰہی نے بچا لیا کہ "تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے۔" (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۱۸۵)
نساء کا لفظ صرف اسی روایت میں ہے حالانکہ روایت میں بیان کئے گئے مضمون سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی، مولانا شبلی نے سیرت کے حاشیہ میں سر ولیم میور کی لائف آف محمد صلعم سے یہ بھی لکھا ہے۔
"ہماری تمام تصنیفات محمد صلعم کے بارہ میں ان کے چال چلن کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی پر جو اہل مکہ میں کمیاب تھی متفق ہیں۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۱۸۶) (۲) ڈرمنگھم ص ۷۵

ابن کثیر امام بیہقی کے حوالہ سے حضرت زیدؓ بن حارثہ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ اساف و نائلہ کے نام سے تانبے کا ایک بت تھا، جسے طواف کرتے وقت مشرکین چھوا کرتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میں بھی طواف کر رہا تھا، چنانچہ جب اس بت کے پاس سے گذرا تو اسے چھو دیا، آپ نے منع کیا مگر میں نے اپنے جی میں کہا میں اسے ضرور چھوؤں گا، تا کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا تو آپ نے فرمایا کیا تم باز نہیں آئے۔" (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۸۸)

غور کرو جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جاہلیت کے میلے ٹھیلے میں بھی نہیں جاتے تھے اور نہ بتوں کو چھوتے تھے بلکہ انھیں چھونے سے منع کرتے تھے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ بت کے لئے سفید بکری کی قربانی کرتے۔ (۱)

۴۔ دکان، تجارت اور سفر کی کثرت

ڈرمنگھم کا بیان ہے کہ "ایک زمانہ میں مکہ کے اندر محمدؐ کی ایک دکان تھی۔" یہ قطعاً غلط ہے، سیرت کے ماخذ سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی، مزید براں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "محمدؐ جزیرہ عرب کے طول و عرض میں حضرت خدیجہؓ کے تجارتی قافلوں کی سربراہی کرتے تھے۔" (ڈرمنگھم ص ۶۱)

ارفنج کا بیان ہے "حضرت خدیجہؓ سے شادی کے چند برس بعد سے آنحضرت مستقل تجارت کرنے لگے تھے اور قافلوں کے ساتھ دور دراز کا سفر بھی کرتے تھے۔" (۲) (ص ۵۳)

(۱) علامہ شبلی نے بھی اس روایت کو ذکر کر کے اس کی تردید کی ہے، مگر انھوں نے سفید رنگ کے بجائے خاکی رنگ کی بھیڑ کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں "مارگولوس صاحب نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی تھی، لیکن صاحب موصوف نے اس کی سند میں کوئی عربی ماخذ پیش نہیں کیا۔ بلکہ ولہوسن کا حوالہ دیا ہے۔ (دیکھو مارگولوس کی کتاب ص ۶۸ تا ۷۰) معجم البلدان (ایک جغرافیہ کی کتاب) میں ایک روایت اس مضمون کی موجود ہے، لیکن اولاً تو اس موضوع خاص میں یہ کتاب خود بے سند ہے، ثانیاً یہ روایت کلبی سے ہے جو مشہور دروغ گو ہے۔" (حاشیہ سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۱۸۰) (۲) آگے رسول اللہ صلعم کے سفر اور مقامات سفر کے سلسلہ میں مصنف کے خیالات محتاج وضاحت ہیں اس لئے اس کے بارہ میں علامہ شبلی کی سیرۃ النبیؐ جلد اول سے جستہ جستہ بعض اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔

"تجارت کی غرض سے شام و بصریٰ اور یمن کے متعدد سفر آپ نے کئے تھے (ص ۱۷۴) آنحضرت صلعم نے بھی اس تقریب سے متعدد سفر کئے، شام اور بصریٰ کے سفر کا حال پہلے گذر چکا ہے، اس کے علاوہ اور مقامات تجارت میں بھی آپ کا تشریف لے جانا ثابت ہے..... حضرت خدیجہؓ نے جہاں جہاں آپ کو تجارت کی غرض سے بھیجا تھا، ان میں جرش بھی ہے جو یمن میں ہے، حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے اور (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

بوڈلے کا کہنا ہے کہ ’’محمدؐ سولہ برس کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ انھوں نے اتنے سفر کر ڈالے جتنے سفر مکہ کا کوئی باشندہ عمر بھر نہیں کرتا، مکہ سے یمن، شام، فلسطین اور فارس کا سفر آپ کا معمول اور عادی امر بن گیا تھا، آپؐ کے زمانہ میں لوگ اس کثرت سے سفر صرف زیارت کعبہ کے لئے کرتے تھے۔‘‘

صحیح یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے بعثت سے قبل بکریاں بھی چرائی تھیں اور تجارت بھی کی تھی لیکن آپؐ کی تجارت کی وہ شکل جو ان لوگوں نے بیان کی ہے، غیر معروف ہے، آپ یمن اور فارس تشریف نہیں لے گئے تھے، البتہ دمشق کے مضافات میں گئے تھے مگر دمشق میں داخل نہیں ہوئے، رہے رسول اللہؐ کے سفر تو ان کی تعداد چند ہی ہے، غالباً رسول اللہؐ کے مکہ سے سفر کے لئے نکلنے کی کثرت و زیادتی سے مستشرقین کا دو مقصد ہے، ایک تو یہ کہ آپ گذشتہ اور موجودہ مذاہب سے واقف تھے، اور ان مذہبوں کے ماننے والوں سے آپ کے تعلقات تھے[1]، دوسرا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تجارت سے آپؐ کی فطری دلچسپی اور اس میں تجربہ، مہارت اور ہوشیاری کی بنا پر آپ اس لائق ہوئے کہ لوگوں کی سیاسی رہنمائی اور قیادت کر سکیں۔

(صفحہ ۴۵ کا بقیہ) علامہ ذہبی نے بھی تصدیق کی ہے کہ جرش میں آپ دو دفعہ تشریف لے گئے...... ہجرت کے بعد جس سال آپؐ کی خدمت میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفود آئے ان میں جب بحرین سے عبدالقیس کا وفد آیا تو آپؐ نے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لے کر وہاں کا حال پوچھا لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ آپ ہمارے ملک کا حال ہم سے زیادہ جانتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ’’میں نے تمہارے ملک کی خوب سیر کی ہے۔‘‘ (مسند ابن حنبل ج ۴ص ۲۰۶) مورخین یورپ نے جو علوم غیبی کے منکر ہیں اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپؐ کے تمام معارف و معلومات سیر و سفر سے ماخوذ ہیں، قیاسات کے ذریعہ سے اس دائرہ کو اور وسعت دی ہے، ایک مورخ نے لکھا ہے کہ ’’آپ نے بحری سفر بھی کیا تھا جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہازوں کی رفتار اور طوفان کی کیفیت کی ایسی صحیح تصویر ہے جس سے (نعوذ باللہ) ذاتی تجربہ کی بو آتی ہے (مارگولوس ص ۵۷) مورخ مذکور کا یہ بھی دعوی ہے کہ آپ مصر بھی تشریف لے گئے تھے اور ڈیڈسی (بحرمیت) کا بھی معائنہ کیا تھا لیکن تاریخی دفتر ان واقعات سے خالی ہیں۔‘‘ (سیرت ج ۱ص ۱۷۷) حاشیہ میں مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں ’’یورپین مورخین جن کی بنیاد صرف قیاس و رائے پر ہوتی ہے اگر اس قسم کے واقعات بیان کریں تو کوئی تعجب نہیں ہے، لیکن آنحضرت کا مصر جانا در حقیقت یورپ کے عہد مظلم کی مضحکہ انگیز روایت ہے، بحری سفر آپؐ نے یقیناً نہیں کیا لیکن اگر بحرین تشریف لے جانے کی روایت صحیح ہے تو خلیج فارس آپ نے دیکھا ہوگا، بحرمیت کا مشاہدہ بھی ممکن ہے کیونکہ اس کا موقع عرب و شام کے درمیان ہے جہاں سے آپؐ کئی بار تجارت کے لئے گذرے ہوں گے۔‘‘ (سیرت النبی ج ۱ص ۱۷۷) (۱) اس کے متعلق علامہ شبلی کا یہ بیان گذشتہ حاشیہ میں گذر چکا ہے ’’مورخین یورپ نے جو علوم غیبی کے منکر ہیں اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپؐ کے تمام معارف و معلومات سیر و سفر سے ماخوذ ہیں‘‘ (سیرت ج ۱ص ۱۷۷) آگے بحیرا راہب کے مشہور واقعہ کے ضمن میں مزید تفصیل پیش کی جائے گی۔ (مترجم)

۵۔ دوسروں سے تحصیل علم

بوڈلے بیان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیرا کی صحبت میں رہ کر عرصہ تک اس سے استفادہ کرتے رہے، یہ راہب جب اس کم سن عربی سے گفتگو کرتا تو معلوم ہوتا کہ وہ اپنے کسی رفیق سے گفتگو کر رہا ہے، چنانچہ اسی نے انھیں حضرت عیسیٰ کے عقیدہ اور بتوں کی پرستش کے حماقت ہونے سے مطلع کیا تھا، اور محمدؐ اس کی باتوں کو نہایت غور وتوجہ سے سنتے تھے۔ (۱)

دوسری جگہ وہ لکھتا ہے کہ "گو محمدؐ کی مکتبی تعلیم کم ہوئی مگر انھوں نے حصول درس کے لئے جانے والے اور دن دن بھر حجرۂ درس میں بیٹھے رہنے والے طالب علموں سے بھی زیادہ حصول علم کیا تھا۔" (ص ۴۸)

(۱) بحیرا کے مشہور واقعہ کا دارومدار جس روایت پر ہے، وہ سنداً ضعیف اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہے، مولانا شبلیؒ نے اس پر مفصل نقد وجرح کی ہے، ملاحظہ ہو (سیرۃ النبیؐ ج اص ۱۶۷ تا ۱۶۹) وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں "تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے، سرولیم میور، ڈریپر، مرگولیس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہؐ نے مذہب کے حقائق واسرار اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتادئے تھے، انہی پر آنحضرتؐ نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔ عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہئے جس طرح روایت مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں، قیاس میں نہیں آسکتا کہ دس برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھادئے جائیں اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی ...... لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے۔ (سیرۃ النبیؐ ج اص ۱۶۷)

مولانا حاشیہ میں لکھتے ہیں "ڈریپر صاحب معرکہ علم ومذہب میں لکھتے ہیں، بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمدؐ کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی، آپ کے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا ...... بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا۔" سرولیم میور صاحب نے بھی نہایت آب ورنگ سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلعم کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا وہ سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجارب اور مشاہدات کے نتائج تھے، لیکن ظاہر ہے کہ اگر شارع اسلام بالفرض ان عیسائی اساتذہ کا تعلیم یافتہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ توحید خالص کا وہ ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اس کے سینہ میں پیدا ہوسکتا جو قرآن کے ہر صفحہ میں نظر آتا ہے۔ (سیرۃ النبیؐ ج اص ۱۶۷)

وہ اور دوسرے مصنفین یہ بھی کہتے ہیں کہ عکاظ کے میلہ اور قس بن ساعدہ کے خطبوں (۱) کے ذریعہ سے محمدؐ نے نصاریٰ اور ان کے فرقہ نسطوری کے اثرات بھی قبول کئے تھے۔ (ص ۴۸)

صحیح یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کا کتاب مقدس دیکھنا یا اسے پڑھنا سرے سے ثابت ہی نہیں ہے، گو یہ تسلیم ہے کہ اس کے اور بعض قرآنی قصوں میں مماثلت ہے، اور رسول اللہؐ نے جب بحیرا سے ملاقات کی تھی تو اس وقت آپ کی عمر نو برس تھی اور یہ بالکل خلاف عقل و قیاس ہے کہ صرف

(۱) قس بن ساعدہ کا ایک خطبہ بہت مشہور ہے مگر وہ بھی سرتاپا مصنوعی اور موضوع ہے، مولانا شبلیؒ نے اس کے رواۃ پر مفصل جرح کی ہے اس سے قطع نظر نفس خطبہ کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس موقع پر اسے ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا، فرماتے ہیں ''ادب ومحاضرات کی کتابوں میں عموماً اور بعض تاریخوں میں بھی مذکور ہے کہ قس بن ساعدہ نے عکاظ میں جو مشہور خطبہ دیا تھا، آنحضرت صلعم خطبہ میں شریک تھے، اس خطبہ کا بڑا حصہ اکثر اہل ادب نے نقل کیا ہے، اور چونکہ اس کے فقرے بظاہر قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اور مقفی ہیں اس لئے عیسائی مورخین نے دعوی کیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے یہ طرز انہی سے لیا ہے...... ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے، بنوامیہ اور عباسیہ کے زمانہ میں یہ مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ اپنے زمانہ کے شعرا اور فصحا سے خطبے تصنیف کراتے تھے اور جاہلیت یا ابتدائے اسلام کے شعرا اور خطبا کے نام سے مشہور کرتے تھے، محمد بن اسحاق اس رتبہ کے شخص ہیں کہ امام بخاریؒ نے جزء القراۃ میں ان سے روایت کی ہے، تاہم ان کا یہ عام طریقہ تھا، علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں خطیب بغدادی سے روایت کی ہے کہ محمد بن اسحاق شعرائے وقت کو مغازی کے واقعات دے دیتے تھے کہ ان کے بارہ میں اشعار کہدو، ان اشعار کو وہ اپنی کتاب میں شامل کر دیتے تھے، ابن ہشام میں حضرت خدیجہؓ، ابوبکرؓ، امیہ بن ابی الصلت، ابوطالب کے سینکڑوں اشعار نقل کئے ہیں جن کی زبان اور انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی زبان نہیں ہے، ایک لطیف بات یہ ہے کہ ابن ہشام ان اشعار کو نقل کر کے اکثر موقعوں پر لکھ دیتے ہیں کہ فن شعر کے ماہران اشعار کی نسبت انکار کرتے ہیں...... یہ وضائع مختلف اغراض سے کی جاتی تھی، زیادہ اس وجہ سے کہ ان خطبوں یا شعروں میں آنحضرت صلعم کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی یا اور کوئی بات اسلام کی تصدیق کی شامل کر دیتے تھے، مثلاً قس بن ساعدہ کا خطبہ...... اکثر لوگ یہ کرتے تھے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کے متعلق جو باتیں ہیں ان کے مطابق اشعار تصنیف کراتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے اسلام کی تائید ہوگی، امیہ ابن ابی الصلت کے نام سے جو اشعار منقول ہیں ان کو دیکھ کر صاف یقین ہو جاتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید کو سامنے رکھ کر یہ اشعار کہے ہیں...... ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر مار گولوس نے بھی ایک موقع پر اس کی تصدیق کی ہے چنانچہ کہتے ہیں ''قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موزوں کیا گیا ہے۔'' ان لوگوں نے اپنی دانست میں اسلام کی خیرخواہی کی غرض سے یہ کام کیا تھا، آج یورپ والے اسی سے یہ کام لیتے ہیں کہ آنحضرتؐ پیغمبر نہ تھے بلکہ جاہلیت کے خطبا اور شعراء سے معتقدات اور خیالات بلکہ طرز ادا تک اخذ کرتے تھے، لیکن ادب کا نکتہ شناس یا فن روایت کا ماہر بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ تمام اشعار اور خطبے مصنوعی ہیں، یورپ کو فن ادب اور روایت میں مہارت کے لئے ابھی ایک زمانہ درکار ہے، اور جب وہ زمانہ آئے گا، تو یورپ کو اپنی بدمذاقی پر خود شرم آئے گی۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۱۸۳)

ایک ملاقات نے آپؐ کے تمام اثرات محو اور زائل کردیئے ہوں، علاوہ ازیں اسلام کا عقیدۂ توحید جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی اور انبیاءؑ کے جو خصوصیات اور جنت و دوزخ کے جو اوصاف بیان کئے اور شرائع و اخلاق کے سلسلہ میں جو باتیں ارشاد فرمائیں وہ سب نجران کے نصاریٰ اور نسطوریوں کے عقائد کے سراسر خلاف ہیں۔

یہ بات بھی نہایت عجیب وغریب ہے جس سے کتب سیرت کا تمام ذخیرہ خالی ہے کہ اس زمانہ میں مکہ کے اندر مدرسے تھے، اور محمدؐ ان کے ایک فائق و برتر طالب علم تھے۔

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کے واقعات کے سلسلہ میں مستشرقین کی غلطیوں کی نشاندہی کرکے ان کی تصحیح کی جائے گی۔

۶۔ وحی کی ابتدا ونیسک لکھتا ہے ”حضرت جبریلؑ کے پہلی بار ظہور اور نبی پر غشی طاری ہونے کے بعد حضرت خدیجہؓ بہت خوف زدہ ہوئیں اور ایک گوشہ نشیں راہب کے پاس آئیں، جس کا نام سرجیوس تھا، اس نے اطمینان دلایا اور بتایا کہ یہ جبریلؑ تھے، جو فرشتہ ہیں اور تمام انبیاءؑ کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔“

حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی اور بیہوشی طاری نہیں ہوئی تھی بلکہ کپکپی طاری ہوئی تھی جو عموماً خوفزدہ لوگوں پر طاری ہو جاتی ہے، رہیں حضرت خدیجہؓ تو وہ اس واقعہ سے خوف زدہ نہیں ہوئی تھیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسکین دے رہی تھیں کہ ”بخدا اللہ آپ کو کبھی ذلیل و رسوا نہ کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں اور راہ حق کی صعوبتوں اور شدتوں میں مدد کرتے ہیں۔“

احمد محمد شاکر فرماتے ہیں کہ ”یہ سمجھنا کہ حضرت خدیجہؓ کا واقعہ سرجیوس کے ساتھ پیش آیا تھا بالکل غلط اور صحیح و ثابت حدیثوں کے خلاف ہے، پھر وہ صحیح بخاری سے نزول وحی کی ابتدا سے متعلق حدیث نقل کرکے لکھتے ہیں کہ اس سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ اپنے جن چچازاد بھائی (ورقہ بن نوفل) کے پاس آپؐ کو لے کر گئی تھیں وہ عربی النسل تھے، کوئی عجمی النسل شخص سرجیوس نہ تھے۔ (دائرۃ المعارف۔ ج۹ص ۴۷۵)

۷۔ دعوت نبویؐ کا آغاز ارفنج کہتا ہے ”محمدؐ نے اپنے ارادہ سے بنی ہاشم اور قریش کے لوگوں کو مطلع کیا...... انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز کھلم کھلا اور جہراً کیا تھا۔“ (ص ۶۲) مگر

ابن اثیر کامل میں لکھتے ہیں "آپ نے اپنے رازِ سربستہ کا تذکرہ اپنے متعلقین میں ان لوگوں سے کیا جن کے بارہ میں مکمل اطمینان تھا، چنانچہ تمام لوگوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ بنت خویلد آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی تصدیق کی۔" (ج ۲ ص ۵۰)

طبری کا بیان ہے "اللہ نے نبوت سے سرفراز فرما کر آپ پر اور اپنے بندوں پر جو انعام کیا تھا، آپؐ اسے پوشیدہ طور پر اپنے انہی متعلقین سے ذکر کرتے جن کے بارہ میں اطمینان تھا، عمرو بن عنبسہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ عکاظ میں تھے، عرض کیا اے، اللہ کے رسول! کن لوگوں نے آپؐ کی دعوت قبول کی ہے؟ فرمایا دو آدمیوں نے جن میں ایک آزاد دوسرا غلام ہے، یعنی ابوبکرؓ اور بلالؓ نے، اس کے بعد میں نے بھی اسلام قبول کرلیا، طبری یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے آپؐ پر ایمان لانے والے اور آپؐ کی اتباع کرنے والے شخص آپؐ کے غلام زیدؓ بن حارثہ تھے، اور دوسری رایت یہ ہے کہ اسلام لانے میں سبقت حضرت علیؓ نے کی تھی۔ (طبری ج ۱ صفحات ۳۰۶، ۳۱۴ و ۳۱۶)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ نے اپنی دعوت کا آغاز پوشیدگی سے کیا تھا، اور ابتداءً اپنے متعلقین اور ان دوستوں سے اس کا تذکرہ کیا تھا جو قابل اطمینان اور لائق اعتماد تھے، دعوت کا اعلان تو آپؐ نے تین برس بعد کیا تھا۔ طبری کا بیان ہے کہ اللہ نے نبی کو بعثت کے تین برس بعد حکم دیا کہ جو کچھ انھیں عطا کیا گیا ہے اسے کھلم کھلا اور علی الاعلان لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔"(۱)

(۱) تاریخ طبری ج ۲ ص ۳۱۸ و سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۸۰ دراصل یہ تاریخ اسلام کا بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اسلام کیونکر پھیلا، مخالفین نے اس کا ذریعہ تلوار بتایا ہے، اس غلط بیانی سے مستشرقین کا یہی مقصد ہے، مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں "آنحضرت صلعم نے جب فرض نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیش نظر تھیں اگر آپ کا فرض صرف اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السّلام کی طرح صرف تبلیغ و دعوت پر اکتفا فرمائیں یا حضرت کلیمؑ کی طرح اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں تو مشکل نہ تھی، لیکن خاتم انبیاءؐ کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغ اسلام سے منور کر دینا تھا، اس لئے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا، سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پر خطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے، اس غرض کے لئے صرف وہ لوگ انتخاب کئے جاسکتے تھے جو فیضیاب صحبت رہ چکے تھے، جن کو آپ کے اخلاق و عادات کی ایک ایک حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بنا پر آپؐ کے صدق دعوی کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے...... لیکن جو کچھ ہوا پوشیدہ طور پر ہوا نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمان خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے...... تین برس تک آنحضرتؐ نے نہایت رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ ادا کیا، لیکن اب آفتاب رسالت بلند ہو چکا تھا صاف حکم آیا فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (حجر) اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے واشگاف کہہ دے (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۱۹۰ و ۱۹۱ و ۱۹۴ و ۱۹۵)

۸۔ حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات کا غم انفخ لکھتے ہیں:

"محمدؐ نے اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ اور اپنے چچا ابوطالب کی وفات کے غم میں ماتمی لباس پہن لیا تھا، اور جس سال دونوں کی وفات ہوئی تھی اسے عام الحزن (غم کا سال) کہتے تھے۔" (ص ۹۶)

اس قدر صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سال کو عام الحزن (غم کا سال) فرمایا کرتے تھے، سیر کی کتابوں میں اس کی صراحت موجود ہے، لیکن ماتمی لباس پہننے کی بات درست نہیں ہے، علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں:

"ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات ہجرت سے تین برس پہلے ہوئی تھی، ان دونوں کی وفات سے رسول اللہ کو بڑا صدمہ لاحق ہوا، آپ فرماتے تھے کہ قریش کی جانب سے مجھے ناگوار اور تکلیف دہ حد تک مصیبتیں ابوطالب کی وفات کے بعد ہی پہنچیں۔"(۱)

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ابن اسحاق کے حوالہ سے بیان کیا ہے:

"خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات ایک ہی سال ہوئی۔"

امام بیہقی فرماتے ہیں: "ابوطالب کی وفات کے تین روز بعد حضرت خدیجہؓ کا بھی انتقال ہوگیا(۲)۔"

ابن جوزی نے سنداً ثعلبہ بن صغیر اور حکیم بن حزام سے روایت کی ہے کہ پانچ دنوں کے فرق سے ابوطالب اور خدیجہؓ کی وفات ہوئی، اس طرح رسول اللہؐ دو مصیبتوں سے بیک وقت دوچار ہوئے، غم اس قدر شدید تھا کہ گھر میں پڑے رہتے تھے اور باہر کم نکلتے تھے، اس کے بعد قریش کی ایذا رسانیاں بہت بڑھ گئیں۔"(۳)

۹۔ رسول اکرمؐ کا منبر ڈرمنگھم نے منبر نبویؐ کے متعلق اس طرح خامہ فرسائی کی ہے:

"آپؐ وعظ کے وقت اپنے اسی منبر کے جو بیک وقت آپؐ کی کرسی، منبر اور تخت سب ہی تھا، ایک زینہ پر کھڑے ہوتے اور آپؐ کے ہاتھ میں ایک چھوٹا نیزہ یا سونے اور ہاتھی کے دانت سے جڑا ہوا عصا ہوتا،

(۱) الکامل ج ۲ ص ۹۰ و ۹۱ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۱۲۷ (۳) ایضاً ص ۱۳۴

جس سے نشانات اور لکیریں بناتے، منبر کے نیچے حضرت بلالؓ ایک سونتی ہوئی تلوار لئے کھڑے رہتے، اس کا قبضہ چاندی کا تھا، محمدؐ نے یہ طریقہ آخر عمر میں عربوں کو متاثر کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔"

حالانکہ کرسی اور تخت کبھی آپؐ کے استعمال میں نہیں رہے، آپؐ تو صحابہ کرام کے درمیان اس طرح مساویانہ بیٹھتے تھے کہ نووارد کو پتہ نہیں چلتا کہ آپؐ کون ہیں، اسی طرح سونا جڑا ہوا عصا، اور چاندی کے قبضہ کی تلوار بھی آپؐ نے کبھی استعمال نہیں فرمائی، کیونکہ سونے اور چاندی کا استعمال اسلام میں حرام ہے، فاضل مستشرق نے منبر کی نسبت جو کچھ کہا ہے، اس کا کوئی ذکر کتب صحاح (حدیث کی صحیح اور معتبر کتابوں) میں نہیں ملتا۔

۱۰۔ رسول اللہ کا پائجامہ پہننا دائرۃ المعارف الاسلامیہ (۱) میں لفظ سروال کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے:

"رسول اللہؐ پائجامہ پہنتے تھے، متعدد حدیثوں سے اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ آپؐ پائجامہ پہنتے ہیں، فرمایا ہاں سفر وحضر دونوں میں مجھے ستر کا حکم دیا گیا ہے، اور پائجامہ سے بڑھ کر ستر پوش کوئی لباس نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث بالکل ضعیف ہے، بلکہ سرتاپا بے اصل اور موضوع ہے، اس کے ایک راوی یوسف بن زیاد بصری منکر الحدیث ہیں جو خرافات واباطیل بیان کرنے میں شہرت رکھتے تھے، اس روایت کے علاوہ دائرۃ المعارف میں اور بھی جتنی حدیثیں نقل کی گئی ہیں وہ سب کی سب مصنوعی، موضوع اور سراسر بے اصل ہیں۔

۱۱۔ تکبیر واقامت جونبل کہتے ہیں:

"اقامت اذان ہی سے بنی ہے، اور اذان نصاریٰ کے طریقۂ عبادت کی نقل ہے۔"

انھوں نے اپنی تائید کے لئے خطط مقریزی (ج ۲ ص ۲۷۱) کا حوالہ بھی دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اذان اور اقامت دو چیزیں ہیں، دونوں کے الفاظ اور کلمات کی تعداد میں بھی فرق واختلاف ہے، اور اذان میں قطعاً کلیسا کے طرز عبادت کی کوئی نقل نہیں کی گئی ہے، کتب صحاح میں اذان کے بارہ میں جس حدیث کی تخریج کی گئی ہے، اس کے الفاظ محدود اور

(۱) یہ مستشرقین کی انسائکلوپیڈیا آف اسلام کا عربی ترجمہ ہے۔

ترکیبیں معروف ہیں، محمد عرفہ نے اس مسئلہ پر طویل بحث کی ہے، آخر میں انھوں نے مقریزی کے حوالہ کی حقیقت یہ بتائی ہے۔

''خطط مقریزی کی جانب مراجعت کرنے پر معلوم ہوا کہ مقریزی کا اشارہ اس تسبیح کی طرف ہے، جو رات کو مناروں سے کہی جاتی ہے، اس بدعت کی ابتدا دور آخر میں مصر کے اندر ہوئی تھی، سلف میں اس کا کوئی رواج نہ تھا...... اس سے مستشرقین کو وہم ہوا کہ مقریزی نے اذان کی ابتدا کے مسئلہ پر بحث و گفتگو کی ہے، حالانکہ ان کی بحث کا تعلق اس تسبیح کی ابتدا سے ہے، جو مناروں سے رات میں کہی جاتی تھی۔ (دائرۃ المعارف الاسلامیہ مع حاشیہ ج ا ص ۴۵۶)

۱۲۔ عقیدہ ماکڈونالڈ نے اللہ کے بارہ میں کریمر اور ہوتسمان کے حوالہ سے جو کچھ نقل کیا ہے، اس میں متعدد فحش اور قبیح غلطیاں ہیں۔

(الف) محمدؐ نے اللہ کو جن صفتوں سے متصف کیا ہے، وہ عام لوگوں کے لئے معیوب و مذموم خیال کی جاتی ہیں۔ جیسے جبار و متکبر

اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل ان صفتوں کے جو معنی ہیں وہ اللہ کی عظمت و جلال کے بالکل شایان شان ہیں چنانچہ جبار وہ ذات ہے جو اپنی مخلوق کو اپنے ارادہ پر آمادہ اور مجبور کرتی ہے۔ اور متکبر وہ ہستی ہے جو اپنے بندوں کے ظلم سے بلند و برتر ہے۔[1]

(ب) ان لوگوں کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے لئے متضاد و متناقض

---

(۱) مصنف نے ان صفتوں کا جو مفہوم بیان کیا ہے، مفسرین نے اسے بھی لکھا ہے مگر درحقیقت جبار کے اصلی معنی تگڑے اور زور آور کے ہیں، قرآن مجید میں اس زور آور قوم کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے جس سے ڈر کر بنی اسرائیل نے عمالقہ کی بستی میں جانے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا (اِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ) یعنی اس بستی میں بڑے زور آور اور تگڑے لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ نہایت تگڑا اور زور آور ہے، اس سے زیادہ تگڑے اور زور آور کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اس سے ان مشرکین کی تردید مقصود ہے جو ہر زبردست اور زور آور کے سامنے اپنے کو جھکا لیتے، ان کی پرستش کرنے لگتے، اور اسے دیوی دیوتا سمجھنے لگتے ہیں اور متکبر کے معنی ہیں اپنی عظمت، برتری اور بڑائی کا احساس رکھنے والا، یہ احساس اللہ کے سوا کسی کے اندر ہو تو یقیناً باطل ہے، اس لئے کہ کسی کی بڑائی اس کی ذاتی شئی نہیں ہے، بلکہ وہ اللہ کی عطا کی ہوئی ہے، اللہ کے لئے یہ عظمت اور تکبر اس لئے مناسب ہے کہ اس کی بڑائی ذاتی، ازلی اور ابدی ہے، اللہ تعالیٰ اپنی اسی کبریائی کی وجہ سے اپنی عبادت اور خدائی میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ (مترجم)

صفتیں بیان کی ہیں۔

ان لوگوں نے اس تناقض وتضاد کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے، غالباً ان کی مراد یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کی صفت عفو و غفور ہے، اور دوسری طرف منتقم اور شدید العقاب بھی ہے، مگر دراصل یہ کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ یہ صفتیں اپنے متعلق کے اختلاف کے اعتبار سے مختلف ہوگئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لئے غفور و عفو ہے جن سے عفو ومغفرت کی اس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے، اور منتقم اور شدید العقاب ان لوگوں کے لئے ہے جن کو سزا دینا اس کی حکمت ومصلحت کا اقتضا ہوتا ہے، اس کی مثال بعینہ درج ذیل آیت ہے، جس میں رسول اللہؐ اور صحابۂ کرامؓ کی بظاہر متضاد صفتیں بیان ہوئی ہیں، حالانکہ وہ متضاد نہیں ہیں:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (فتح:۲۹)	محمدؐ اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں کفار پر سخت، آپس میں رحم دل ہیں۔ (دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۲ ص ۵۶۴)

۱۳۔ اسلامی حدود

ڈر منگھم کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی پر جو منافقین کا سردار تھا، اس لئے حد جاری نہیں کی کہ وہ اپنی قوم اور اہل مدینہ میں غیر معمولی اثر ونفوذ رکھتا تھا۔ (حیات محمد از ڈرمنگھم ص ۳۰۵)

صحیح یہ ہے کہ رسول اللہ کو منافقین کا نام بنام علم تھا، مگر اس کے باوجود آپؐ نے کسی منافق کو کبھی کسی قسم کی سزا نہ دی، خواہ وہ لیڈر رہا ہو یا کوئی اور اس کی وجہ یہ امید اور توقع تھی کہ شاید وہ صحیح طریقہ پر اسلام قبول کرلیں اور مسلمانوں کی صف اور جماعت میں شامل ہوجائیں، علاوہ ازیں آپ کو ان سے قتال کرنے کا حکم بھی نہیں دیا گیا تھا۔ رہی یہ آیت

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ (تحریم:۹)	اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو۔

تو مفسرین کا خیال ہے کہ منافقین سے جہاد کا مطلب یہ ہے کہ انھیں اسلام کی دعوت دی جائے اور اس سلسلہ میں جس قدر بھی ممکن ہو کوشش سے دریغ نہ کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر رئیس المنافقین کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا ہوتا تو

غزوۂ بنی المصطلق (۱) کے بعد خود ان کے صاحبزادے ہی انھیں رضا و رغبت سے قتل کر ڈالے ہوتے۔

۱۴۔ ہجرت

ہجرت کے وقت آپ کے گھر سے نکلنے کے بارے میں ارفنج نے لکھا ہے:

"واقعہ کے متعلق ایک محتمل روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے گھر کے پیچھے کی دیوار سے کود کر نکلے تھے اور اترتے وقت ان کے خادم نے انھیں سہارا دیا تھا اور آپؐ نے اس کی پشت سے سیڑھی کا کام لیا تھا۔" (ص ۱۱۸)

وہ آگے یہ بھی لکھتا ہے:

"ابھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے رفیق حضرت ابوبکرؓ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ اچانک گھوڑوں پر سوار ایک جماعت ان کے پاس آگئی جس کی قیادت سراقہ بن مالک کر رہے تھے۔" (ص ۱۱۹)

حالانکہ سیرت کے عربی ماخذ میں اس روایت کا ذکر تک نہیں ہے، اس لئے یہ جھوٹی اور گڑھی ہوئی ہے، سراقہ کے واقعہ میں بھی غلط بیانی کی گئی ہے، صحیح و ثابت یہ ہے کہ وہ تعاقب میں تنہا

(۱) یہ غزوہ ۵ھ میں غزوۂ خندق سے کچھ پہلے ہوا تھا، یہاں جس واقعہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، اس کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، اس غزوہ میں غنیمت کے لالچ سے بہت سے منافقین بھی شریک تھے، جو ہر موقع پر فتنہ گری کی کوشش کرتے تھے، ایک دن چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر اور انصاری میں جھگڑا ہو گیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ قریش و انصار نے تلواریں کھینچ لیں اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، لیکن چند لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا عبداللہ بن ابی جو راس المنافقین تھا اس کو موقع ہاتھ آیا، انصار سے مخاطب ہو کر کہا تم نے یہ بلا خود مول لی، مہاجرین کو تم نے بلا کر اتنا کر دیا کہ اب وہ خود تم سے برابر کا مقابلہ کرتے ہیں، اب بھی تم دستگیری سے ہاتھ اٹھا لو تو وہ خود یہاں سے نکل جائیں گے، جب آنحضرت صلعم کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، بولے ارشاد ہو تو اس منافق کی گردن اڑا دی جائے، آپ نے فرمایا کہ کیا تم یہ چرچا کرنا پسند کرتے ہو کہ محمد اپنے ساتھ والوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں۔

عبداللہ ابن ابی کے صاحبزادے کا نام بھی عبداللہ تھا، باپ جس درجہ کا منافق اور دشمن اسلام تھا، یہ اسی قدر اسلام کے جاں نثار تھے، آنحضرت صلعم کی ناراضی کی بنا پر یہ خبر پھیل گئی تھی کہ آپ عبداللہ بن ابی کے قتل کا حکم دینے والے ہیں، یہ سن کر وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دنیا جانتی ہے کہ میں باپ کا کس قدر خدمت گزار ہوں، لیکن اگر حکم ہو تو میں ابھی اس کا سر کاٹ لاتا ہوں، آپ نے اطمینان دلایا کہ قتل کے بجائے میں اس پر مہربانی کروں گا۔

اور پوشیدہ نکلے تھے۔"[۱]

۱۵۔ام المومنین حضرت سودہؓ بن زمعہ

ارفنج کا بیان ہے کہ "آنحضور (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت سودہؓ سے اپنی دوسری بیویوں کی طرح محبت نہیں کرتے تھے اور چند برس بعد ہی آپؐ نے ان سے اہمال اختیار کرلیا تھا۔"

پہلی بات تو یہ ہے کہ محبت ایک قلبی معاملہ ہے، جس کا ادراک دوسرے لوگ نہیں کرسکتے، دوسرے حضرت سودہؓ کی شادی کے واقعہ سے ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رغبت ومحبت دونوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپؐ کی یہی اکیلی بیوی تھیں[۲]، ان کے نکاح کا واقعہ ابن کثیر وغیرہ کے بیان کے مطابق اس طرح ہے کہ خولہ بنت حکیم آنحضرت ﷺ کے ایما سے حضرت سودہؓ کے والد کے پاس گئیں اور نکاح کا پیغام دیا، انھوں نے کہا محمد شریف کفو ہیں لیکن سودہ سے بھی تو دریافت کرو، خولہ نے کہا انھیں یہ پسند ہے، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ "جب سودہ بوڑھی ہوگئیں تو انھوں نے اپنی باری مجھے دے دی" ابن عباسؓ فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کی ایک عورت حضرت سودہ سے نکاح کیا جن کے پہلے شوہر سے پانچ یا چھ بچیاں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا مجھ سے تمھیں کیا مانع ہے؟ عرض کی اے اللہ کے رسول!

(۱) سراقہ کے واقعہ کی تفصیل استیعاب ابن عبدالبر وغیرہ میں موجود ہے، ملاحظہ ہو، آنحضرت صلعم کے مکہ سے نکلنے کے بعد مشرکین نے اعلان کیا کہ جو شخص محمد اور ابوبکر کو قتل کردے گا یا انھیں زندہ پکڑ لائے گا اس کو گراں قدر انعام دیا جائے گا، سراقہ اپنے قبیلہ بنی مدلج کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آکر ان سے کہا کہ میں نے ابھی ساحل کی طرف سیاہی دیکھی ہے، میرا خیال ہے کہ وہ محمد اور ان کے ساتھی ہیں، سراقہ کو یقین ہوگیا، لیکن انعام کی طمع میں انھوں نے تردید کی کہ نہیں وہ لوگ نہیں ہیں، تم نے فلاں شخص کو دیکھا جو ابھی ہمارے سامنے گیا ہے، تھوڑی دیر کے بعد سراقہ اٹھ کر گھر گئے اور لونڈی سے کہا کہ وہ گھوڑا تیار کرکے انھیں ایک مقام پر دے اور نیزہ سنبھال کر چپکے سے گھر کی پشت سے نکلے، لونڈی سے گھوڑا لیا اور لوگوں کی نظر بچا کر نکل گئے اور گھوڑا دوڑاتے ہوئے آنحضرت صلعم کے پاس پہنچ گئے۔ (۲) چونکہ حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ کا نکاح قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہوا اس لئے مورخین کا اختلاف ہے کہ کس کو تقدم حاصل ہے، ابن اسحاق کی روایت ہے کہ سودہؓ کو تقدم ہے، عبداللہ بن محمد بن عقیل کا قول ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کے بعد نکاح میں آئیں تاہم اس قدر مسلم ہے کہ حضرت عائشہؓ نکاح کے بعد تقریباً ساڑھے تین برس تک میکہ ہی میں رہیں، اس بنا پر اس عرصہ میں عملاً حضرت سودہؓ گویا آنحضرت صلعم کی تنہا بیوی تھیں۔

آپ مجھے تمام لوگوں سے زیادہ عزیز اور محبوب ہیں، میں آپؐ کی نہایت تعظیم و تکریم کرتی ہوں، یہی میرے لئے مانع ہے کہ آپ کے سر پہ یہ بچیاں صبح و شام سوار رہیں گی آپؐ نے فرمایا کوئی اور مانع تو نہیں ہے، عرض کی نہیں، خدا کی قسم اور کوئی مانع نہیں ارشاد ہوا اللہ کی تم پر رحمت ہو، قریش کی نیک بخت عورتیں اپنے چھوٹے بچوں پر کس قدر شفیق اور مہربان ہوتی ہیں اور وہ اپنے شوہروں کا کتنا لحاظ اور خیال رکھتی ہیں۔'' (البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۱۳۲ و ۱۳۳)

یہ واضح دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے شادی کرنے کی رغبت بھی تھی اور شادی کے بعد آپ ان سے محبت بھی کرتے تھے، اور دوسری ازواج مطہرات کی طرح باریوں کی تقسیم میں ان سے مساوات بھی برتی تھی، مگر انھوں نے خود بطیب خاطر اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دے دی تھی۔ (۱)

۱۶۔ رسول اللہ کی بعثت عامہ

مارگولیتھ مدعی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لئے کوئی خط جزیرۂ عرب کے باہر کے بادشاہوں اور امرا کو نہیں لکھا (تاریخ اسلام ج ا ص ۱۵۷) میور کہتے ہیں کہ ''آپ نے بعثت سے لے کر وفات تک عربوں کے سوا کسی اور ملک کے لوگوں کو اسلام کی دعوت نہیں دی۔'' بروکلمن نے بھی اس کی توثیق کی ہے۔ کہتے ہیں ''یہ ثابت کرنا آسان نہیں جب کہ نبی خود باور کرا رہے تھے کہ وہ عالمی پیغمبر ہیں اور انھیں ساری دنیا کو اسلام کا پیغام پہنچانے کی دعوت دی گئی ہے۔'' (تاریخ الشعوب الاسلامیہ ج ۷ ص ۷۱)

قرآن مجید نے خود ہی بعثت نبویؐ کی صحیح نوعیت اس طرح واضح کر دی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا:۲۸)	ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا۔

نیز

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء:۱۰۷)	ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر ساری دنیا کے لئے رحمت بنا کر۔

(۱) حقیقت صرف یہ ہے کہ حضرت سودہؓ جب بوڑھی ہو گئیں تو ان کو خیال ہوا کہ شاید آنحضرت صلعم طلاق دے دیں اور وہ شرف صحبت سے محروم ہو جائیں، اس بنا پر انھوں نے اپنی باری خوشی خوشی حضرت عائشہ کو دے دی، اتنی سی بات کو مستشرقین نے افسانہ بنا دیا کہ آنحضرت صلعم کو اور بیویوں کی طرح ان سے محبت نہ تھی اور آپؐ نے ان سے عملاً اپنا تعلق ختم کر لیا تھا۔ نعوذ باللہ من هفواتهم

امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں حضرت جابرؓ کے واسطے سے آپ کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے۔

اعطیت خمسا لم یعطهن احد قبلي كان كل نبي يبعث الى قومه خاصة وبعثت الى كل احمر و اسود.
(صحیح مسلم کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ)

مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں، ہر نبی خاص اپنی ہی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں ہر کالے گورے (ساری دنیا) کے لئے مبعوث ہوا۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ آپ ؐنے فرمایا:

فضلت على الانبياء بست اعطيت جوامع الكلم ونصرت بالرعب واحلت لي الغنائم وجعلت لي الارض طهورا ومسجدا وارسلت الى الخلق كافة وختم بي النبيون (صحیح مسلم کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ)

مجھے دوسرے نبیوں پر چھ چیزوں کی وجہ سے فضیلت دی گئی، مجھے جوامع الکلم عنایت ہوئے اور رعب اور دھاک کے ذریعہ فتح ونصرت دی گئی اور مال غنیمت میرے لئے حلال کیا گیا اور تمام روئے زمین میرے لئے پاک اور مسجد بنائی گئی اور میری بعثت تمام دنیا کی طرف ہوئی اور میری ذات پر انبیاء کا سلسلہ ختم ہوا۔

۱۷۔ اسلامی فتوحات

ڈرنگھم، سنت نبویؐ سے ناقص واقفیت کی بنا پر بہت سی حدیثوں کے منکر ہیں اور انھیں خلفاء اور جنگی قائدوں کا اضافہ بتاتے ہیں، ان کی متابعت اور ہمنوائی کرنے والے وہ مستشرقین بھی بڑی تعداد میں ہیں جو آنحضرت ﷺ کو حدیثوں کی وجہ سے ہدف طعن بناتے ہیں اور خاص طور پر ان حدیثوں کی وجہ سے آپ ؐکی شخصیت کو مطعون بھی کرتے ہیں اور ان کا انکار بھی کرتے ہیں، جن میں قیامت سے قبل کے واقعات کا ذکر ہے، یا اسلامی فتوحات کے بارہ میں پیشنگوئی کی گئی ہے جیسے وہ حدیثیں جن کی امام مسلم نے اپنی صحیح میں تخریج کی ہے۔

اس طرح کی ایک حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ؐنے فرمایا:

نصرت بالرعب وبينما انا نائم اتيت بمفتاح خزائن الارض فوضعت بين يدي... قال ابو هريرهؓ

میری رعب اور دھاک کے ذریعہ مدد کی گئی خواب میں مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئیں اور وہ سب میرے آگے

فذهب رسول الله صلى الله عليه وسلم وانتم تنتثلونها (صحیح مسلم کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ) رکھ دی گئیں، حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ کا تو انتقال ہو گیا، مگر تم لوگ زمین کے خزانے نکال رہے ہو۔

اسی طرح ایک حدیث میں فتح قسطنطنیہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور بعض دوسری حدیثوں میں فارس وروم کی فتح اور دجال پر غلبہ کا ذکر ہے۔

مستشرقین کے نزدیک یہ سب حدیثیں درست نہیں جو ان کے قلتِ علم اور حدیث سے ناقص واقفیت کا نتیجہ ہے۔

۱۸۔ جہاد ڈرنگھم کے نزدیک جہاد کا حکم صرف نبی کی زندگی تک کے لئے تھا، وہ آیات جہاد کو عام نہیں مانتے۔

اس غلطی میں وہ سب مستشرقین شریک ہیں، جن کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا، اس کا مغربی استعمار نے اس ڈر سے کہ اسلام دنیا کو نیست ونابود کردے گا، خوب پروپیگنڈا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی آیتیں دو طرح کی ہیں، ایک تو وہ ہیں جو مخصوص ومتعین غزوات بدر، احد اور خندق وغیرہ کے بارہ میں نازل ہوئی ہیں، دوسری طرح کی آیات کا تعلق کسی خاص غزوہ سے نہیں ہے، بلکہ ان میں دوام واستمرار کی شان پائی جاتی ہے، اس لئے وہ دائمی ہیں، بلکہ متعین غزوات کے بارہ میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں ان کے متعلق بھی علمائے تفسیر کا یہی خیال ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ ان میں لفظ کے عموم کا اعتبار کیا جائے گا اور خاص سبب کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

اسی طرح جہاد اور اس کے فضائل سے متعلق حدیثیں بھی دائمی ہیں۔

ان دلائل وشواہد کی موجودگی میں کون ان مستشرقین کی باتوں کو باور کرے گا۔

۱۹۔ غزوۂ حنین ڈرنگھم لکھتے ہیں "غزوۂ حنین کے خاتمہ کے بعد لوگ قیدی عورتوں پر پل پڑے۔" یہ دعویٰ کتب سیر کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے، تاریخ طبری اور سیرت ابن ہشام میں ہے۔

> "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیرانِ جنگ اور مال غنیمت کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں۔ (تاریخ طبری ج ۳ ص ۸۱، ابن ہشام ج ۲ ص ۲۹۴)

ابن جریر طبری دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

''آپؐ نے طائف کی روانگی کے وقت ہوازن کے اسیروں کے بارہ میں حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں، ان کے کچھ آدمیوں نے اسلام قبول کرلیا، ان کا ایک وفد خدمت نبویؐ میں حاضر ہوکر عرض گذار ہوا کہ اللہ کے رسول ہم لوگ مصیبت زدہ ہیں، ہم پر احسان کیجئے، ارشاد ہوا تمہاری اولاد اور تمہاری عورتیں تمہیں زیادہ محبوب ہیں یا تمہارا مال واسباب؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کے برابر کسی چیز کو نہیں سمجھتے...... پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور بنی عبدالمطلب کے حصہ میں جو کچھ تھا واپس کر دیا، اس طرح اور لوگوں نے بھی ان کی اولاد اور عورتوں کو واپس کر دیا۔'' (تاریخ طبری ج ۳ ص ۸۶)

ابن اثیر فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں اور مال غنیمت کو جعرانہ میں جمع کرنے کا حکم دیا اور بدیل بن ورقا خزاعی کو ان کی نگرانی کے لئے مامور فرمایا۔'' (کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۶)

ان تصریحات سے تو یہ معلوم ہوا کہ غزوۂ حنین کے بعد قیدی عورتوں سے کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی، بلکہ ان کی مکمل حفاظت کے خیال سے انھیں جعرانہ جیسے دور دراز مقام پر رکھا گیا، اور بدیل بن ورقا کو ان کی نگرانی سپرد کی گئی، پھر قبیلہ ہوازن کے جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے، ان کے قیدیوں کو واپس کر دیا گیا، اس تمام جتن کے بعد کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ان پر دست درازی کی گئی۔

سُبْحَانَکَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ

یہ اور اس کی طرح کی بے شمار غلطیاں مستشرقین بالقصد اس لئے کرتے ہیں کہ اسلام اور ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو ہدفِ طعن وتشنیع بنائیں، انھیں مستشرقین کی فروگذاشتیں اور خطائیں کہہ کر ہم ان سے صرف نظر نہیں کرسکتے، ان کا مقصد تو شکوک وشبہات پیدا کرنا ہے۔

امام اشعری اور مستشرقین

مولانا مرزا محمد یوسف

استاد مدرسہ عالیہ، رامپور

مستشرقین کی علمی خدمات اپنی جگہ پر قابل صد ستایش ہیں، مگر دیانت کا تقاضا ہے کہ ان کی تصویر کا دوسرا رخ بھی نظر سے اوجھل نہ رہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی سعی و کاوش کے طفیل میں مشرق کے بہت سے علمی نوادر جو نقش و نگار طاقِ نسیاں بن چکے تھے، از سرنو اجاگر ہو گئے، مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی تحقیق کے پردے میں بسا اوقات انتہائی خطرناک مقصد پنہاں رہتا ہے، وہ اسلامی تاریخ کے غیر اہم اور دھندلے نقوش کو بھی اپنے مخصوص سیاسی مقاصد کے پیش نظر نمایاں کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے، شعوبیہ کی تحریک کوئی اہم اجتماعی تحریک نہیں تھی، صرف ایک ادبی تحریک تھی، جو چند اہل ادب تک محدود رہی، اور طبقۂ عوام اس سے آشنا بھی نہیں ہوا، مگر مسٹر براؤن نے جن کا شمار اسلامیات کے محسنین کی صف اول میں ہوتا ہے، اپنے قلم کی چابک دستی سے اس کو وہ شوخ رنگ بخشا جس نے ایران و توران اور ترک و عرب کی تفریق کو زندہ کر دیا۔

نقاشانِ فرنگ نے اس قسم کے دھندلے نقوش ہی کو نمایاں کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ایسے ایسے افسانے تراشے جن کا کوئی وجود ہی نہیں تھا، اسلامی شریعت و فقہ تمامہا قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے، مگر گولڈ زیہر نے یہ افسانہ تراشا کہ اسلامی فقہ رومن قانون سے ماخوذ ہے، اس افسانہ نے آگے چل کر ایک امر واقعہ کی حیثیت حاصل کر لی اور آج ایک جماعت کا جس نے محمڈن لا کا مطالعہ انگریزی کتابوں کی مدد سے کیا ہے، خیال ہے کہ اسلامی فقہ بڑی حد تک رومن لا سے متاثر ہوئی ہے۔

اس لئے حزم و احتیاط کا مقتضا ہے کہ مستشرقین کی علمی و تحقیقی کاوشوں کو آنکھ بند کر کے نہ مان لیا جائے، ہماری خوش فہمی ملاحظہ ہو کہ ہم مستشرقین کی ہر علمی کوشش کو بڑی فراخدلی سے احسنت و

مرحبا کہنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

حال ہی میں ایک امریکن مشنری رچرڈ جوزف مکارتھی نے ''الاشعری کی دینیات'' کے نام سے ایک کتاب شائع ہے، جو باوجود کوشش کے میرے مطالعہ میں نہ آسکی، جناب عابد رضا خاں صاحب بیدار رامپور نے معارف اکتوبر ۱۹۵۵ء میں اس کا تعارف کرایا ہے، اس کی روشنی میں اس کتاب کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

''الاشعری کی دینیات'' امام اشعری کی کتاب اللمع اور استحسان الخوض فی الکلام کے عربی متون اور انگریزی تراجم پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ چار ضمیمے بھی ہیں، جن میں سے ایک ضمیمہ میں امام اشعری کی تصانیف کی فہرست ہے۔

جہاں تک کتاب اللمع کی اشاعت کا تعلق ہے، ہم مسٹر مکارتھی کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اس اہم کتاب کو شائع کر کے ایک بڑے مفکر اسلام کے افکار عالیہ سے براہ راست آشنا ہونے کا ہم کو موقع دیا ہے۔

مسٹر مکارتھی نے ''کتاب اللمع'' امریکی یونیورسٹی بیروت کے قلمی نسخہ کی مدد سے شائع کی ہے، معلوم نہیں اس کی تصحیح و مقابلہ میں انھوں نے اس نسخہ کے علاوہ دوسرے نسخوں سے بھی مدد لی ہے یا نہیں، اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے، جس کی نشاندہی بروکلمن نے اپنی ''تاریخ الادب العربی'' میں کی ہے [۱]، ابتدا سے بدعتی فرقوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اکابر علمائے اہلسنت والجماعت کی کتابوں میں ایسی چیزوں کا اضافہ کر دیتے ہیں، جن سے ان بزرگوں کا دامن پاک تھا، اس لئے علماء نے کسی کتاب کے قابل اعتماد ہونے کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ ثقہ لوگوں کے ہاتھوں میں رہ چکی ہو، چنانچہ ریٹر نے امام اشعری کی کتاب ''مقالات الاسلامیین'' جن نسخوں کی مدد سے ایڈٹ کی ہے، ان میں سے ایک نسخہ شہرستانی کے استعمال میں رہ چکا ہے۔ [۲]

دوسری شرط یہ رکھی تھی کہ کتاب کی مسلسل روایت مصنف تک ثابت ہو، لیکن یہ شرط اس زمانہ میں پوری نہیں ہوسکتی، اس لئے اس کے بجائے یہ شرط ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ اس کتاب کے مباحث کی تائید دوسری مشہور و متداول کتابوں سے ہوتی ہو، چنانچہ ریٹر نے ''مقالات الاسلامیین'' کے ہر مبحث کی تائید میں ملل و نحل کی دوسری کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔

(۱) بروکلمن تاریخ الادب العربی ملحق جلد اول صفحہ ۳۴۵ رقم ۱۳ (ضمیمہ فہرست برٹش میوزیم صفحہ ۷۲ پر اس کتاب کا ذکر ہے)(۲) مقالات الاسلامیین جلد اول مقدمہ ناشر ص ۵

معلوم نہیں مسٹر مکارتھی نے ان شرائط کا کہاں تک لحاظ رکھا ہے، اس کے بغیر اس قسم کی کتابوں کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے، اسی وجہ سے امام اشعری کی ''الابانة عن اصول الديانة'' جو دائرۃ المعارف حیدر آباد سے پہلی مرتبہ ۱۳۲۱ھ اور دوبارہ ۱۳۶۵ھ میں شائع ہوئی ہے، اہل نظر کے نزدیک مشکوک الصحت ہے، چنانچہ استاذ الکوثری نے تبيين كذب المفترى پر اپنی تعلیقات میں لکھا ہے۔

''والنسخة المطبوعة في الهند من الابانه نسخة مصحفة محرفة تلاعبت بها الايادى الاثيمه فيجب اعادة طبعها من اصل وثيق.''(۱)

یہ اس کتاب کا حال ہے، جو ایک مسلمان ادارے اور ایک مسلمان مطبع سے مسلمان مصححین کی نگرانی میں شائع ہوئی ہے، ایسی صورت میں اس کتاب کے متعلق قارئین کرام خود اندازہ لگا سکتے ہیں، جو ایک امریکن مشنری نے ایک مسیحی کتب خانہ کے مخطوطہ کی مدد سے ایک مسیحی یونیورسٹی کے زیر سرپرستی ایک کیتھولک پریس سے شائع کی ہے، ہم کسی کی نیت پر حملہ نہیں کرتے، لیکن کسی کتاب کی صحت کے لئے ناشرین کی نیک نیتی بھی شرط ہے، جس کی توقع ایک مشنری اور ایک کیتھولک پریس سے نہیں کی جا سکتی ہے۔

گلستان میں ایک قصہ لکھا ہے کہ شیخ شعدیؒ ایک مکان کرایہ پر لینا چاہتے تھے، اس کا پڑوسی ایک یہودی تھا، اس نے آ کر مکان کی بہت زیادہ تعریف کی، شیخ سعدی نے سب کچھ سن کر کہا کہ جی ہاں! اس کی سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ آپ کی ہمسائگی سے سابقہ پڑے گا! یہی حال مستشرقین کی شائع کردہ کتابوں کا بھی ہے۔

الاشعری کی ''دینیات'' کا سب سے زیادہ قابل قدر حصہ اس کے مداحین کی نظر میں کتاب کا وہ ضمیمہ ہے جس میں امام اشعری کی تصانیف کی فہرست دی گئی ہے، لیکن مجھے مسٹر مکارتھی کی مرتبہ فہرست میں کوئی خاص ندرت نظر نہیں آئی، امام ابوالحسن الاشعری کی تصانیف کی تعداد دو تین سو کے قریب ہے، جیسا کہ ابن عساکر نے تبیین کذب المفتری میں روایت کی ہے:

اخبرنی الشيخ ابو القاسم بن نصر	مجھ سے شیخ ابوالقاسم بن نصر الواعظ نے

(۱) تبیین کذب المفتری ص ۲۸ حاشیہ۔ ابانہ کا جو نسخہ ہندوستان میں چھپا ہے، وہ ایک ایسے نسخہ سے چھاپا گیا ہے جس میں بہت زیادہ تصحیف و تحریف ہوئی ہے اس لئے اسے دوبارہ ایک قابل اعتماد نسخہ سے شائع کرنا ضروری ہے۔

الواعظ في كتابه عن ابي المعالي بن عبدالملك القاضي قال سمعت من اثق به قال رأيت تراجم كتب الامام ابي الحسن الاشعري فعددتها اكثر من مائتين و ثلثمائة مصنف.[1]	اپنی کتاب میں جسے ابی المعالی بن عبدالملک القاضی سے روایت کیا ہے خبر دی کہ انھوں نے کہا کہ میں نے ایک قابل اعتماد شخص سے سنا کہ میں نے امام ابی الحسن الاشعری کے تراجم کتب کو گنا تو وہ دو تین سو سے زائد تھے۔

ان میں سے مسٹر مکارتھی نے ایک سو چھ کتابوں کی فہرست دی ہے، حالانکہ ایک سو پانچ کتابوں کے نام حافظ ابن عساکر نے تبیین کذب المفتری میں بتفصیل ذیل نقل کئے ہیں۔

(۱) بہتر کتابوں کے نام وہ ہیں جو ابن فورک نے امام اشعری کی کتاب العمد سے نقل کئے ہیں اور جو امام صاحب نے ۳۲۰ھ تک تصنیف کی تھیں۔[2]

(۲) اٹھائیس کتابوں کے نام ''العمد'' کے حوالے کے علاوہ ابن فورک سے حافظ ابن عساکر نے نقل کئے ہیں، جو امام صاحب نے ۳۲۰ھ کے بعد تصنیف کی تھیں۔[3]

(۳) تین کتابوں کے نام حافظ ابن عساکر کی اپنی دریافت ہیں۔[4]

(۴) ایک کتاب ''کشف الاسرار و هتک الاستار'' کا ذکر انھوں نے اس مقام پر کیا ہے، جہاں امام صاحب کے اعتزال سے تائب ہونے کا واقعہ نقل کیا ہے۔

(۱) تبیین ص ۱۳۶، اس روایت کے بارے میں یہ کہنا کہ ممکن ہے، اس میں کچھ مبالغہ ہو، صحیح نہیں ہے، ایک سو کتابوں کے نام تو ابن فورک نے گنائے ہیں، ان کے علاوہ اور کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں، خود ابن فورک نے کہا ہے یہ ان کتابوں کے نام ہیں جو امام اشعری نے ۳۲۰ھ تک تصنیف کی تھیں، لوگوں کو جو لیکچر (امالی) لکھائے یا لوگوں نے مختلف مقامات سے ان کے پاس سوالات بھیجے تھے اور جن کے انھوں نے جوابات دیئے ہیں، ان کی تعداد اس کے علاوہ ہے، تبیین ص ۱۳۵ سطر ۱۔۳ اور یہ ظاہر ہے کہ امالی وفتاوی کی تعداد مستقل اور باضابطہ کتابوں سے کہیں زیادہ ہوا کرتی ہے، اس طرح امام اشعری کی تصانیف کا دو تین سو ہونا مستبعد نہیں بلکہ قرین قیاس ہے۔ (۲) مسٹر مکارتھی نے صرف ۶۹ کتابیں گنائی ہیں لیکن نمبر ۱۲۰ اور ۴۹ دو دو کتابیں ہیں، ایک زمانہ اعتزال کی تصنیف اور ایک اعتزال سے تائب ہو جانے کے بعد کی، ایک کتاب ''کتاب فی مقالات الفلاسفة خاصة'' کا ذکر ہی نہیں کیا، اس طرح اس ضمن میں بہتر کتابیں ہوتی ہیں۔ (۳) مسٹر مکارتھی نے صرف ۲۶ کتابیں گنائی ہیں لیکن نمبر ۸۳ اور نمبر ۸۷ دو دو کتابیں ہیں، اس کی تفصیل اپنے اپنے موقع پر آئے گی، اس طرح اس ضمن میں اٹھائیس کتابیں آتی ہیں (۴) تبیین ص ۱۳۵

ودفع الکتاب الی الناس فمنها "کتاب اللمع" وکتاب اظهر فیه عوارض المعتزلة سماه بکتاب کشف الاسرار وهتک الاستار[1]	اور لوگوں کو اپنی کتابیں دیکھنے کے لئے دیں، ان میں سے ایک کتاب اللمع تھی اور ایک دوسری کتاب تھی، جس میں معتزلہ کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا تھا اور اس کتاب کا نام کشف الاسرار وہتک الاستار تھا۔

(۵) ایک اور کتاب "الابانہ عن اصول الدیانہ" کا ذکر انھوں نے تبیین کذب المفتری کے آخر میں کیا ہے کہ امام ابوعثمان الصابونی جب درس کے لئے تشریف لے جاتے تو الابانہ ان کے ہاتھ میں ہوتی۔

ان الامام ابا عثمان اسماعیل بن عبدالرحمن الصابونی النیسابوری قال ماکان یخرج الی مجلس درسه الا وبیده کتاب الابانه لابی الحسن الاشعری ویظهر الاعجاب به[2]	امام ابوعثمان اسماعیل بن عبدالرحمن الصابونی النیساپوری جب اپنے حلقۂ درس میں تشریف لے جاتے تو امام اشعری کی الابانہ ان کے ہاتھ میں ضرور ہوتی، اور وہ اس کی بہت زیادہ تعریف کیا کرتے تھے۔

اس طرح حافظ ابن عساکر نے امام اشعری کی ایک سو پانچ کتابوں کے نام نقل کئے ہیں، ان کے علاوہ مسٹر مکارتھی کی فہرست میں صرف پانچ کتابیں ایسی رہ جاتی ہیں، جن کا ذکر تبیین کذب المفتری میں نہیں ہے، اور جن کی دریافت کا سہرا مستشرقین کے سر بتایا جاتا ہے، ان کی نوعیت یہ ہے۔

ا۔ کتاب التبیین عن اصول الدین: اس کا نام ابن الندیم نے الفہرست میں دیا ہے، مگر خود مسٹر مکارتھی کا خیال ہے کہ "ہوسکتا ہے کہ یہ ابانہ ہو" اور یہ قرین قیاس بھی ہے، کیونکہ "الابانہ عن اصول الدیانہ" اور "کتاب التبیین عن اصول الدین" کا مفہوم ایک ہی ہے، اس لئے یہ ابن عساکر پر کوئی نیا اضافہ نہیں ہے۔

۲۔ رسالہ استحسان الخوض فی علم الکلام: (مطبوعہ ۱۳۲۳ھ ۱۳۴۴ھ) غالباً یہ رسالہ الحث علی البحث[3] ہے، کیونکہ استحسان الخوض فی علم الکلام اور الحث علی البحث کا ماحصل ایک ہی ہے۔

(۱) تبیین ص ۳۹ سطر ۱۹۔ مکارتھی کی فہرست میں نمبر ۱۰۶ (۲) تبیین ص ۳۸۹ مکارتھی کی فہرست میں نمبر ۱۰۵

(۳) ایضاً

۳۔ رسالۃ کتب بھا الی اھل الشغر بہ باب الابواب: اسے قوام الدین بک نے جامعہ استنبول سے شائع کیا ہے[۱]، غالباً یہ وہی کتاب ہے جس کا نام ابن عساکر نے "جواب مسائل کتب بھا الی اھل الشغر فی تبیین ماسئلوا عنہ من مذھب اھل الحق" بتایا ہے، کتابوں کے تسمیہ میں اس قسم کے اختلافات قدماء کے یہاں عام ہیں، چنانچہ ریٹر کی نشر کردہ "مقالات الاسلامیین و اختلاف االمصلیین" کا نام تبیین میں "کتاب فی مقالات المسلمین یستوعب جمع اختلافتھم و مقالاتھم" ہے، لیکن مقالات الاسلامیین کے پانچ مخطوطات کے نام جن کی مدد سے ریٹر نے اسے اڈٹ کیا ہے، حسب ذیل ہیں

ا۔ جامع ایا صوفیا کے قدیم نسخہ کا نام ہے، کتاب مقالات الاسلامیین و اختلاف المصلیین

ب۔ جامع ایا صوفیا کے دوسرے نسخہ کا نام ہے، "کتاب مقالات الاسلامیہ"

ج۔ پیرس کی قومی لائبریری کے نسخہ پر کوئی نام نہیں ہے، کیونکہ وہ اول میں ناقص ہے۔

د۔ حیدر آباد کے نسخہ کے صفحہ عنوان پر "الجزء الاول من مقالات الاسلامیین او اختلاف المصلیین" مرقوم ہے، لیکن خاتمہ کتاب پر "کتاب المقالات و الاختلاف" لکھا ہے۔

ھ۔ خواجہ اسماعیل آفندی کے نسخہ کے آخر میں اس کا نام "الملل و النحل غیر الملل و النحل الذی للشھرستانی بل لغیرہ من الافاضل" لکھا ہے، یہ کتاب حافظ ابن تیمیہ کے پیش نظر رہی ہے، مگر انھوں نے ان میں سے کسی کے نام کے ساتھ اسے موسوم نہیں کیا، چنانچہ منہاج السنۃ میں لکھا ہے۔

ومن اجمع الکتب التی رأیتھا فی مقالات الناس المختلفین فی اصول الدین کتاب ابی الحسن الاشعری[۲]	اصول الدین میں مختلف لوگوں کے مقالات میں جامع ترین کتاب جو میں نے دیکھی ہے، وہ ابی الحسن الاشعری کی ہے۔

ان تصریحات کے بعد بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ ایک ہی کتاب کے مختلف نام ہوا کرتے تھے، اس لئے یہ تینوں کتابیں بالترتیب مسٹر مکارتھی کی فہرست کی نمبر ۱۰۵ نمبر ۹۷ اور نمبر ۹۹ ہیں اور اس لئے انھیں کوئی نیا اضافہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

۴۔ کتاب الامام: یہ نام حد درجہ مبہم ہے، ہر کتاب کے متعلق "کتاب الامام" کہا جا سکتا ہے، ہوسکتا ہے کہ کسی مصنف نے کہیں معہود ذہنی کے طور پر امام اشعری کی کتاب کا (جو غالباً ابن عساکر کی فہرست میں محسوب ہو چکی ہے) کتاب الامام کے نام سے حوالہ دیا ہو۔

(۱) مقالات الاسلامیین ج اول مقدمہ ناشر (۲) منہاج السنۃ ج اول ص ۷۰

۵۔قول جملة اصحاب " حديث واهل السنة في الاعتقاد: کسی مصرحہ حوالے کے بغیر اسے بھی مستقل نہیں مانا جاسکتا۔

غرض ایک سو چھ کتابوں کی فہرست میں سے جو مسٹر مکارتھی نے دی ہے، ایک سو ایک کتابیں وہ ہیں جن کے نام حافظ ابن عساکر نے اپنی کتاب تبیین کذب المفتری میں دیئے ہیں، باقی پانچ کا اضافہ جن کی دریافت کا سہرا مستشرقین کے سر ہے حد درجہ مشکوک ہیں، کیونکہ ان کتابوں میں تین کتابیں نام بدل کر شائع ہوئی ہیں، جو حقیقۃ وہی ہیں جو ابن عساکر کی فہرست میں مرقوم ہیں، اور دو کتابوں کا اضافہ کسی مصرحہ حوالے کے بغیر ناقابل تسلیم ہے۔

اس لئے ایک سو ایک کے بعد جو اضافہ ہے، وہ محض بھرتی کا ہے اور حقیقۃ ان مستشرقین نے حافظ ابن عساکر کی فہرست پر کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا، لیکن اگر مستشرقین کے اضافے کو مستقل تصانیف بھی مان لیا جائے اور حافظ ابن عساکر کی فہرست سے "الابانه عن اصول الديانه" اور "كشف الاسرار وهتك الاستار" کو جن کا ذکر فہرست کتب کے علاوہ ضمناً ہوا ہے، ساقط کر دیا جائے تب بھی حافظ ابن عساکر نے کم از کم ایک سو تین کتابوں کی یکجائی فہرست تو دی ہے، اور غالباً اس ایک سو تین (حافظ ابن عساکر کی فہرست) اور ایک سو چھ (مسٹر مکارتھی کی فہرست) میں کچھ ایسا فرق نہیں ہے، جو مسٹر مکارتھی کے لئے وجہ امتیاز بن سکے۔

باقی لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کے لئے ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ تین کتابوں کا ذکر استاد ابو منصور عبدالقاہر البغدادی المتوفی ۴۲۹ھ کی کتاب الفرق بین الفرق میں ہے، جو امام اشعری نے نظام معتزلی کے رد میں لکھی تھیں، "ولشيخنا ابى الحسن الاشعرى رحمه الله فى تكفير النظام ثلثه كتب"[۱]، مگر یہ کوئی اضافہ نہیں ہے، کیونکہ ان تین مجہول الاسم کتابوں کا ذکر حافظ ابن عساکر کی فہرست میں آچکا، ایک جگہ صراحۃ و الفنا کتاباً کبیراً فی الصفات .... علی النظام ....[۲]" اور متعدد جگہ اجمالاً۔

مسٹر مکارتھی نے ان کتابوں کے موضوع تحریر کئے ہیں، مگر وہ اپنے ابہام و اغلاق کی وجہ سے چیستان بن گئے ہیں، جن سے کتاب کے مباحث کے متعلق کسی رہنمائی کے بجائے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، اس کی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) الفصول: ملاحدہ، فلاسفہ، مادیین، حلولیین اور ان لوگوں کے رد میں جو عالم کو ازلی

(۱) الفرق بین الفرق ص ۱۱۵۔ اور ہمارے شیخ امام ابوالحسن الاشعری نے نظام کی تکفیر میں تین کتابیں لکھی ہیں۔
(۲) تبیین صفحہ ۱۲۹ سطر ۱۳۔۱۵

مانتے ہیں [1]، اصل میں ہے۔

الفصول فی الرد علی الملحدین والخارجین عن الملة کالفلاسفة والطبائعیین والدهریین واهل التشبیه والقائلین بقدم الدهر [2]

الفصول ملاحدہ اوران لوگوں کے رد میں ہے جو اسلام سے خارج ہیں جیسے فلاسفہ، اہل الطبائع (یا مادیین) دہریے مشبہ اور زمانہ کو قدیم ماننے والے۔

جن لوگوں نے تاریخ ملل اسلام کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ''اہل التشبیہ'' اور ''حلولیین'' میں بہت بڑا فرق ہے، اول الذکر وہ فرقہ ہے، جو خالق کو مخلوق کی صفات سے متصف گردانتا ہے اور ثانی الذکر وہ جو مخلوق کو خالق کی الوہیت کا اوتار (Incamtion) مانتا ہے، اور ان دونوں میں بعد المشرقین ہے، چنانچہ امام عبدالقاہر البغدادی نے الفرق بین الفرق کے باب ثالث کی فصل ثامن میں فرمایا ہے۔

الفصل الثامن فی بیان الشبهة من اصناف شتی: اعلموا اسعدکم الله ان المشبهة صنفان صنف شبهوا ذات الباری بذات غیره وصنف آخرون شبهوا صفاته بصفات غیره...... فمنهم البیانیة اتباع بیان بن سمعان الذی زعم ان معبوده انسان من نور علی صورة الانسان فی اعضائه وانه یفنی کله الا وجهه...... ومنهم المغیریه زعم ان معبوده ذو اعضاء...... ومنهم الکرامیه فی دعواها ان الله تعالی جسم له

آٹھویں فصل فرق مشبہ کے مختلف فرقوں کے ذکر میں: جاننا چاہئے اللہ تعالیٰ آپ کو نیک بخت بنائے کہ مشبہ کی دو قسمیں ہیں ایک قسم وہ جو ذات باری کو غیر باری کی ذات سے تشبیہ دیتے ہیں، اور دوسری قسم وہ جو اس کی صفات کو غیر باری کی صفات سے تشبیہ دیتے ہیں...... ان میں سے ایک بیانیہ ہیں جو بیان ابن سمعان کے متبع ہیں جو گمان کرتا تھا کہ اس کا معبود نور کا انسان بشکل انسانی ہے، تمام اعضاء میں اور وہ سوائے چہرہ کے سب فنا ہو جائے گا...... اور ان میں سے ایک مغیریہ ہیں یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کا

(۱) معارف صفحہ ۲۹۶ سطر ۱۹ (یہاں اور آئندہ معارف سے مراد معارف بابتہ اکتوبر ۱۹۵۵ء ہے۔ (۲) تبیین صفحہ ۱۲۵ سطر ۱۷۔۱۸

حد و نهاية وانه محل الحوادث وانه مماس لعرشه ..... فهولاء مشبهة لله تعالى بخلقه في ذاته فاما المشبهة لصفاته بصفات المخلوقين فاصناف منهم شبهوا ارادة الله تعالى بارادة خلقه ..... ومنهم الذين شبهوا كلام الله عزوجل بكلام خلقه ..... (۱)	معبود اعضاء والا ہے ..... اور ان میں سے کرامیہ ہیں ان کا دعوی ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم ہے، اس کی حد ونہایت ہے اور وہ حوادث کا محل ہے اور وہ اپنے عرش سے مماس ہے ..... پس یہ اللہ تعالیٰ کو خلق سے ذات میں تشبیہ دینے والے ہیں اور اس کی صفات کو مخلوق کی صفات سے تشبیہ دینے والوں کی بھی کئی قسمیں ہیں، ان میں سے ایک وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارادے کو اس کی مخلوق کے ارادے سے تشبیہ دیتے ہیں ..... اور ان میں سے وہ لوگ ہیں جو اللہ عزوجل کے کلام کو اس کی خلق کے کلام سے تشبیہ دیتے ہیں۔

یہ فصل فرقہ مشبہ کے ذکر میں ہے، لیکن فرقۂ حلولیہ کا ذکر انھوں نے چوتھے باب میں فرمایا ہے۔

الفصل التاسع من هذا الباب في ذكر اصناف الحلولية وبيان خروجها من فرق الاسلام الحلولية في الجملة عشر فرق ..... اما السبابية فانما دخلت في جملة الحلولية لقولها بان عليا صار الها بحلول روح الاله فيه وكذلك البيانية زعمت ان روح الاله دارت في الانبياء	اس باب کی نویں فصل حلولیہ کے مختلف اصناف کے ذکر میں اور ان کے دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کے بیان میں ہے، حلولیہ کل دس فرقے ہیں ..... سبابیہ حلولیہ میں اس وجہ سے داخل ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ خدا ہو گئے کیونکہ خدا کی روح ان میں حلول کر گئی تھی، اسی طرح بیانیہ کا گمان ہے کہ خدا کی روح انبیاء اور اماموں میں گردش کرتی رہی،

(۱) الفرق بین الفرق ص ۲۱۴-۲۱۷

والائمة حتى انتهت الى علي......
ثم حلت بعده في بيان بن سمعان
..... وكذالك الجناحية منهم
حلولية لدعواها روح الاله دارت
في علي واولاده ..... فكفرت
بدعواها حلول الاله في زعيمها
..... والشريعية والنميرية منهم
حلوليه لدعواها ان روح الاله
حلت في خمسة اشخاص النبي
وعلي وفاطمه والحسن
والحسين..... واما المقنعية كان
زعيمهم المعروف بالمقنع......
زعم لاتباعه انه هو الاله وانه قد
تصور مرة في صورة آدم ثم
تصور في وقت آخر بصورة نوح
..... ثم انه زعم انه في زمانه الذى
كان فيه قد تصور بصورة هشام
بن حكيم وكان اسمه هاشم بن
حكيم..... واما الحلمانية من
حلوليه..... انه كان يقول بحلول
الاله في الاشخاص الحسنة
وكان هو واصحابه اذا راوا
صورة حسنة سجدوا لها يوهمون
ان الاله قد حل فيها[1]

یہاں تک کہ حضرت علیؓ تک پہونچی......
پھر بیان بن سمعان میں حلول کرگئی......
اسی طرح جناحیہ ان میں سے حلولیہ ہیں، کیونکہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا کی روح حضرت علیؓ اور ان کی اولاد میں گردش کرتی رہی ..... پس انھوں نے یہ دعویٰ کرکے کہ اللہ تعالیٰ ان کے پیشوا میں حلول کرگیا، کفر کیا..... اور شریعیہ اور نمیریہ ان میں سے حلولی ہیں۔ کیونکہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا کی روح پانچ اشخاص یعنی نبی، علی، فاطمہ، حسن اور حسین میں حلول کرگئی..... اور مقنعیہ تو ان کا پیشوا ایک شخص مسمیٰ بالمقنع تھا...... اپنے پیروؤں کے لئے گمان کیا کرتا کہ وہ خدا ہے، اور یہ کہ ایک مرتبہ اس نے حضرت آدمؑ کی صورت اختیار کی، پھر دوسری مرتبہ حضرت نوحؑ کی..... پھر اس نے گمان کیا کہ اپنے زمانہ میں وہ ہشام بن حکیم کی صورت میں نمودار ہوا، اور اس کا نام ہاشم بن حکیم تھا...... اور حلمانیہ حلولیہ سے ہیں..... وہ کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی روح خوبصورت شخصوں میں حلول کرجاتی ہے اور وہ اور اس کے پیرو جب کسی اچھی صورت کو دیکھتے ہیں تو سجدہ کرتے اور یہ وہم کرتے کہ اللہ تعالیٰ اس میں حلول کرگیا ہے۔

(۱) الفرق بین الفرق ص ۲۴۱-۲۴۵

غالباً اس تصریح کے بعد تشبیہ اور حلول کا فرق معلوم ہو گیا ہوگا، مگر مسٹر مکارتھی نے اور اس کی تقلید میں بیدار صاحب نے ''اہل التشبیہ'' کو ''حلولیین'' بنا دیا۔

(۳) کتاب فی خلق الاعمال: معتزلہ اور قدریہ کے عقیدہ خلق اعمال کے رد میں۔(۱)

معتزلہ اور قدریہ اور عقیدہ خلقِ اعمال؟ یہ بھی ایک رہی اور اس پر امام اشعری کا رد گویا کہ وہ عقیدہ خلق اعمال کے منکر تھے، اصل میں ہے۔

والفنا كتاباً فى خلق الاعمال تقضنا فيه اعتلالات المعتزلة والقدرية فى خلق الاعمال وكشفنا عن تمويههم فى ذلك(۲)

ہم نے عقیدہ خلق اعمال کے اثبات میں ایک کتاب تصنیف کی جس میں معتزلہ اور قدریہ جو عقیدہ خلق اعمال کے خلاف دلائل قائم کیا کرتے تھے، اس کا رد کیا ہے، اس باب میں ان کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کیا ہے۔

یہ تو امام اشعری اپنی کتاب کا موضوع بتاتے ہیں، مگر مسٹر مکارتھی نے اس کو بالکل ہی الٹا کر دیا ہے، کہ معتزلہ وقدریہ عقیدہ خلق اعمال کے قائل تھے اور امام اشعری نے عقیدہ خلق اعمال کا رد کیا ہے۔

شرح المواقف میں ہے۔

فيكون فعل العبد مخلوقاً لله تعالى ابداعاً واحداثاً ومكسوبا للعبد.....وهذا مذهب الشيخ ابى الحسن الاشعرى.

پس بندہ کا فعل باعتبار ابداع واحداث (نو پیدا ساختن) اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہوگا اور بندے کا کسب کیا ہوا.....اور یہ شیخ ابوالحسن الاشعری کا مذہب ہے۔

اسی طرح امام عبدالکریم الشہرستانی نے الملل والنحل میں امام اشعری کے مسلک کے ضمن میں افعال عباد کے متعلق ان کا مذہب اس طرح نقل کیا ہے۔

وارادته واحدة قديمة ازلية متعلقة بجميع افعال عباده من حيث انها مخلوقة(۳)

اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ واحد ہے جو قدیم اور ازلی ہے اور جو متعلق ہے اس کے بندوں کے تمام افعال کے اس حیثیت سے کہ وہ افعال مخلوق ہیں۔

يسمى هذا الفعل كسبا فيكون

اس فعل کا نام کسب رکھا جاتا ہے پس یہ

(۱) معارف ص ۲۹۷ سطر ۶ (۲) تبیین ص ۱۲۹ سطر ۹۔۱۱ (۳) الملل والنحل للشہرستانی ج ۱ ص ۴۲

خلقاً من الله تعالیٰ ابداعاً واحداثاً و کسباً من العبد حصولا تحت[1] قدرته	فعل بحیثیت ابداع و احداث اللہ تعالیٰ کی جانب سے خلق کیا ہوا ہوتا ہے اور بندے کا کسب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت میں حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح امام عبدالقاہر البغدادی نے الفرق بین الفرق میں اشاعرہ کے مذہب کے متعلق لکھا ہے۔

انه (ای الله) خالق اکساب العباد ولا خالق غیر الله خلاف قول من زعم من القدریة ان الله تعالیٰ لم یخلق شیئا من اکساب العباد[2]	وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) بندوں کے افعال کا خالق ہے اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی خالق نہیں ہے، برخلاف قدریہ کے ایک گروہ کے قول کے جن کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے افعال میں سے کسی چیز کو پیدا نہیں کیا۔

اسی طرح امام رازی نے الاربعین فی اصول الدین میں فرمایا ہے۔

الفرقة الرابعة الذین یقولون لا تاثیر لقدرة العبد فی الفعل وفی صفة من صفات الفعل بل الله تعالیٰ یخلق الفعل و یخلق قدرة متعلقة بذلک الفعل ولاتاثیر لتلک القدرة البتة فی ذلک الفعل وهذا قول ابی الحسن الاشعری.[3]	فرقہ چہارم وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ بندے کی قدرت کی، فعل یا فعل کی صفات میں سے کسی صفت میں کوئی تاثیر نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ فعل کو پیدا کرتا ہے، اور اس سے متعلق جو قدرت ہوتی ہے اسے پیدا کرتا ہے اور اس قدرت کی اس فعل میں کوئی تاثیر نہیں ہے، اور یہ امام ابوالحسن الاشعری کا قول ہے۔

اور خود امام ابوالحسن الاشعری اپنی کتاب ''الابانہ عن اصول الدیانہ'' میں اپنا مذہب تحریر فرماتے ہیں کہ

وانه لا خالق الا الله وانّ اعمال	اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق نہیں ہے

(۱) الملل والنحل للشہرستانی ج ۱ ص ۹۳ (۲) الفرق بین الفرق ص ۳۲۷ (۳) الاربعین للامام الرازی ص ۲۲۸

العبد مخلوقة مقدرة كما قال: خلقكم وما تعملون(۱)

اور بندوں کے اعمال مخلوق ہیں مقدر ہیں جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو

اس کے برعکس معتزلہ قدریہ خود انسان کو اپنے افعال کا موجد سمجھتے تھے، شرح مواقف میں ہے۔

وقالت المعتزلة اى اكثرهم وهى (يعنى افعال العباد الاختيارية) واقعة بقدرة العبد وحدها على سبيل الاستقلال بلا ايجاب بل اختيار،

اور معتزلہ نے یعنی اکثر معتزلہ کہتے ہیں کہ وہ (یعنی بندوں کے اختیاری افعال) صرف بندوں کی قدرت سے واقع ہوتے ہیں استقلالاً بغیر کسی چیز کے واجب ولازم کئے ہوئے بلکہ اپنے ذاتی اختیار سے۔

اسی طرح امام عبدالقاہر البغدادی نے معتزلہ کے اصول میں لکھا ہے۔

ومنها قولهم جميعا بان الله تعالى غير خالق لاكساب الناس ولا بشيء من اعمال الحيوانات(۲)

اور معتزلہ کے مخصوص عقائد میں سے ان سب کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے کسی فعل کا پیدا کرنے والا نہیں ہے اور نہ ہی حیوانات کے اعمال میں سے کسی چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔

اسی طرح امام رازی نے المحصل میں لکھا ہے۔

وزعم الجمهور من المعتزلة ان العبد موجد لا على نعت الايجاب بل على صفة الاختيار(۳)

جمہور معتزلہ نے گمان کیا ہے کہ بندہ خود اپنے افعال کا پیدا کرنے والا ہے، اس طور پر نہیں کہ وہ ایسا کام کرنے پر مجبور ہو بلکہ اپنے ذاتی اختیار سے۔

اور خود امام اشعری نے الابانہ میں معتزلہ اور قدریہ کے متعلق لکھا ہے۔

(۱) الابانہ للامام الاشعری ص ۶ (۲) الفرق بین الفرق ص ۹۴ (۳) المحصل ص ۱۴۱

وزعموا انهم ينفردون بالقدرة على اعمالهم دون ربهم فاثبتوا لانفسهم الغنى عن الله عزوجل ووصفوا انفسهم بالقدرة على ما يصفون الله عزوجل بالقدرة عليه[1]	اور معتزلہ نے گمان کیا کہ وہ اپنے اعمال پر بغیر اپنے پروردگار کے قدرت رکھنے میں منفرد ہیں پس انھوں نے اپنی ذات کے واسطے اللہ تعالیٰ سے بے پروائی کو ثابت کیا اور اپنے نفس کو اس چیز پر قدرت رکھنے کے ساتھ متصف کیا جس پر قدرت کے ساتھ وہ اللہ عز وجل کی ذات کو متصف کرتے ہیں۔

ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ امام اشعری خلق اعمال کے قائل تھے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے اعمال کو خلق فرمایا ہے، یہی سلف صالحین کا عقیدہ تھا، چنانچہ امام بخاریؒ نے خلق افعال عباد کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی ہے، اس کے علاوہ اپنی ''صحیح'' میں متعدد آیات واحادیث کی توضیح کے لئے ابواب قائم کئے ہیں، جن کا مقصد فرقہ معتزلہ کا رد ہے، اہل سنت والجماعت کے مقابلے میں معتزلہ وقدریہ بندہ کو اپنے افعال کا موجد بالاستقلال مانتے تھے، اور اہل سنت کے موقف کے خلاف دلائل قائم کرتے تھے، چنانچہ ان کے دلائل کو قاضی عضدالدین الایجی نے مواقف کے موقف خامس مرصد سادس مقصد اول میں اور امام رازی نے المحصل (ص ۱۴۱-۱۴۴) میں اور اربعین (ص ۲۳۳-۲۳۷) میں بتفصیل بیان کیا ہے اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے، لیکن اس تفصیل وتبصرہ کا اکثر حصہ امام اشعری سے ماخوذ ہے جس کا کچھ حصہ انھوں نے ''الابانہ'' (ص ۵۶-۷۴) میں بیان کیا ہے۔

غرض امام اشعری سلف صالحین کی طرح خلق اعمال کے قائل تھے اور معتزلہ وقدریہ اس کے منکر اور امام صاحب نے اس کتاب میں منکرین کے دلائل کا رد کیا ہے، مگر مسٹر مکارتھی یہ سمجھے کہ معتزلہ وقدریہ خلق اعمال کے عقیدے کے معتقد تھے اور امام اشعری نے اس کتاب میں اس عقیدہ کا رد کیا ہے۔

(۴) کتاب کبیر فی استطاعت: اس میں استطاعت کے بارے میں معتزلہ کے دلائل رد کئے ہیں۔[2] اصل میں ہے۔

والفنا كتابا كبيرا فى الاستطاعة	ہم نے معتزلہ کے علی الرغم استطاعت

(۱) الابانہ ص ۴ (۲) معارف ص ۲۹۷ سطر ۷-۸

علی المعتزلة نقضنا فيه استدلالاتهم علی انها قبل الفعل ومسائلهم وجواباتهم۔ (۱)

کے موضوع پر ایک مبسوط کتاب تصنیف کی جس میں معتزلہ کے ان دلائل کا رد کیا ہے جو وہ ''الاستطاعت قبل الفعل'' پر قائم کیا کرتے ہیں اور اس میں ان کے سوالات ہیں اور ان کے جوابات ہیں۔

کیا یہ مفہوم اس گمراہ کن ترجمے سے ادا ہو جاتا ہے؟ کیا اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ معتزلہ استطاعت قبل الفعل کے قائل تھے، یا استطاعۃ مع الفعل کے اور اشاعرہ کا مسلک کیا ہے، اور انھوں نے کس بات کی تردید کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ''استطاعہ'' کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے، چنانچہ صرف اس مسئلے پر معتزلہ کے مذہب کو امام ابوالحسن الاشعری نے ''مقالات الاسلامیین'' جلد اول کے ص ۲۲۹ سے ص ۲۴۲ تک نقل کیا ہے، اس سلسلہ میں متعدد سوالات قائم ہوتے ہیں، لیکن ان میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ استطاعۃ فعل کے پہلے ہوا کرتی ہے یا بعد میں، ان دو شقوں میں سے معتزلہ نے پہلی شق کو اختیار کیا تھا اور اسی پر ان کا اجماع تھا، چنانچہ امام اشعری نے ''مقالات الاسلامیین'' میں لکھا ہے۔

واجمعت المعتزلة علی ان الاستطاعة قبل الفعل وهی قدرة عليه وعلی ضده وهی غير موجبة للفعل۔ (۲)

معتزلہ نے اس بات پر اجماع کیا ہے، کہ استطاعہ قبل فعل کے ہوا کرتی ہے، اور استطاعہ کے معنی فعل پر اور اس کی ضد پر قدرت کے ہیں اور استطاعت فعل کی موجب نہیں ہوا کرتی۔

اس کے مقابل اہل سنت والجماعت کا کہنا ہے کہ استطاعۃ فعل کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔

چنانچہ خود امام اشعری نے ''الابانہ'' میں لکھا ہے۔

وان احدا لا يستطيع ان يفعل شيئاً قبل ان يفعله (۳)

اور کوئی شخص کسی کام کو کرنے کی اس کے کرنے سے پہلے استطاعت نہیں رکھتا۔

اور یہی عامۂ اہل سنت والجماعت کا موقف ہے، عقائد نسفی میں ہے۔

والاستطاعة مع الفعل خلافا للمعتزلة

اور استطاعہ فعل کے ساتھ ہوا کرتی ہے بر خلاف معتزلہ کے عقیدے کے۔

(۱) تبیین ص ۱۲۹ سطر ۱۱۔۱۳ (۲) مقالات الاسلامیین ص ۲۳۰ (۳) الابانہ ص ۶

غرض اس مبسوط کتاب میں امام اشعری نے معتزلہ کے نظریہ کا کہ استطاعت فعل سے قبل ہوا کرتی ہے، رد کیا ہے، مگر مسٹر مکارتھی نے جو ترجمہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''استطاعۃ'' بھی ''المنزلۃ بین المنزلتین'' یا ''تولد'' کی قسم کا کوئی مسئلہ تھا، جو صرف معتزلہ کے ساتھ مختص تھا اور امام اشعری نے اس کا سرے سے انکار کر کے اس کا رد کیا ہے۔

۵- کتاب کبیر فی الصفات :- معتزلہ، جہمیہ اور دوسرے مخالفین کے رد میں ہے، علم قدرا ور دوسری صفات الٰہی کے سلسلہ میں ابوالہذیل، معمر، نظام اور فوطی کے رد میں اور عالم کو ازلی ماننے والوں کے رد میں اور اس بحث میں کہ خدا کا چہرہ ہے، اس کے ہاتھ ہیں اور وہ کرسی عرش پر قائم ہے۔ ''لمعہ ناسہی'' اور اس کے عقیدہ اسماء وصفات کی تردید بھی اس میں شامل ہے۔ (۱)

اصل میں ہے۔

''والفنا کتابا کبیرا فی الصفات تکلمنا علی اصناف المعتزلة والجهمية والمخالفين لنا فيها في نفيهم علم الله وقدرته وسائر صفاته وعلى ابى الهذيل ومعمر ونظام والفوطى وعلى من قال بقدم العالم وفي فنون كثيرة من فنون الصفات في اثبات الوجه لله واليدين وفي استوائه على العرش وعلى الناشي ومذهبه في الاسماء والصفات.'' (۲)

(ہم نے ایک مبسوط کتاب صفات باری سے متعلقہ مسائل میں تالیف کی جس میں ہم نے (۱) مختلف فرقہ ہائے معتزلہ وجہمیہ اور اسی طرح ان دوسرے لوگوں کا رد کیا ہے، جو صفات باری کے باب میں ہمارے مسلک کے خلاف مذہب رکھتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے علم قدرت اور دیگر صفات کی نفی کرتے ہیں۔ (۲) اور ابوالہذیل، معمر، نظام اور فوطی کا رد کیا ہے، اور اسی طرح ان لوگوں کا رد کیا ہے، جو قدم عالم کے قائل ہیں۔ (۳) اور صفات باری سے متعلقہ دوسرے بہت سے مسائل کی توضیح وتبیین کی ہے، مثلاً ہم نے

---

(۱) معارف ص ۲۹۷ سطر ۹-۱۲ (۲) تبیین ص ۱۲۹ سطر ۱۳-۱۷

اللہ تعالیٰ کی صفات الوجہ، الیدین اور الاستواء علی العرش ثابت کیا ہے۔

(۴) اور ''الناشی'' اور ''الاسماء والصفات'' کے باب میں اس نے مذہب کا رد کیا ہے۔''

لیکن کیا مکارتھی کی اس عبارت ''معتزلہ جہمیہ اور دوسرے مخالفین کے رد میں ہے، علم قدر اور دوسری صفات الٰہی کے سلسلہ میں۔'' سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ معتزلہ وجہمیہ اور دوسرے مخالفین اشاعرہ صفات باری کے منکر تھے، یا قائل؟ بلکہ ذہن تو اس بات کی جانب متبادر ہوتا ہے کہ معتزلہ وجہمیہ وغیرہ صفات باری کے قائل ہوں گے اور امام اشعری منکر، جبھی تو انھوں نے ان کا رد کیا ہے، جیسا کہ عبارت...... کے رد میں ہے، علم قدر اور دوسری صفات الٰہی کے سلسلہ میں۔'' سے معلوم ہوتا ہے، حالانکہ یہ منشاءِ عبارت اور نفس واقعہ کے خلاف ہے، چنانچہ معتزلہ کے متعلق امام عبدالقاہر البغدادی نے الفرق بین الفرق میں لکھا ہے:

ویجمعها كلها في بدعتها رای المعتزلة امور فلها نفيها كلها عن الله عزوجل صفاته الازليه وقولها بانه ليس لله عزوجل علم ولا قدرة ولا حياة ولاسمع ولا بصر ولاصفة ازلية.(۱)	اور تمام معتزلہ میں کچھ عقائد مشترک ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ سب لوگ اللہ عزوجل کی صفات ازلیہ کا انکار کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ نہ اللہ عزوجل کے واسطے علم ہے، نہ قدرت، نہ حیات، نہ سمع نہ بصر اور نہ کوئی ازلی صفت۔

اس کے مقابلہ میں اشعرہ کے متعلق شرح المواقف میں لکھا ہے:

ذهبت الاشاعرة الى ان له تعالى صفات موجودة قديمة زائدة على ذاته فهو عالم بعلم قادر بقدرة مريد بارادة.	اشاعرہ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، جو موجود ہیں قدیم ہیں، اور اس کی ذات پر زائد ہیں، پس وہ علم کے ساتھ عالم ہے اور قدرت کے ساتھ قادر ہے اور ارادہ کے ساتھ مرید ہے۔

دوسری چیز جو محل نظر ہے، وہ یہ ہے کہ تبیین میں ''قدرتہ'' کا لفظ ہے، اور مسٹر مکارتھی نے

(۱) الفرق بین الفرق ص ۹۳

اس کا ترجمہ ''قدر'' سے کیا ہے، حالانکہ قدرت اور قدر کے مفاہیم میں بڑا فرق ہے، قدرۃ کا ترجمہ قدرت ہونا چاہئے تھا، کیونکہ قدرۃ، باری تعالیٰ کی (Omnipotence) کا نام ہے، اور ''قدر'' (Preedestination) کا، چنانچہ شرح المواقف میں ''قدرت باری'' کی توضیح میں لکھا ہے:

المقصد الثاني في قدرته...... انه تعالى قادر اى يصح منه ايجاد العالم وتركه فليس شيء منهما لازم لذاته بحيث يستحيل انفكاكه	دوسرا مقصد قدرت باری تعالیٰ کے بیان میں.... اللہ تعالیٰ قادر ہے یعنی اس کے لئے عالم کا وجود میں لانا یا نہ لانا دونوں صحیح ہیں، ان دونوں میں سے کوئی بھی اس کے لئے اس طرح لازم نہیں ہے، کہ اس سے اس کا منفک ہونا ناممکن ہو۔

اس کے مقابلہ میں قدر (قضاء وقدر) کی توضیح میں لکھا ہے:

اعلم ان قضاء الله عند الاشاعرة هو ارادته الازلية المتعلقة بالاشياء على ما هي عليه فيما لايزال وقدره وايجاده اياها على قدر مخصوص وتقدير معين في ذواتها على احوالها واما عند الفلاسفة فالقضاء عبارة عن علمه لما ينبغي ان يكون عليه الوجود ...والقدر عبارة عن خروجها الى الوجود العينى باسبابها على الوجه الذى تقرر في القضاء .	جاننا چاہئے کہ قضاء باری سے اشاعرہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا ارادہ ازلیہ مراد ہے، جو اشیاء کے ساتھ متعلق ہوتا ہے، جن پر وہ ہمیشہ رہتی ہیں اور قدر سے مراد اللہ تعالیٰ کا اشیاء کا وجود میں لانا ہے، اس مخصوص انداز سے اور معین تقدیر پر جو ان کی ذوات میں ان کے احوال کے مطابق مضمر ہے، اور فلاسفہ کے نزدیک قضاء سے مراد اللہ تعالیٰ کا اس چیز کا علم ہے جو موجود ہونا چاہئے......اور قدر سے مراد اس چیز کا وجود عینی میں ان اسباب کے ساتھ آنا ہے، جو قضا میں مقرر ہو چکے ہیں۔

تیسری چیز جو یقیناً غلط ہے، وہ ''فی اثبات الوجه لله واليدين وفي استوائه على العرش'' کا لفظی ترجمہ خدا کا چہرہ ہے، اس کے ہاتھ ہیں، اور وہ کرسی عرش پر قائم ہے۔'' سے کرنا ہے

یہ ترجمہ تو فرقہ مشبہ کا موقف ہے، نہ کہ امام اشعری کا، وہ خدا کے لئے چہرہ، ہاتھ اور قیام علی العرش ثابت نہیں کرتے تھے، بلکہ الوجہ، الیدین اور الاستواء علی العرش کو صفات الٰہی مانتے تھے، مگر ان کی تاویل سے (جس کی ایک شکل موجودہ ترجمہ ہے) قطعاً بیزار تھے۔ چنانچہ شرح المواقف میں ہے۔

الوجه...... وهو كما قبله اعني الاستواء في عدم القاطع وعدم جواز التعويل على الظواهر اليد ...... فاثبت الشيخ الصفتين ثبوتيتين زائدتين على الذات وسائر الصفات لكن لا بمعنى الجارحتين.

وذهب الشيخ في احد قوليه الى انه اى الاستواء صفة زائدة ليست عائدة الى الصفات السابقة وان لم نعلمها بعينها ولم نقم عليه دليلاً ولا يجوز التعويل في اثباته على الظواهر من الآيات والاحاديث...... فالحق التوقف بانه ليس كاستواء الاجسام.

الوجہ...... اور وہ اپنے قبل یعنی الاستواء کی طرح ہے یعنی نہ تو کسی تاویل پر تیقن کے ساتھ اصرار کیا جائے گا اور نہ ظاہر معنی پر اس کا اعتماد جائز ہوگا، امام اشعری نے دو ثبوتی صفتیں ثابت کی ہیں، جو ذات اور اسی طرح دیگر صفات باری کے علاوہ ہیں لیکن ان کے معنی ہاتھ کے نہیں ہیں۔

شیخ کا ایک قول یہ ہے کہ الاستواء ایک صفت زائد ہے، جو سابق صفات کی طرف نہیں لوٹائی جاسکتی، اگرچہ ہم اس کی حقیقت کو نہ جانتے ہوں اور اس پر دلیل قائم نہ کرسکیں اور اس کے اثبات میں آیات و احادیث کے ظاہر معنی پر اعتماد جائز نہیں ہے...... پس حق یہ ہے کہ توقف کیا جائے کہ یہ الاستواء، اجسام کے استواء کی طرح نہیں ہے۔

امام اشعری کا یہ مسلک اسلاف اہل سنت والجماعت کے مسلک کے عین مطابق ہے جیسا کہ امام مالکؒ سے مروی ہے:

الاستواء معلوم والكيف مجهول والايمان به واجب والسؤال عنه بدعة.

الاستواء معلوم ہے۔ مگر اس کی کیفیت مجہول ہے، اس پر ایمان رکھنا واجب ہے، اور اس کی نوعیت دریافت کرنا بدعت ہے۔

اس لئے صحیح ترجمہ یہ ہونا چاہئے تھا۔

''الوجہ، الیدین اور الاستواء علی العرش کی صفات کے اثبات میں''

کیونکہ یہ کہنا کہ ''خدا کا چہرہ ہے، اس بات کے مترادف ہے کہ امام اشعری ''الوجہ'' کی تاویل حسب ظاہر چہرہ سے کرتے تھے، حالانکہ یہ تمام محققین کی تصریحات کے خلاف ہے۔

شرح المواقف کا قول اوپر مذکور ہوا کہ

عدم جواز التعویل علی الظواھر	ظاہر معانی پر اعتماد نا جائز ہے۔

اسی طرح یہ کہنا کہ ''اس کے ہاتھ ہیں'' اس بات کے مترادف ہے کہ امام اشعری الید کی تاویل ہاتھ سے کرتے تھے حالانکہ یہ محققین کی تصریحات کے خلاف ہے۔

شرح المواقف میں ہے۔

لکن لا بمعنی الجارحتین	لیکن جارحتین (ہاتھوں) کے معنی میں نہیں۔

اور اسی طرح یہ کہنا کہ ''وہ کرسی عرش پر قائم ہے''۔ امام اشعری کو فرقہ مشبہ میں شامل کرتا ہے، حالانکہ وہ اس سے بمراحل دور تھے، جیسا کہ محققین نے تصریح کی ہے، شرح المواقف میں ہے۔

والحق التوقف مع القطع بانہ لیس کاستواء الاجسام	مذہب حق اس بارے میں توقف ہے اس یقین کے ساتھ کہ وہ استواء اجسام کی طرح نہیں ہے۔

یعنی امام اشعری کم از کم اس بات کے قائل نہیں تھے کہ ''وہ کرسی عرش پر قائم ہے۔''

چوتھی چیز جو قطعاً سمجھ میں نہیں آتی، وہ مسٹر مکارتھی کے ترجمہ کا یہ فقرہ ہے۔

''لمعہ ناسھی''(۱)

خدا معلوم یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ اصل میں ہے۔

وعلی الناشی ومذھب فی الاسماء والصفات	اور الناشی اور الاسماء والصفات کے باب میں اس کے مذہب کا رد

(۱) معارف ص ۲۹۷ سطر ۱۲

الناشی امام اشعری کا ہم عصر اور مشہور معتزلی متکلم تھا، جس کا سنہ وفات ۲۹۳ھ ہے۔ اس کا نام ابوالعباس عبداللہ بن محمد تھا۔ فہرست ابن الندیم تکملہ (صفحہ ۵) پر اس کے تین شعر بھی نقل ہوئے ہیں۔ الواسطی اس کے علم کلام کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ چنانچہ ابن الندیم نے نفطویہ کے باب میں اس کا طنزیہ قول نقل کیا ہے۔

ومن ظریف قولہ فی نفطویہ انہ کان یقول من اراد ان یتناھی فی الجھل فلیتعرف الکلام علی مذھب الناشی والفقہ علی مذھب داؤد بن علی والنحو علی مذھب نفطویہ قال ونفطویہ یتعاطی الکلام علی مذھب الناشی۔[1]	اور واسطی کا ایک دلچسپ قول نفطویہ کے متعلق یہ ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ جو جہالت میں انتہا کو پہنچ جانا چاہتا ہے۔ اس کو چاہئے کہ علم کلام الناشی کے مذہب پر سیکھے اور فقہ داؤد بن علی کے مذہب پر اور نحو نفطویہ کے مذہب پر اور نفطویہ الناشی کے مذہب پر کلام سے بحث کیا کرتا تھا۔

امام اشعری نے الناشی کے مذہب کو ''مقالات الاسلامیین'' میں متعدد مقامات پر بیان کیا ہے، بالخصوص ''الاسماء والصفات'' کے باب میں، اس کے مذہب کو مقالات کی جلد ثانی کے صفحہ ۵۰۰، ۵۰۱ پر نقل کیا ہے۔

غرض الناشی مشاہیر معتزلہ میں سے تھا۔ لیکن مستشرقین کے استشراق اور تبحر علمی نے ''لمعہ ناشی'' کے ذریعہ اس کی گت بنادی۔

۷۔ کتاب کبیر ذکرنا فیہ اختلاف الناس فی الاسماء والاحکام والخاص والعام، گناہ کبیرہ کے مرتکب کے سلسلہ میں اسماء اور احکام۔[2]

''الاسماء والاحکام'' علم کلام کی ایک مستقل بحث ہے، چنانچہ شرح المواقف کے موقف ششم کا تیسرا مرصد اسی مبحث پر ہے۔

المرصد الثالث فی الاسماء الشرعیۃ المستعملۃ والاحکام۔

اسی طرح **المحصل للامام الرازی** کے **الرکن الرابع (فی السمعیات)** کی قسم ثالث ''الاسماء والاحکام'' پر ہے۔

القسم الثالث فی الاسماء والاحکام[3]

(۱) الفہرست لابن الندیم ص ۲۴۵ (۲) معارف ص ۲۹۷ سطر ۱۵-۱۶ (۳) المحصل للرازی ص ۱۷۴

شرح المواقف اور المحصل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ ''الاسماء والاحکام'' کے زیر عنوان صرف مرتکب کبیرہ ہی کی بحث نہیں ہوتی، بلکہ اور بحثیں بھی مذکور ہوتی ہیں، مثلاً شرح المواقف میں ''الاسماء والاحکام'' کے زیر عنوان چار مقاصد ہیں۔

المقصد الاول فی حقیقة الایمان المقصد الثانی فی ان الایمان هل یزید وینقص، المقصد الثالث فی الکفر.

پہلا مقصد ایمان کی حقیقت کے بارے میں، دوسرا مقصد اس بارے میں کہ آیا ایمان بڑھتا گھٹتا ہے، تیسرا مقصد کفر کے بیان میں۔

ظاہر ہے یہ تینوں بحثیں گناہ کبیرہ کے سلسلہ میں اسماء واحکام سے تعلق نہیں رکھتیں، صرف چوتھا مقصد مرتکب کبیرہ کے کے احکام کے سلسلہ میں ہے۔

المقصد الرابع فی ان مرتکب الکبیرة من اهل الصلوٰة

چوتھا مقصد اس بارے میں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان ہے۔

اسی طرح المحصل للرازی میں ''الاسماء والاحکام'' کے سلسلہ میں چار مسئلے بیان ہوئے ہیں، پہلا مسئلہ حقیقت ایمان کی توضیح میں ہے۔ دوسرا ایمان کی زیادتی ونقصان کے متعلق ہے، تیسرا مسئلہ اس بارے میں ہے کہ ''انا مومن انشاء الله '' کہنا کس صورت میں جائز ہے، اور چوتھا مسئلہ حقیقت کفر کی توضیح میں ہے، صرف پہلے مسئلہ کی تفریع کے طور پر مرتکب کبیرہ کے حکم میں جو اختلافات ہیں، ان کی تفصیل ایک ضمنی تنبیہ میں بیان ہوئی ہے۔

غرض مسٹر مکارتھی کا ترجمہ گمراہ کن بھی ہے اور ناقص بھی۔

''الاسماء والاحکام'' کے عنوان کی توضیح میر سید شریف نے شرح المواقف میں اس طرح کی ہے۔

المرصد الثالث فی الاسماء الشرعیة المستعملة فی اصول الدین کالایمان والکفر والمومن والکافر والمعتزلة یسمونها اسماء دینیة لاشرعیة تفرقة بینهما وبین الالفاظ المستعملة

تیسرا مرصد اسماء میں یعنی اسماء شرعیہ میں جو اصول دین میں مستعمل ہوتے ہیں، جیسے ایمان، کفر، مومن کافر وغیرہ اور معتزلہ انھیں (اسماء شرعیہ کے بجائے) اسماء دینیہ کہتے ہیں، تاکہ ان میں اور ان الفاظ میں جو فرعی احکام میں مستعمل

فی الاحکام الفرعیة والاحکام من ان الایمان هل یزید وینقص اولا ومن انه هل یثبت بین المومن والکافر واسطة اولا	ہوتے ہیں، امتیاز ہو سکے، اور احکام میں یعنی اس قسم کے مسائل میں کہ آیا ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں اور اس بات میں کہ آیا مومن اور کافر کے درمیان کوئی درمیانی واسطہ ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔

اس توضیح کا مقابلہ مسٹر مکارتھی کے ترجمہ سے کیجئے، تو ان مستشرقین کی وسعت معلومات اور تبحر علمی کا اندازہ ہو سکے گا۔

اس کتاب کے عنوان میں ایک فقرہ اور ہے ''الخاص والعام'' مگر محقق مستشرق نے اسے درخور اعتنا بھی نہیں سمجھا، بظاہر ''الخاص و العام'' اصول فقہ کی اصطلاحات ہیں، لیکن یہ کلامی اصطلاح بھی ہے، اور کلامی بحثوں میں اس کا ایک مستقل مفہوم ہے، چنانچہ مختلف فرقوں نے ''الخاص والعام'' کے سلسلہ میں جو مواقف اختیار کیے ہیں، امام اشعری نے مقالات الاسلامیین میں ان کی وضاحت کی ہے، مثلاً جلد اول کے صفحہ ۱۴۴۔۱۴۸ پر مرجیہ کے اختلافات فی العام والخاص کو بیان کیا ہے۔

واختلفت المرجئة فی الاخبار اذا وردت من قبل الله سبحانه وظاهرها العموم علی سبع فرق	اور اخبار جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئیں اور ان کا ظاہر عموم کو مقتضی ہو، تو مرجیہ نے ان کے بارے میں اختلاف کیا ہے، اور اس طرح ان کے سات فرقے ہیں۔

اسی طرح صفحہ ۲۷۶۔۲۷۷ پر معتزلہ کے اختلافات فی الخاص والعام کو نقل کیا ہے۔

واختلفوا اذا سمع السامع الخبر الذی ظاهره العموم ولم یکن فی العقل ما یخصصه ما الذی علیه فی ذلک، علی مقالتین	جب کہ سننے والا ایسی خبر سنے جس کا ظاہر عموم پر دلالت کرے اور عقل میں کوئی ایسی چیز نہ ہو، جو اس کی تخصیص کر سکے، تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ اس بارے میں معتزلہ کے دو قول ہیں۔

اس طرح مقالات الاسلامیین کی جلد ثانی میں الخاص والعام کے باب میں فرق اسلامیہ

کے اختلافات کو صفحہ ۴۴۵ پر بالاختصار ذکر کیا ہے۔

واختلفوا فی الخاص والعام — اور خاص اور عام کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔

''الاسماء والاحکام'' کے مباحث کے ساتھ ''الخاص والعام'' کی بحث کو یکجائی طور پر بیان کرنے کی یہ وجہ تھی، کہ جب بعض آیات گناہ کبیرہ کی وعید میں وارد پائی گئیں تو سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا ان آیات کو ان کے ظاہر عموم پر محمول کیا جائے، یا اس میں استثنا کی بھی گنجائش ہے، تا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ کے ساتھ ان کا محمل ہم آہنگ ہو سکے، فرقہ مرجئیہ کا عموماً شق ثانی کی طرف رجحان تھا اور معتزلہ کا شق اول کی طرف، بہر حال اس طرح ''الاسماء والاحکام'' کے مباحث میں ''الخاص والعام'' کی ابحاث بھی بطور ضمیمہ شامل کر دی گئیں۔ یہ ہے حقیقت ''الاسماء والاحکام اور الخاص والعام'' کی۔ لیکن حضرات مستشرقین نے اسے صرف گناہ کبیرہ کے مرتکب کے سلسلہ میں اسماء واحکام لکھ کر اپنے ذوق تحقیق ومنصب استشراق کو ادا کر دیا۔

۱۶۔ کتاب کبیر: الاصول کے رد میں محمد بن عبدالوہاب الجبائی کے رد میں، معتزلہ کے عقائد کے بیان اور اس کے رد میں، معتزلہ کے ہر اس مسئلہ کے رد میں جس میں ہمارا ان کا اختلاف ہے۔(۱) اصل میں ہے۔

الفنا کتابا کبیرا نقضنا فیه الکتاب المعروف بالاصول علی محمد بن عبدالوهاب الجبائی کشفنا عن تمویهه فی سائر الابواب التی تکلم فیها من اصول المعتزلة وذکرنا للمعتزلة من الحجج فی ذلک بما لم یات به ونقضناه بحجج الله الزاهرة وبراهینه الباهرة یاتی کلامنا علیه فی نقضه فی جمیع مسائل المعتزلة واجوبتها فی الفنون التی اختلفنا نحن وهم فیها (۲)

یعنی ہم نے ایک مبسوط کتاب تصنیف کی جس میں ہم نے (اپنے سابق استاد مشہور معتزلی

(۱) معارف ص ۲۹۸ سطر ۸-۱۰ (۲) تبیین ص ۱۳۰ سطر ۱۲-۱۷

متکلم) محمد بن عبدالوہاب الجبائی کی مشہور کتاب الاصول کا رد کیا ہے۔ اور اس میں الجبائی کی ان تمام فریب کاریوں کا پردہ چاک کیا ہے جو اس نے (مذہب) معتزلہ کے اصول خمسہ کی توضیح و تائید کے سلسلہ میں مختلف ابواب میں ذکر کی ہیں۔

(ii) (اسی کے ساتھ) ہم نے معتزلہ کی ان حجج و براہین کو بھی نقل کیا ہے (جو وہ اپنے اصول کی تائید و تشید میں عموماً بیان کرتے ہیں، مگر) جو الجبائی کی الاصول میں سے بیان ہونے سے رہ گئی ہیں، (اور چونکہ وہ خود عرصہ تک معتزلی رہ چکے تھے، اور ان کے دلائل و براہین سے واقف تھے، اس لئے ان کا اتماماً للحجۃ اس کتاب میں ذکر کر دیا ہے، تاکہ معتزلہ کے پاس اب کوئی حجت نہ رہے۔

(iii) ہم نے اللہ تعالیٰ کی روشن حجتوں اور چمک دار برہانوں سے ان کا (معتزلہ کے دلائل کا) رد کیا ہے۔

(iv) فنون (مباحث) کلام کے مختلف ابواب جن میں ہمارا اور معتزلہ کا اختلاف ہے۔ معتزلہ کے تمام مسائل اور ان کے جوابات (یعنی ان مسائل مختلف فیہا میں معتزلہ نے جو مواقف اختیار کئے ہیں اور جن کے اثبات و تائید کی الجبائی نے کوشش کی ہے) کے سلسلہ میں اس کتاب میں ہم اس (الجبائی) پر کلام وارد کرتے ہیں۔"

امام اشعری کی یہ کتاب (نقض اصول الجبائی) تقریباً چالیس اجزاء پر مشتمل تھی، اسے ابونصر الکوازی نے امام اشعری کی دوسری کتابوں کے ساتھ ساتھ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ سے نقل کیا تھا اور الکوازی کے نسخہ سے ابن فورک نے نقل کیا تھا، تبیین میں ہے۔

وعن صحبه ابو نصر الكوازى بشيراز فانه قصد ونسخ فيه كثيرا من كتبه منها كتابه فى النقض على الجبائى فى الاصول يشتمل على نحو من اربعين جزء نسخت انا (یعنی ابن فورک) من كتابه الذى نسخه من نسخة الشيخ ابى الحسن بالبصرة.(۱)

(۱۷) کتاب کبیر۔ نقد تاویل الادلہ کے رد میں، البلخی کے رد میں معتزلہ کے اصول (۲) میں۔ اصل میں ہے۔

الفنا كتابا كبيرا نقضنا فيه الكتاب المعروف بنقض

(۱) تبیین ص ۱۲۸ (۲) معارف ص ۲۹۸ سطر ۱۱

تاویل الادلة علی البلخی فی اصول المعتزلة وبینا عن شبهته التی اوردها بادلة الله الواضحة واعلامه اللائحة وضممنا الی ذلک نقض ما ذکره من الکلام فی الصفات فی عیون المسائل والجوابات (۱)

(i) ہم نے ایک مبسوط کتاب تصنیف کی جس میں ہم نے ابوالقاسم الکعبی البلخی کی مشہور کتاب ''نقض تاویل الادلہ'' کا جو معتزلہ کے اصول مذہب میں ہے، رد کیا ہے۔

(ii) اور اس میں ہم نے ان شبہات کو جنھیں البلخی نے اس کتاب میں وارد کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی واضح حجتوں اور روشن نشانیوں کے ساتھ کھول کر بیان کیا ہے۔

(iii) اس کے علاوہ البلخی نے اپنی کتاب عیون المسائل نیز اپنے جوابات میں جو موقف صفات باری کے بارہ میں اختیار کیا ہے، ہم نے اس کا رد بھی بطور ضمیمہ کے اصل کتاب کے رد کے آخر میں بڑھا دیا ہے۔

اس کے بعد تبیین کذب المفتری کی محررۂ بالا تصریحات کا مسٹر مکارتھی کے ترجمہ سے موازنہ کر کے قارئین کرام مستشرقین کی تحقیق کی داد دیں۔ دو باتیں قابل غور ہیں۔

(i) نقض تاویل الادلہ، ابوالقاسم، الکعبی، البلخی ہی کی کتاب کا نام ہے۔

(ii) الکعبی البلخی کی کتاب کا نام ''نقض تاویل الادلہ'' ہے، نہ کہ نقد تاویل الادلہ''، جیسا کہ بیدار صاحب نے مسٹر مکارتھی سے نقل کیا ہے۔

(iii) امام اشعری کی اس کتاب میں اصل (نقض تاویل الادلہ کے رد) کے علاوہ ایک ضمیمہ بھی ہے، یعنی الکعبی البلخی کی ''عیون المسائل'' اور ''الجوابات'' (فتاوے کلامیہ) کا رد، مگر مسٹر مکارتھی یا تو اس کو سمجھ نہ سکے یا نظر انداز کر گئے۔

۱۹۔ کتاب جمل المقالات: ملاحدہ اور نام نہاد اہل التوحید کے رد میں۔ (۲)

اصل میں ہے۔

والفنا کتابا فی جمل مقالات الملحدین وجمل اقاویل الموحدین سمیناه کتاب جمل	ہم نے ملاحدہ اور اہل توحید کے جملہ مقالات (مذہبی اقوال و دینی عقائد) کی تبیین و توضیح پر ایک کتاب لکھی، جس کا

(۱) تبیین ص ۱۳۰ سطر ۱۷-۲۰ (۲) معارف ص ۲۹۸ سطر ۱۴

المقالات(۱) نام جمل المقالات رکھا۔

معلوم نہیں مسٹر مکارتھی نے ''اہل التوحید'' سے پہلے ''نام نہاد'' کا اضافہ کس طرح کر دیا۔ اصل میں تو کوئی لفظ اس اضافہ کی جانب اشارہ کرنے والا نہیں ہے۔

اس سے زیادہ یہ کہ اسی کتاب کا موضوع محض نقل مذاہب ہے نہ کی ان کی تردید، جیسا کہ مسٹر مکارتھی کے محررۂ بالا ترجمے سے معلوم ہوتا ہے۔

۲۰۔ کتاب الجوابات في الصفات عن مسائل اهل الزيغ والشبهات، یہ ایک ضخیم کتاب ہے، جو ہم نے خود اپنی کتاب کے رد میں لکھی ہے، جو کبھی معتزلہ کی حمایت میں لکھی تھی، معتزلہ کی حمایت میں اب تک ایسی کتاب نہیں لکھی گئی، مگر اب خدا نے ہمیں صحیح راستہ دکھایا اور ہمیں اس کی تردید کے قابل کیا۔(۲)

خود مسٹر مکارتھی کو اعتراف ہے کہ ایک کتاب امام اشعری نے اپنے زمانۂ اعتزال میں لکھی تھی، اور دوسری اعتزال سے تائب ہونے کے بعد، اس کے رد میں، اس طرح اس سے ان کی دو تصنیفات کا پتہ چلتا ہے، مگر مسٹر مکارتھی نے اسے ایک ہی سمجھا ہے۔

۲۱۔ کتاب علی بن الراوندی. صفات اور قرآن کے موضوع پر(۳)۔ لیکن اس سے کتاب کے موضوع کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ کیا اچھا ہوتا کہ مسٹر مکارتھی، ابن الراوندی کی علمی زندگی کا مطالعہ کر لیتے۔

واقعہ یہ ہے کہ ابن الراوندی تیسری صدی ہجری کا ایک بڑا ملحد اور کرایہ کا مناظر تھا، جب اسے اپنے علم وفضل کی قیمت نہیں ملی تو دوسرے فرقوں کی خاطر اس نے اسلام کے خلاف کتابیں لکھنا شروع کیں، اور ان سے روپیہ وصول کیا، مثلاً شیعوں کے حسب منشا کتاب الامامۃ لکھی، اور ان سے تیس دینار حق تصنیف وصول کئے، اس نے حسب تصریح ابن خلکان ایک سو چودہ کتابیں لکھیں، ان میں سے کم وبیش انیس کتابوں کے نام آج معلوم ہیں، لیکن موضوع زیر بحث کے لئے مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

الف۔ کتاب خلق قرآن:۔ یہ ابن الراوندی کی اس زمانہ کی تصنیف ہے جبکہ وہ معتزلی المذہب تھا، اس کے نام سے ظاہر ہے کہ اس کا موضوع ''خلق قرآن'' تھا، جو معتزلہ کا متفقہ مسئلہ ہے۔(۴)

(۱) تبیین ص ۱۳۱ سطر ۱-۳ (۲) معارف ص ۲۹۸ سطر ۱۵-۱۷ (۳) ایضاً سطر ۱۸ (۴) الفہرست تکملہ ص ۵

ب۔ کتاب الدامغ فی الرد علی القرآن:۔اس کے متعلق ابن الندیم نے لکھا ہے۔

كتاب يطعن فيه على نظم القرآن(۱)	ایسی کتاب جس میں نظم قرآن پر اعتراض کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا رد ابوعلی الجبائی اور ابوالقاسم البلخی نے کیا تھا۔خود ابن الراوندی نے بھی بعد میں اس کا رد لکھا ہے۔

ج۔ کتاب القضیب للذہب:۔اس میں ابن الراوندی نے ثابت کیا ہے کہ علم باری تعالیٰ محدث ہے،فہرست ابن الندیم میں ہے۔

كتاب القضيب للذهب وهو الذي يثبت فيه ان علم الله تعالى بالأشياء محدث وانه كان غير عالم حتى خلق لنفسه علما تعالى الله.(۲)	کتاب القضیب الذہب وہ کتاب ہے، جس میں وہ ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اشیاء حادث ہے،اور یہ کہ وہ غیر عالم تھا،یہاں تک کہ اس نے اپنے واسطے علم کو پیدا کیا،تعالیٰ اللہ!

یہ ہیں ابن الراوندی کے الحادات،معاہدۃ التعصیص میں محاسن خراسان لابی القاسم الکعبی البلخی کے حوالہ سے ابن الراوندی کے الحاد وزندقہ کے ضمن میں نقل کیا ہے۔

فما قاله فيه لعنه الله وابعده انا نجد في كلام اكثم بن صيفي شيأء احسن من انا اعطيناك الكوثر	ان چیزوں میں سے جو اس ملعون نے اس کتاب میں کہی ہیں۔ یہ ہے کہ ہم اکثم بن صیفی کے کلام میں ایسی چیزیں پاتے ہیں جو انا اعطیناک الکوثر سے بھی زیادہ اچھی ہیں۔

ان کفریات کے رد کو متکلمین وقت نے اپنے مسائی علمیہ کا موضوع بنایا اور امام اشعری نے بھی اس فرض منصبی کو باحسن وجوہ انجام دیا۔ چنانچہ انھوں نے ابن الراوندی کے رد میں متعدد کتابیں لکھیں،جن میں سے ''کتاب التاج'' کے رد میں دو کتابیں ہیں ایک کتاب الفصول کے ضمن میں (مسٹر مکارتھی کی فہرست نمبرا) اور دوسری نقض کتاب التاج (مسٹر مکارتھی کی فہرست میں نمبر۸۳) لیکن زیر بحث کتاب میں امام اشعری نے ابن الراوندی کے ان ہفوات کا رد کیا ہے،جو

(۱) الفہرست تکملہ ص۵ (۲) ایضاً ص۵

اس نے قرآن کے مخلوق ہونے کی تائید میں لکھے تھے، نیز کتاب الدامغ میں نظم قرآن کے معجز ہونے پر اس نے جو طعن کیا ہے۔ اور صفات باری بالخصوص علم باری تعالیٰ کے سلسلہ میں اس نے اباطیل کا جو انبار لگا دیا ہے۔ زیر بحث کتاب میں ان سب کا رد ہے۔

۲۳۔ القامع لکتاب الخالدی فی الارادہ:- خالدی کی کتاب کے رد میں جس میں اس نے لکھا ہے کہ آغاز تو خدا کے ہاتھ میں ہے، مگر بہت سی چیزیں خدا کے ارادہ کے خلاف ہوتی ہیں اور اکثر نہیں ہوتیں۔ (۱)

۲۷۔ خالدی کی اس کتاب کے رد میں جس میں اس نے انکار کیا ہے کہ ارادہ اور عمل خدا کی طرف سے ہیں۔ (۲)

ان دونوں عبارتوں میں تناقض ہے، پہلی میں اقرار ہے، کہ "آغاز تو خدا کے ہاتھ میں ہے" دوسری میں اس بات کا انکار ہے کہ "ارادہ اور عمل خدا کی طرف سے ہیں۔"

اصل میں ہے۔

(الف) الفنا کتابا نقضنا به کتاباً للخالدی فی اثبات حدث ارادة الله تعالی وانه شاء مالم یکن وکان مالم یشاء واوضحنا بطلان قوله فی ذلک وسمیناه القامع لکتاب الخالدی فی الارادة. (۳)	(الف) ہم نے ایک کتاب تصنیف کی جس میں خالدی کی اس کتاب کا رد کیا ہے، جو اس نے ارادۂ باری تعالیٰ کے حادث ہونے کے ثبوت میں لکھی تھی اور یہ ثابت کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا وہ واقع نہیں ہوا، اور وہ ہوا جو اس نے نہیں چاہا تھا۔ اور ہم نے اس کتاب میں اس کے قول کے باطل ہونے کی وضاحت کی، اور اس کا نام القامع لکتاب الخالدی فی الارادۃ تھا۔
(ب) والفنا علی الخالدی کتابا نقضنا فیه کتابا الفه فی خلق الاعمال وتقدیرها عن رب العالمین. (۴)	(ب) خالدی کے رد میں ہم نے ایک کتاب تصنیف کی جس میں اس کی اس کتاب کا رد کیا ہے جو اس نے اس بات کے انکار میں لکھی تھی کہ بندوں کے

(۱) معارف ص ۲۹۹ سطر ۲-۴ (۲) ایضاً سطر ۸ (۳) تبیین ص ۱۳۱ سطر ۹-۱۱ (۴) تبیین سطر ۱۳-۱۴

افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ہیں
اور اللہ تعالیٰ ہی نے ان کا اندازہ مقرر
فرمایا ہے۔

تمیین کی ان توضیحات کا مسٹر مکارتھی کے بیان سے موازنہ کیجیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ انھوں نے ان کتابوں کے موضوع کو کہاں تک سمجھا ہے۔

خالدی کی کتابیں اس عہد کے جمہور معتزلہ کے انداز فکر پر تھیں، جو خلق اعمال کے منکر تھے، اسی موضوع پر خالدی نے اپنی دوسری کتاب **فی نفی خلق الاعمال وتقدیرھا عن رب العالمین** کو تصنیف کیا اور چونکہ امام اشعری خلق اعمال کے معتقد و مؤید تھے لہٰذا انھوں نے اس کتاب کا رد لکھا۔

''ارادہ'' باری تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ میں سے ہے لیکن مختلف متکلمین نے اس کی ماہیت میں مختلف مسلک اختیار کیے تھے۔ چنانچہ ابوعلی الجبائی اور اس کا لڑکا ابوہاشم وغیرہ ارادۂ باری کے حادث ہونے کے قائل تھے، امام رازی نے الاربعین میں لکھا ہے۔

اعلم ان المفھوم من کونہ تعالی مریداً...... اما ان یکون محدثا وعلی ھذا التقدیر فھذہ الارادۃ المحدثۃ...... موجودۃ لا فی محل و ھو قول ابی علی وابی ھاشم وعبد الجبار بن احمد(۱)	جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے مرید ہونے کا مطلب ...... یا تو یہ ہے کہ وہ حادث ہے اور اس تقدیر پر وہ حادث ارادہ موجود ہوگا، مگر کسی محل میں نہیں اور یہ ابوعلی، ابی ہاشم اور عبدالجبار ابن احمد کا مذہب ہے۔

اسی طرح جمہور معتزلہ کا مسلک یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کا خالق نہیں ہے کیونکہ بندے اکثر اس کے خلاف مرضی گناہ کرتے ہیں، حالانکہ وہ چاہتا ہے کہ وہ نیک کام کریں تو گویا کبھی وہ ایسی بات چاہتا ہے، جو واقع نہیں ہوتی اور کبھی وہ بات ہوتی ہے جو وہ نہیں چاہتا۔

انہ شاء مالم یکن و کان مالم یشاء	اس نے وہ چیز چاہی جو واقع نہیں ہوئی اور وہ واقع ہوا جو اس نے نہیں چاہا۔

جمہور معتزلہ کے اسی مذہب کو امام اشعری نے مقالات الاسلامیین میں لکھا ہے۔

(۱) الاربعین ص ۳۵۷

وزعمت المعتزلة كلها غير ابي موسى المزوار انه لا يجوز ان يكون الله سبحانه مريدا للمعاصي على وجه في الوجوه ان يكون موجودا ولا يجوز ان يامر بما لا يريد ان يكون وان ينهي عما يريد كونه وان الله سبحانه قد اراد مالم يكن وكان ما لم يرد(۱)	اور تمام معتزلہ نے بجز ابی موسیٰ المزوار کے گمان کیا ہے کہ کسی نہج سے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کا ارادہ کرنے والا ہو (یعنی بندے جو گناہ کرتے ہیں ، اللہ تعالیٰ کو اس کا ارادہ کرنے والا نہیں ٹھہرایا جا سکتا) اور نہ یہ جائز ہے کہ اس چیز کا حکم دے جس کو وہ نہیں چاہتا، کہ وہ واقع ہو اور اس چیز سے منع کرے جس کا ہونا وہ نہیں چاہتا، اور اللہ تعالیٰ نے وہ چیز چاہی جو واقع نہیں ہوئی اور وہ واقع ہوا جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا۔
وكل المعتزلة الا الفضيلية اصحاب فضل الرقاشي يقولون ان الله سبحانه يريد امرا ولا يكون وانه يكون مالايريد. (۲)	اور تمام معتزلہ سوائے فضیلیہ کے جو فضل الرقاشی کے متبع ہیں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک بات کو چاہتا ہے اور وہ واقع نہیں ہوتی، اور ایسی بات واقع ہوتی ہے جس کا وہ ارادہ نہیں کرتا۔

ارادۂ باری تعالیٰ کے باب میں جمہور معتزلہ کے ان ہی مذاہب کو (یعنی حدوث ارادۂ باری تعالیٰ اور ان الله يريد امرا ولايكون ويكون مالايريد) خالدی نے اختیار کیا، اور ان کی تائید و تثبیت کے لئے ایک کتاب (کتاب نمبر ۲۳ مندرجہ فہرست مکارتھی) لکھی جس کے رد میں امام اشعری نے ''القامع لکتاب الخالدی فی الارادۃ'' تصنیف فرمائی۔

مگر مسٹر مکارتھی نے جو تراجم کئے ہیں وہ نہ صرف مبہم بلکہ گمراہ کن اور ایک دوسرے کے ساتھ متناقض ہیں۔

(۱) مقالات الاسلامیین ج ۲ ص ۵۱۲، (۲) ایضاً ص ۵۱۴

۲۴۔الدافع للمہذب:- خالدی کی مہذب کے رد میں ۔(۱)

مگر اس سے کتاب کا موضوع متعین نہیں ہوتا۔اصل میں ہے۔

الفنا كتابا نقضنا فيه كتابا للخالدي في المقالات سماه المهذب سمينا نقضه فيما نخالفه فيه من كتابه (الدافع للمهذب)(۲)	ہم نے ایک کتاب تصنیف کی جس میں خالدی کی کتاب ''المہذب'' کا جو اس نے مقالات میں لکھی تھی ، رد کیا ہے اور اس رد کا نام ہم نے ''الدافع للمہذب'' رکھا ہے۔

مقالات سے مراد مختلف فرقوں کے اقوال و مذاہب کی دائرۃ المعارف یا انسائیکلو پیڈیا ہے جیسے خود امام اشعری کی ''مقالات المسلمین'' (یا مقالات الاسلامیین و اختلاف المصلیین نشر کردہ ریٹر) جمل المقالات اور کتاب ''مقالات الفلاسفه خاصه'' اسی عہد میں ابوالقاسم الکعبی البلخی نے بھی ''مقالات'' مرتب کی ، ادھر امام ابومنصور الماتریدی نے ''مقالات'' مرتب کی ، امام اشعری نے سے پہلے زرقان نے مقالات پر کتاب لکھی تھی جس کا حوالہ امام صاحب اکثر مقالات الاسلامیین میں دیتے ہیں اور لوگوں نے بھی اس موضوع پر کتابیں تصنیف کی تھیں ، ان میں سے الخالدی نے بھی ایک کتاب بنام ''المہذب'' مقالات پر تصنیف کی ، امام اشعری نے اس کے جن حصص سے اختلاف کیا ، اس کے رد میں ''الدافع للمہذب'' لکھی۔

۲۶۔بلخی کی اس کتاب کے رد میں جس میں اس نے ابن الراوندی کی غلطیاں دکھائی ہیں۔(۳)

یہ ترجمہ بھی مبہم اور گمراہ کن ہے ، اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون بلخی اور ابن الراوندی کی کونسی کتاب مراد ہے۔اصل میں ہے۔

و الفنا كتابا نقضنا به على البلخي كتابا ذكر انه اصلح به غلط ابن الراوندي في الجدل(۴)	ہم نے البلخی کے خلاف ایک کتاب لکھی جس میں اس کی اس کتاب کا رد کیا جس کے متعلق اس نے ذکر کیا کہ اس نے اس میں ابن الراوندی کی ان غلطیوں کی

(۱) معارف ص ۲۹۹ ، سطر ۵ (۲) تبیین ص ۱۳۱ ، سطر ۱۲-۱۳ (۳) معارف ص ۲۹۹ ، سطر ۷ (۴) تبیین ص ۱۳۱

کی اصلاح کی ہے جو اس نے علم الجدل میں کی تھیں۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ابن الراوندی تیسری ہجری کا بہت بڑا ملحد اور جید عالم تھا، ابن خلکان نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

ابو الحسين احمد بن يحيى بن اسحاق الراوندى العالم المشهور له مقالة في علم الكلام وكان من الفضلاء في عصره وله من الكتب المصنفة نحو من مأته واربعة عشر كتابا (۲)	ابوالحسین احمد بن یحییٰ ابن اسحاق الراوندی ایک مشہور عالم تھا جو علم کلام میں ایک منفرد مذہب رکھتا تھا، اپنے زمانہ کے فضلا میں سے تھا، اس کی مصنفہ کتابوں کی تعداد ایک سو چودہ کے قریب ہے۔

خود ابوالقاسم الکعبی البلخی نے "محاسن خراسان" میں اس کے علم وفضل کے متعلق لکھا ہے۔

قال ابو القاسم الكعبى البلخى في كتاب محاسن خراسان' ابو الحسين احمد بن يحيى بن محمد بن اسحاق الراوندى من اهل مرو الروذ ولم يكن في نظرائه في زمنه احذق منه بالكلام والا اعرف بدقيقه وجليله	ابوالقاسم الکعبی البلخی نے کتاب محاسن خراسان میں لکھا ہے کہ ابوالحسین احمد بن یحییٰ بن محمد بن اسحاق الراوندی میں مرو الروذ کا رہنے والا تھا، اس کے زمانہ میں اس کے ہم سروں میں کوئی علم کلام میں اس سے زیادہ حاذق اور علم کلام کے دقیق اور جلیل مسائل کا جاننے والا نہ تھا۔

اس ابن الراوندی نے مختلف علوم وفنون پر کتابیں لکھیں، اس ضمن میں اس نے علم الجدل پر بھی ایک کتاب لکھی تھی، جو منطق کی وہ شاخ ہے جسے یونانی زبان میں طوبیقا (Topica) کہتے تھے، اس موضوع پر بعض متکلمین وفلاسفۂ اسلام مثلاً احمد بن الطیب سرخسی، الفارابی اور خود امام اشعری نے بھی کتابیں لکھی تھیں، ابن الراوندی کی مختلف کتابوں کا رد ابو علی الجبائی، ابوالحسین الخیاط

(۱) تبیین ص ۱۳۱ (۲) وفیات الاعیان ابن خلکان

اور ابوالقاسم البلخی نے کیا، ان میں سے الخیاط کی کتاب ''الانتصار'' جو اس نے ابن الراوندی کی کتاب ''فضیحة المعتزلة'' کے رد میں لکھی تھی، نیبرگ کے اعتنا سے چھپ گئی ہے۔

بہر حال ابوالقاسم الکلبی البلخی نے ایک کتاب میں ابن الراوندی کی کتاب الجدل کی، اغلاط کی اصلاح کی، لیکن یہ اصلاح بجائے خود سقیم تھی، لہٰذا امام ابوالحسن اشعری نے اس نام نہاد اصلاح کا رد لکھا اور یہی زیر بحث کتاب ہے۔

(۲۸) کتاب الاستشهاد: جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ معتزلہ کے دلائل سے خدا کا علم، قدرت اور دوسری صفات ثابت ہوتی ہیں۔[۱]

یہ ترجمہ گمراہ کن حد تک مبہم ہے اصل میں ہے۔

الفنا كتابا في الاستشهاد ارينا فيه كيف يلزم المعتزلة على محجتهم في الاستشهاد بالشاهد على الغائب ان يثبتوا علم الله وقدرته وسائر صفاته[۲]	ہم نے اصول استشہاد کے باب میں ایک کتاب تالیف کی جس میں ہم نے یہ دکھایا ہے کہ معتزلہ جو شاہد سے غائب پر استدلال و استشہاد کیا کرتے ہیں ان کے اس استدلال سے خود ان پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت اور دیگر صفات کا اثبات کریں (حالانکہ وہ ان کے منکر ہیں)

یہ ہے اصول استشہاد کی حقیقت اور اس کی افادیت کے متعلق امام اشعری اور ان کے متبعین کا موقف، مگر مسٹر مکارتھی کے ترجمے سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام اشعری نے کوئی کتاب لکھی تھی، جسے ایک رنگین عنوان سے معنون کرنے کے لئے کتاب الاستشہاد کا نام دیا تھا، نیز معتزلہ جو دلائل دیتے تھے، اس سے خود صفاتِ باری کا اثبات ہوتا ہے۔

لیکن یہ واقعہ نہیں ہے، بلکہ ''استشہاد'' دیگر منطقی اعمال کی طرح ایک خاص انداز استدلال کا نام تھا، جسے عموماً قیاس الغائب علی الشاہد کہتے تھے اور جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے لئے (جو حواس سے غائب ہے) جب کوئی حکم ثابت کرنا چاہتے تھے، تو اس کو ممکنات پر (جو مشہود ہیں) قیاس کیا کرتے تھے کہ چونکہ یہ حکم شاہد کے لئے ثابت ہے اس لئے غائب کے لئے بھی ثابت ہوگا، چنانچہ شرح المواقف میں ہے۔

(۱) معارف ص ۲۹۹ سطر ۹۔۱۰ (۲) تبیین ص ۱۳۱ سطر ۱۷۔۱۹

الطريق الثاني من ذينك الطريقين الضعيفين قياس الغائب على الشاهد وانما يسلكونه اذا حاولوا اثبات حكم لله سبحانه فيقيسونه على الممكنات قياسا فقهيا ويطلقون اسم الغائب عليه تعالى لكونه غائبا عن الحواس[۱]	ان دوضعیف طریقوں میں سے دوسرا طریقہ قیاس الغائب علی الشاہد ہے، اس طریقہ کو صرف اس وقت استعمال کرتے تھے جب اللہ تعالیٰ کے واسطے کوئی حکم ثابت کرنا چاہتے تھے تو اسے ممکنات پر بطور قیاس فقہی (Analggy) قیاس کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ پر ''اسم غائب'' کا اطلاق کرتے تھے، کیونکہ وہ حواس سے غائب ہے۔

اشاعرہ اس کی افادیت کلیہ کے منکر تھے، شرح المواقف میں ہے۔

وهو اي هذا الاثبات بطريق اليقين مشكل جدا[۲]	اور وہ یعنی اس باب کا یقینی طور پر ثابت کرنا بہت زیادہ مشکل ہے۔

لیکن یہ انداز استدلال بعض غیر مسلم مفکرین کا عموماً اور معتزلہ کا خصوصاً معمول بہ تھا اور وہ اکثر شاہد سے غائب پر استشہاد کے ذریعہ حجت قائم کیا کرتے تھے۔ اس لئے امام اشعری نے بطریق الزام ان پر حجت قائم کی کہ ان کے اس انداز استدلال[۳] کی صحت کی صورت میں ان پر لازم آتا ہے کہ وہ علم وقدرت اور دیگر صفات باری کا بھی اثبات کریں، مثلاً ہم شاہد میں دیکھتے ہیں کہ انسان عالم بھی ہے، متکلم بھی ہے، سمیع بھی ہے، بصیر بھی ہے، لہٰذا اگر غائب کو شاہد پر قیاس کیا جاسکتا ہے، تو ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ علم، قدرت اور دیگر صفات سے متصف ہے (حالانکہ معتزلہ صفات باری کی نفی کرتے تھے۔[۴])

یہ الزامی انداز استدلال اشاعری کا معمول بہ تھا، چنانچہ قاضی ابوبکر الباقلانی اپنی کتاب التمہید (ص ۹۷، ۹۸) میں جب براہمہ نبوت کے محال ہونے کو قیاس الغائب علی الشاہد کے اصول پر ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ان کی اس تعلیل فاسد کی تضعیف اسی الزامی انداز میں کرتے ہیں۔

فان قالوا الدليل على انه لايجوز ان يرسل الله رسولا الى خلقه انا	پس اگر براہمہ یہ کہیں کہ اس بات کی دلیل کہ اللہ تعالیٰ کے لئے یہ جائز نہیں

(۱) و (۲) شرح المواقف (۳) محجتهم الاستشهاد بالشاهد على الغائب (۴) الفرق بین الفرق ص ۹۳

وجدنا الرسول في الشاهد والمعقول في جنس المرسل...... فيقال لهم فيجب على اعتلالكم هذا لايكون الله سبحانه محتجا على الخلق ولا امرا لهم بما وضعه فيها عندكم من وجوب فعل الحسن وترك القبيح...... لان المحتج الآمر في الشاهد من جنس المامور المحتج عليه

ہے کہ وہ کسی کو مخلوق کی جانب رسول بنا کر بھیجے یہ ہے کہ شاہد و معقول میں پیمبر بھیجنے والے کی جنس سے ہوتا ہے...... تو ان سے کہا جائے گا کہ تمہارے استدلال پر لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ مخلوق پر حجت قائم کرنے والا ہو نہ انھیں حکم دینے والا ہو یہ وجہ اس اصول کے جو اس نے تمہارے قول کے مطابق ان میں وضع کر دیا ہے کہ اچھے کام کرنا واجب اور برے کا چھوڑنا فرض ہے...... کیونکہ شاہد میں حجت قائم کرنے والا اور حکم دینے والا اسی جنس سے ہوا کرتا ہے، جس سے وہ شخص جسے حکم دیا جائے اور اس پر حجت قائم کی جائے۔

اسی طرح اس سے ذرا قبل فرماتے ہیں۔

ويقال لهم ان بنيتم الامر على قبح ذلك في الشاهد بزعمكم فيجب ان تقضوا على ان الفاعل للعالم لا يفعله الا لاجتلاب منفعة اودفع مضرة اوداع دعاه الى الفعل وبعثه عليه وانه تعالى جسم مولف ذوحيز وقبول للاعراض وفي مكان دون مكان، لانكم لم تعقلوا فاعلا في الشاهد الاّ كذلك

اور ان سے کہا جائے گا کہ اگر تم اپنے گمان کے مطابق مسئلہ کی بنیاد اس بات پر قائم کرتے ہو کہ شاہد میں یہ بات قبیح ہو تو تم پر واجب ہے کہ یہ بھی تسلیم کرو کہ فاعل عالم کسی فائدے کے حصول یا کسی نقصان کے دور کرنے یا کسی ایسی غرض کے لئے جس نے اسے اس کام پر آمادہ کیا ہو، کوئی کام نہیں کرتا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ جسم ہے، حیز رکھتا ہے، اعراض کو قبول کرنے والا اور مخصوص مکان میں متمکن ہے کیونکہ شاہد میں تم کسی فاعل کا ان صفات کے متصف ہوئے بغیر تصور نہیں کر سکتے۔

لیکن مسٹر مکارتھی کہتے ہیں "کتاب الاستشہاد"۔ جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "معتزلہ کے دلائل سے خدا کا علم، قدرت اور دوسری صفات ثابت ہوتی ہیں۔"

معتزلہ کے دلائل بے شمار تھے، ان میں سے یہاں کون سے دلائل و انداز استدلال مراد ہیں، مسٹر مکارتھی کے ترجمے سے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا، حالانکہ تبیین ابن عساکر میں اس کی پوری وضاحت موجود ہے۔

۴۹۔ شیٔ پر ایک کتاب: اس میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اشیاء بہرحال اشیاء ہیں، چاہے وہ معدوم ہوں، [1] یہ ترجمہ مبہم ہی نہیں بلکہ یقیناً غلط ہے، اصل میں ہے۔

والفنا كتابا في باب شيىء وان الأشيـاء هي اشياء وان عدمت رجعنا عنه ونقضناه فمن دفع اليه فلا يعولن عليه[2]

اور ہم نے شیٔ (کے مباحث) پر ایک کتاب تالیف کی (بالخصوص اس مسئلے میں) کہ اشیاء بہرحال اشیاء ہیں، اگرچہ معدوم ہوں ہم نے اس کتاب سے (بعد میں) رجوع کرلیا اور اس کی تردید لکھی، پس کسی کو ہماری کتاب ملے تو اس پر ہرگز اعتماد نہ کرے۔

یہ دو کتابیں ہیں، ایک امام اشعری کے زمانۂ اعتزال کی اور دوسری اعتزال سے تائب ہونے کے بعد کی، پہلی کا نام ہے:

"كتاب في باب شيىء وان الاشياء هي اشياء وان عدمت"

اس کی تفصیل یہ ہے کہ فلاسفہ میں افلاطون امثال مجردہ (Zogos) کا قائل تھا، بعد کے حکماء پر اس کا بڑا گہرا اثر پڑا، چنانچہ جب افلاطونی اور ارسطاطالیسی فلسفوں میں تطبیق کی کوشش کی گئی، تو حکمائے متاخرین نے اعیان وحقایق کے وجود اور ماہیت میں تفریق وانفکاک کا اصول تراشا کہ ممکنات کا وجود ان کی ماہیت پر زائد ہوتا ہے، لہٰذا ماہیت وجود سے خالی ہوسکتی ہے، یعنی اعیان صفت وجود سے متصف ہوئے بغیر بھی اعیان بنے رہتے ہیں۔

تیسری اور چوتھی صدی کے معتزلیوں نے بھی فلاسفہ سے اس "جواز تعري الماهية عن الوجود" کے مسئلے کو اخذ کر کے یہ موقف اختیار کیا کہ معدوم ممکن نفی محض نہیں ہے، بلکہ من وجہ ثابت ہے

(۱) معارف ص ۳۰۰ سطر ۵۔۶ (۲) تبیین ص ۱۳۳ سطر ۵۔۶

ان مفکرین معتزلہ میں ابوعلی الجبائی خصوصی اہمیت رکھتا ہے، وہ اپنے عہد کا سید الطائفہ اور ایک مستقل مذہب ''الجبائیہ'' کا بانی تھا، اس کی بھی یہی رائے تھی، چنانچہ المحصل میں امام رازی نے ''تفصیل قول الفلاسفه والمعتزله فی المعدومات'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔

زعم ابویعقوب الشحام وابو علی الجبائی وابنه ابوهاشم ان المعدمات الممكنة قبل دخولها في الوجود ذوات واعيان و حقائق (۱)	ابو یعقوب الشحام وابوعلی الجبائی اور (موخر الذکر کے) بیٹے ابو ہاشم کا گمان ہے کہ معدومات ممکنہ وجود میں داخل ہونے (موجود ہونے) سے پہلے بھی ذوات اور اعیان اور حقائق ہوا کرتے ہیں۔

اسی الجبائی کے شاگرد رشید امام ابوالحسن الاشعری تھے، اس لئے وہ بھی اپنے زمانہ اعتزال میں اس عہد کے معتزلی متکلمین کی طرح اسی مسلک کے قائل تھے، اور اسی لئے انھوں نے ''کتاب فی باب شیء ان الاشیاء هی اشیاء وان عدمت'' کے نام سے وقت کے اس مروجہ مسئلے پر اپنے افکار کو قلم بند کیا۔

غرض یہ ایک کتاب ہے جو امام اشعری نے اپنے زمانہ اعتزال میں تصنیف کی تھی، لیکن ''ان الاشیاء هی اشیاء وان عدمت'' کا مسئلہ محض ایک دلچسپ حماقت ہی نہیں بلکہ اپنے اندر ایک خطرناک الحاد کو چھپائے ہوئے ہے، کیونکہ اگر اس مسئلے کو اس کی آخری حد تک سوچا جائے تو اس کا یہ ملحدانہ منطقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے، جو بعض معتزلہ کا مسلک بھی تھا کہ ''اس علم کے بعد کہ دنیا کا ایک پیدا کرنے والا ہے پھر بھی یہ شک باقی رہتا ہے کہ وہ صانع عالم موجود بھی ہے یا نہیں'' امام رازی کہتے ہیں۔

واتفقوا على انه بعد العلم بان للعالم صانعا عالما قادرا حيا حكيما مرسلا للرسل يمكننا الشك في انه هل هو موجود او لا الا ان نعرف ذلك بالدليل لانهم لما جوزوا اتصاف	اس پر معتزلہ کا اتفاق ہے کہ اس بات کے علم کے بعد بھی کہ عالم کا ایک صانع ہے جو عالم ہے، قادر ہے، حی (زندہ) ہے، حکیم ہے اور رسولوں کو بھیجنے والا ہے، ہمارے لئے یہ شک کرنا ممکن ہے کہ آیا وہ موجود ہے یا نہیں، الا یہ کہ ہم اس (صانع

(۱) المحصل ص ۳۷

المعدوم بالصفة لم يلزم من اتصاف ذات الله تعالیٰ بصفة العالمية والقادرية كونه موجودا[1]	عالم کے وجود) کو کسی (خارجی) دلیل سے جان ئیں، کیونکہ جب معتزلہ نے یہ جائز قرار دیا کہ معدوم (بھی) صفت سے متصف ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے عالمیت اور قادریت کی صفات سے متصف ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ موجود بھی ہو۔

اس لئے جب تیسری صدی کے اختتام پر امام اشعری اعتزال سے تائب ہوئے تو جہاں معتزلہ کی اور بدعات سے توبہ کی اس مسئلے سے بھی رجوع کیا، اور اپنے مسلک قدیم کی تردید میں ایک مستقل کتاب لکھی، چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

رجعنا عنه ونقضناه[2]	ہم نے اس کتاب سے رجوع کیا اور اس کی تردید لکھی۔

اس رجوع کا نتیجہ اشاعرہ کا مذہب مختار ہے کہ وجود واجب اور ممکن دونوں میں عین ماہیت ہوا کرتا ہے، چنانچہ شرح المواقف میں ہے۔

المقصد الثالث فی ان الموجود نفس الماهية اوجزء ها او زائد عليها...... فاما ان يكون نفس الماهية فی الكل ای الواجب والممكن جميعا او زائدا عليها فی الكل او يكون نفس الماهية فی الواجب زائدا عليها فی الممكن...... فانحصرت المذاهب فی ثلثة احدها للشيخ ابی الحسن الاشعری وابی الحسين البصری من المعتزلة انه	مقصد سوم اس بحث میں کہ وجود نفس ماہیت ہے یا ماہیت کا جز ہے یا ماہیت پر زائد (ماہیت سے علیحدہ) ہے...... پس یا تو سب میں یعنی واجب اور ممکن دونوں میں وجود نفس ماہیت ہوگا یا سب میں (واجب اور ممکن دونوں میں) ماہیت پر زائد ہوگا یا واجب میں نفس ماہیت ہوگا اور ممکن میں ماہیت پر زائد ہوگا...... پس اس مسئلے میں تین مذہب ہو گئے، ان میں سے ایک شیخ ابی الحسن الاشعری اور معتزلہ میں سے ابی الحسین البصری کا مذہب

(۱) المحصل ص ۳۸ (۲) تبیین ص ۱۳۳ سطر ۶

نفس الحقیقة فی الکل ای الواجب والممکنات کافة	ہے کہ وجود واجب اور ممکن دونوں میں نفس حقیقت (عین ماہیت) ہوتا ہے۔

غرض یہ نقض (تردید) ایک مستقل کتاب ہے، مگر مسٹر مکارتھی نے امام اشعری کی کتابوں کی تعداد لکھتے وقت دونوں کتابوں کو ایک ہی کتاب محسوس کیا، حالانکہ تبیین میں جو کچھ ''العمد'' سے نقل کیا گیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے دو مستقل کتابیں لکھی تھیں، پہلی ''ان الاشیاء ھی اشیاء وان عدمت'' کی تائید میں، اور دوسری اس کی تردید میں، لیکن جناب مستشرق کی ہمہ دانی نے دو کتابوں کو ایک کتاب بنا کر خلط مبحث کر دیا۔ ''شئی پر ایک کتاب اس میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اشیاء بہر حال اشیاء ہیں، چاہے وہ معدوم ہوں۔''

۶۷۔ جبائی کے سوالوں کے جواب میں۔(۱)

قارئین کرام کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر وہ کیا سوالات تھے جو الجبائی نے کئے تھے، مسٹر مکارتھی نے ان سوالات کی نوعیت سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، حالانکہ تبیین کی روایت کے مطابق امام صاحب نے ان سوالات کی نوعیت بھی کھول کر بیان کردی ہے، اصل میں ہے۔

الفنا کتابا اجبنا فیه عن مسائل الجبائی فی النظر والاستدلال وشرائطه(۲)	ہم نے ایک کتاب تالیف کی جس میں الجبائی کے ان سوالات کا جواب دیا جو اس نے نظر واستدلال اور شرائط نظر کے سلسلے میں کئے تھے۔

غالباً مسٹر مکارتھی ''نظر'' اور ''استدلال'' کے مصداق سے کما حقہ واقف نہ تھے، اس لئے انھوں نے اس کو صاف اڑا دیا، حالانکہ نظر وشرائط نظر اور استدلال مفکرین اسلام کا خاص موضوع رہے ہیں، اور اصول وکلام کی تمام مستند کتابیں ان کی بحثوں سے معمور ہیں، مثال کے لئے شرح المواقف کو لیجئے، موقف اول کا مرصد خامس مسائل نظر کی، اور موقف سادس مسائل استدلال کی تبیین و توضیح اور بحث وتمحیص پر مشتمل ہے، اسی طرح قاضی بیضاوی کی طوالع الانوار کے مقدمہ میں ان مباحث کا ذکر کیا گیا ہے، اور اس کی فصل ثالث میں حجج (استدلال) کا اور فصل رابع میں خصوصیت سے احکام نظر کا ذکر ہے، اسی طرح ابن حاجب (المتوفی ۶۴۶ھ) نے مختصر منتھی الاصول کے

(۱) معارف ص ۳۰۰ سطر ۱۸ (۲) تبیین ص ۱۳۴ سطر ۱۱۔۱۲

مقدمہ میں مسائل نظر واستدلال کو ذکر کیا ہے،(۱) اس کے علاوہ اور بہت سی تحریروں میں اس کا ذکر ہے مگر مسٹر مکارتھی نے اس کتاب کے موضوع کی اتنی توضیح بھی نہیں کی جتنی 'تبیین کذب المفتری'' کی ظاہر عبارت سے مستفاد ہو سکتی تھی۔

۷۹۔ کتاب فی الرد علی الفلاسفه: اس میں تین مقالے ہیں، ابن قیس منادی کے رد میں، ہیولی اور طبائع پر یقین رکھنے والوں کے رد میں اور ارسطو کے ان خیالات کے رد میں جو عالم اور افلاک سے متعلق ہیں۔(۲)

یہ ترجمہ بھی گمراہ کن ہے، اگر قارئین کرام اس کا تبیین کذب المفتری کی اصل عبارت سے موازنہ فرمائیں گے، تو یہ چیز واضح ہو جائے گی، تبیین میں ہے۔

الفنا کتاباً فی الرد علی الفلاسفة یشتمل علی ثلاث مقالات ذکرنا فیه نقضی علی ابن القیس الدهری وتکلمنا فیه علی القائلین بالهیولی والطبائع ونقضنا فیه علل ارسطاطالیس فی السماء والعالم وبینا ما علیهم فی قولهم باضافة الاحداث بالنجوم وتعلیق احکام السعادة والشقاوة بها(۳)

اور ہم نے فلاسفہ کے رد میں ایک کتاب لکھی جو تین مقالوں پر مشتمل ہے، اس میں ہم نے ابن قیس دہری کے دلائل کا رد کیا ہے اور ان لوگوں پر جو ہیولیٰ کے قائل ہیں یا طبائع کے قائل ہیں (مادہ پرست یا میٹریلسٹ) پر اعتراض کئے ہیں، اور ارسطو کی ان دلیلوں کی تردید کی ہے جو اس نے ''کتاب السماء والعالم'' میں بیان کی ہیں، اور یہ بیان کیا ہے کہ منجمین جو حوادث روزگار کے ستاروں کی جانب منسوب ہونے کے قائل ہیں اور جو نیک بختی اور بدبختی کے احکام کو ستاروں کی گردش سے متعلق سمجھتے ہیں ان پر ان کے اس قول کی بنا پر کیا اعتراض وارد ہو سکتے ہیں۔

(۱) مختصر المنتهی الاصول ص ۲۰۴ (۲) معارف ص ۳۰۰ سطر ۱۹ ص ۳۰۱ سطر ۱-۲ (۳) تبیین ص ۱۳۴ سطر ۱۲-۱۷

چند چیزیں قابل غور ہیں۔

۱۔مسٹر مکارتھی نے ''الدھری'' کا ترجمہ منادی (غالباً مادی) کیا ہے، حالانکہ دہریہ اور مادہ پرستوں میں بڑا فرق ہے۔

۲۔''ارسطو کے ان خیالات کے رد میں جو عالم اور افلاک سے متعلق ہیں'' کاش اگر مسٹر مکارتھی نے اسلامیات کا مطالعہ کیا ہوتا تو معلوم ہوتا کہ ''السماء والعالم'' ارسطو کی ایک کتاب کا نام ہے، جسے لاطینی زبان میں ''Decoelo'' اور اصل یونانی میں ''OVQAVOV'' کہتے ہیں، ابن الندیم ''الفہرست'' میں ارسطو کی کتب طبعیات کے ضمن میں کہتا ہے۔

الکلام علی کتاب السماء والعالم وھو اربع مقالات نقل ھذا الکتاب ابن البطریق واصلحه حنین[1]	کتاب السماء والعالم پر کلام: وہ چار مقالات پر مشتمل ہے، اس کتاب کو ابن البطریق نے نقل کیا اور حنین نے اس ترجمہ کی اصلاح کی۔

اسی عبارت کو قفطی نے بھی ارسطاطالیس کے ذکر میں دہرایا ہے۔

''کتاب السماء والعالم والکلام علیه وھو اربع مقالات نقل ھذاالکتاب ابن البطریق''[2]

یہی نہیں بلکہ قفطی نے ''الفہرست'' کے علاوہ ایک دوسرے حوالے سے ارسطو کی جو فہرست دی ہے، (جو ایک شخص مسمی بطلیموس کے مکتوب بنام اغلس سے ماخوذ ہے) اس میں بھی اس کتاب کا ذکر ہے۔ کتاب فی السماء والعالم اربع مقالات[3]۔ اسی کتاب السماء والعالم کی تلخیص دوسرے لوگوں کے علاوہ ابن رشد الاندلسی نے بھی کی، جسے دائرۃ المعارف حیدر آباد نے شائع کر دیا ہے، مگر تعجب ہے مسٹر مکارتھی ان سب حقائق سے ناآشنا ہیں اور بے دریغ یہ لفظی ترجمہ کر دیا ہے کہ ''ان خیالات کے رد میں جو عالم اور افلاک سے متعلق ہیں۔''

۳۔اس کتاب کے موضوع کا تیسرا جزء منجمین کا رد ہے جو اس بات کے قائل تھے کہ حوادث روزگار گردش نجوم کا نتیجہ ہیں، اور نیک بختی کو ستاروں سے متعلق گردانتے تھے۔

فی قولھم باضافة الاحداث بالنجوم وتعلیق احکام السعادة والشقاوة بھا	ان کے حوادث روزگار کو ستاروں کی طرف منسوب کرنے اور نیک بختی و بدبختی کے احکام کو ان ستاروں سے متعلق سمجھنے کے عقیدے کے باب میں۔

(۱) الفہرست لابن الندیم ص ۳۵ (۲) اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۳۰ (۳) ایضاً ص ۳۲ سطر ۱۸

منجمین کی تردید متکلمین اسلام کا عام موضوع تھی، چنانچہ امام اشعری کے شاگرد قاضی ابوبکر الباقلانی نے ''التمہید'' میں مفصل طور پر منجمین کا رد کیا ہے، اس باب کا نام ہے ''باب الکلام علی المنجمین'' امام اشعری نے بھی، اس کتاب کے اس جزء میں ان ایرادات و اعتراضات کو بیان کیا ہے، جو منجمین پر وارد ہو سکتے ہیں، لیکن مسٹر مکارتھی نے اس کا ترجمہ تک کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

۷۶۔ ابوالہذیل کے رد میں حرکت کے سلسلے میں۔ (۱)

یہ ترجمہ اگر گمراہ کن نہیں تو حیران کن ضرور ہے، اس سے محض یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابوالہذیل العلاف یا تو حرکت کے وجود خارجی کا قائل تھا، یا منکر اور امام اشعری نے اس کا رد کیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس کی تفصیل یہ ہے۔

متکلمین حدوث عالم کے قائل ہیں، یعنی سلسلۂ حوادث کو ازل کی جانب کہیں نہ کہیں منقطع ہونا چاہئے، اور وہی بدو آفرینش و تخلیق کائنات ہے، ابوالہذیل العلاف بھی اس عقیدے کا سرگرم مبلغ تھا، ایک مجلس مناظرہ میں اس سے کہا گیا کہ تم لوگ اس بات کے قائل ہو کہ سلسلۂ حوادث ابد کی جہت میں لاالی نہایت چلا جاتا ہے، مثلاً سکان بہشت ابدالآباد تک نعیم جنت سے محظوظ ہوتے رہیں گے، تو جس طرح سلسلۂ حوادث ابد کی جہت میں لاالی نہایت جا سکتا ہے، اسی طرح ازل کی جہت میں بھی لاالی نہایت جا سکتا ہے، لہذا عالم کے لئے حدوث زمانی (Creation in Time) ضروری نہیں، یہ سن کر ابوالہذیل سٹ پٹا گیا، اور کہنے لگا نہیں، جس طرح حوادث کے سلسلہ کا ازل میں ممتد الی لانہایۃ ہونا، ناقابل تصور ہے، اسی طرح وہ ابد میں بھی لاالی نہایۃ نہیں جا سکتا، پس بہشتیوں اور دوزخیوں کی حرکات کہیں نہ کہیں منقطع ہو جائیں گی اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ نہ جنتی کسی مزید نعمت جنت سے محظوظ ہو سکیں گے اور نہ دوزخی کسی مزید تکلیف دوزخ سے عذاب پا سکیں گے، چنانچہ شہرستانی نے لکھا ہے۔

الخامسة قوله ان حركات اهل الخلدين تنقطع وانهم يصيرون الى سكون دائم جمودا...... وهذا قريب من مذهب جهم اذحكم	پانچویں قابل اعتراض بات ابوالہذیل العلاف کا یہ قول کہ اہل جنت اور اہل دوزخ کی حرکات (کبھی نہ کبھی) منقطع ہو جائیں گی اور وہ دائمی سکون کی حالت

(۱) معارف ص ۳۰۱

بفناء الجنة والنار وانما التزم ابو الهذيل هذا المذهب لانه لما الزم في مسئلة حدوث العالم ان الحوادث التي لا اول لها كالحوادث التي لا آخر لها اذ كل واحد لاتتناهي. قال اني لا اقول بحركات لا تتناهي آخراً كما لا اقول بحركاتٍ لاتتناهي اولا بل يصيرون الى سكون دائم [1]	میں جامد بن جائیں گی...... یہ قول جہم بن صفوان کے مذہب کے قریب قریب ہے کیونکہ اس نے بھی جنت اور دوزخ کے فنا ہو جانے کا حکم لگایا تھا، ابوالہذیل کو اس مذہب کا اس طرح قائل ہونا پڑا کہ جب حدوث عالم کے مسئلے میں اسے یہ الزام دیا گیا کہ وہ حوادث جن کا آغاز نہ ہو ان حوادث کی طرح ہیں جن کا انجام نہ ہو، کیونکہ دونوں لامتناہی ہیں تو ابوالہذیل کہنے لگا کہ میں جس طرح ان حرکات کا قائل نہیں ہوں جو اپنے آغاز میں لامتناہی ہیں اسی طرح ان حرکات کا بھی قائل نہیں ہوں جو اپنے انجام میں لامتناہی ہیں بلکہ وہ دائمی سکون و جمود کی حالت میں منتہی ہو جائیں گی۔

یہ ابوالہذیل العلاف کا مذہب مشہور ہے، [2] عامہ متکلمین نے اس کا رد کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ حوادث اور حوادث مستقبلہ میں بنیادی فرق ہے، اور ایک کا قیاس دوسرے پر قیاس مع الفارق ہے، اس موضوع پر امام ابوالحسن الاشعری نے ایک کتاب تصنیف کی تھی، جس کا نام ابن فورک نے ''کتاب الرد فی الحرکات علی ابی الهذیل'' بتایا ہے۔

لیکن مسٹر مکارتھی نے کتاب کو ایک قسم کا فلسفہ طبعیات کا مسئلہ بنا دیا ہے۔

۸۳۔ کتاب فی تشابہ القرآن: اس میں اشعری نے ملاحدہ اور معتزلہ کو ایک ہی زمرے میں شمار کر کے ان کا رد کیا ہے، اور ابن الراوندی کی کتاب التاج کا بھی رد ہے، [3] اصل میں ہے۔

وكتاب في متشابه القرآن جمع فيه بين المعتزلة والملحدين فيما	کتاب فی تشابہ القرآن اس میں امام صاحب نے معتزلہ اور ملحدین دونوں کو

(۱) الملل والنحل للشہرستانی ج اول ص ۲۳ (۲) تبیین ص ۱۳۵ سطر ۱۹ (۳) معارف ص ۱۰۱ سطر ۱۰۔ ۱۱

یطعنون به فی متشابه الحدیث ونقض کتاب التاج علی ابن الراوندی[1]	ایک گروہ محسوب کیا ہے کہ دونوں احادیث متشابہات پر طعن کرتے تھے، اور نقض کتاب التاج ابن راوندی کے خلاف ہے۔

اس میں دو باتیں قابل غور ہیں (۱) مسٹر مکارتھی کے ترجمے سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ امام اشعری نے ملاحدہ اور معتزلہ کو ایک ہی زمرے میں کیوں شمار کیا ہے؟ لیکن تبیین کذب المفتری کی تصریح سے اس کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے، کہ یہ دونوں گروہ احادیث متشابہات پر طعن کیا کرتے تھے، چنانچہ امام اشعری سے پہلے اور بعد میں بہت سے علمائے اسلام نے ان مطاعن کا جواب دیا ہے، امام اشعری سے پہلے ابن قتیبہ نے "تاویل مختلف الحدیث" اسی موضوع پر لکھی تھی، اور امام اشعری کے بعد امام ابن فورک نے "تاویل مشکل الحدیث" لکھی، بہرحال امام اشعری نے اپنی اس کتاب میں معتزلہ اور ملاحدہ کے ان مطاعن واعتراضات کا جواب دیا ہے، جو وہ متشابہات قرآن ومتشابہات حدیث پر وارد کیا کرتے تھے۔

۲۔ مسٹر مکارتھی نے لکھا ہے کہ اسی کتاب میں ابن الراوندی کی کتاب کا بھی رد ہے، حالانکہ یہ ایک مستقل کتاب ہے، جس کا عنوان "نقض کتاب علی ابن الراوندی" ہے، اور کتاب متشابہ القرآن میں جس کا موضوع متشابہات احادیث پر اعتراضات کا جواب ہے۔ "کتاب التاج" کا انضمام بالکل بے میل اور بے جوڑ ہے، کتاب التاج کا موضوع خود امام اشعری کے لفظوں میں قدم عالم کے عقیدے کی تائید ہے۔

کتاب التاج وهو الذی نصر فیه القول بقدم العالم[2]	کتاب التاج وہ کتاب ہے جس میں (ابن الراوندی) نے عالم کے قدیم ہونے کے عقیدے کی حمایت کی ہے۔

لیکن اس سے ایک جانب امام اشعری کے علم کلام کی نوعیت کے بارہ میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور دوسری جانب ان کتابوں کی تعداد بھی کم ہو جاتی ہے، یہ دو کتابیں ہوتی ہیں، مگر مسٹر مکارتھی نے ...۸۳۔ کے ضمن میں دونوں کو ایک محسوب کیا ہے۔

(۱) تبیین ص ۱۳۵ سطر ۱۲۔۱۳ (۲) ایضا ص ۱۲۹ سطر ۴۔۵

۹۴۔ایک رسالہ عقائد پر،اس بارے میں کہ آیا ''خلق'' کا استعمال صحیح ہے۔ (۱)

یہ ابہام انتہائی گمراہ کن ہے ''عقائد'' اور ''خلق'' کا استعمال میں کیا تعلق ہے، پھر اس فقرے کا کہ ''خلق کا استعمال صحیح ہے'' کیا مفہوم ہے؟ کس کی شان میں؟ خالق کی شان میں یا مخلوق کی شان میں؟

اصل میں ہے۔

رسالة في الايمان وهل يطلق عليه اسم الخلق (۲)	ایک رسالہ ایمان (اصطلاحی) کے باب میں کہ آیا اسے مخلوق کہا جا سکتا ہے یا نہیں (ایمان پر خلق کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں)

یہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے کہ ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق، چنانچہ مشائخ حنفیہ میں بھی اس باب میں سخت اختلاف ہے، علمائے سمرقند اس کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں اور علمائے بخارا غیر مخلوق ہونے کے بلکہ مؤخر الذکر میں سے بعض علماء مثلاً ابن الفضل، شیخ اسمٰعیل بن الحسین الزاہد، اور ائمۂ فرغانہ نے تو اتنا مبالغہ کیا ہے کہ جو خلق ایمان کا قائل ہوا، اس کے کفر کا فتویٰ دے دیا، اور اس پر کلام باری کے مخلوق ہونے کے قائل ہونے کا الزام لگایا، علامہ ابن الہمام الحنفی (المتوفی ۶۸۱ھ) ''المسایرہ'' میں لکھتے ہیں۔

المسئلة الثانية لمشائخ الحنفية خلاف في ان الايمان مخلوق او غير مخلوق والاول عن اهل السمرقند والثاني من البخاريين بعد اتفاقهم على ان افعال العباد كلها مخلوقة لله تعالى و بالغ بعض مشائخ بخاری كابن الفضل والشيخ اسمعيل بن الحسين الزاهد وتبعهم ائمة	دوسرا مسئلہ: مشائخ حنفیہ کا اس میں اختلاف ہے کہ ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق، پہلا قول علمائے سمرقند سے اور دوسرا قول علمائے بخارا سے منقول ہے، بعد اس بات کے کہ وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کے خلق کئے ہوئے ہیں اور بعض مشائخ بخارا مثلاً ابن الفضل اور شیخ اسمٰعیل ابن الحسین الزاہد نے اس باب میں بہت

(۱) معارف ص ۳۰۱ سطر ۹ ص ۳۰۲ سطر ۱ (۲) تبیین ص ۱۳۶ سطر ۸۔۹

فرغانه فكفروا من قال بخلق الايمان والزموا عليه خلق كلام الله تعالى (۱)	زیادہ مبالغہ کیا ہے اور ائمۂ فرغانہ نے اس میں ان کا اتباع کیا اور اس شخص کی تکفیر کی جو خلق ایمان کا قائل ہو اور اس پر کلام باری کے مخلوق ہونے کا قائل ہونے کا الزام لگایا۔

غالباً قیام بغداد کے زمانہ میں جب امام اشعری کو متعصب حنابلہ کا مقابلہ درپیش تھا، مسئلہ خلق ایمان سے ان کا سابقہ پڑا، کیونکہ ان کا مشہور دشمن الاہوازی نے جو گروہ حشویہ سے تعلق رکھتا تھا، مسئلہ خلق ایمان کے باب میں امام اشعری کے موقف کو ان کے مطاعن کی فہرست میں محسوب کیا ہے اور اس اعتراض کو نقل کرتے ہوئے حافظ ابن عساکر نے لکھا ہے۔

واما قوله في مسئلة الايمان فمن جنس ما تقدم فيه في البهتان	اور اہوازی نے مسئلہ ایمان کے بارے میں جو کچھ امام اشعری کی جانب منسوب کیا ہے وہ اس کی پچھلی بہتان تراشیوں کے مانند ہے۔

اس لئے اس مسئلہ خاص میں امام اشعری نے زیر بحث رسالہ لکھا تھا، یہ رسالہ آج ناپید ہے، لیکن حافظ ابن عساکر نے اس کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا، چنانچہ فرماتے ہیں۔

وقد وقفت على هذه المسئلة من تصنيف ابى الحسن فوجدت استدلاله فيها يدل على هذا التفصيل الحسن (۲)	اور میں امام ابوالحسن کی تصنیف کے ذریعہ اس مسئلے سے واقف ہوا اور اس کتاب میں ان کے (انداز) استدلال کو اس پسندیدہ تفصیل پر دلالت کرنے والا پایا۔

مسئلہ ایمان کے باب میں امام اشعری کا موقف بتصریح حافظ ابن عساکر حسب ذیل ہے۔

وابو الحسن لا يقول بقدم الايمان على الاطلاق وانما يقول بقدم صفات العليم الخلاق فمن اسماءه التى سمى به نفسه	امام ابوالحسن الاشعری علی الاطلاق ایمان کے قدیم ہونے کے قائل نہیں ہیں، بلکہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفات کے قدیم ہونے کے قائل ہیں اور اللہ تعالیٰ ان

(۱) المسائرہ ص ۱۹۱ (۲) تبیین ابن عساکر

"المومن" قال سبحانه (الملک القدوس السلام المومن المهیمن) فقیل انه مشتق من الایمان وقیل بل هو ماخوذ من الامان فمن قال انه اشتق من الایمان فلانه صدق نفسه فقال (ومن اصدق من الله قیلا) ومن قاله انه ماخوذ من الامان فلانه امن اولیاءه من ظلمه فلا یظلمهم فتیلا فابو الحسن نفی الخلق عن الایمان الذی هو صفة من صفات الرحمن فاما الایمان الذی هو صفة الانسان محدثاً وصفته قدیمة وهل یتصور ذلک الا من مسخ بعد الانسانیة بهیمیة[1]

کے اسماء میں سے جن سے اس نے اپنی ذات کو موسوم کیا ہے "المومن" بھی ہے، اللہ سبحانہ فرماتا ہے (الملک القدوس السلام المومن المہیمن) چنانچہ کہا گیا کہ (لفظ مومن) "ایمان" سے مشتق ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ ایمان سے نہیں بلکہ 'امان' سے مشتق ہے پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ لفظ "مومن" ایمان سے مشتق ہے تو اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی تصدیق کی ہے (اسے سچا بتایا ہے) 'ومن اصدق من الله قیلا' اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ "امان" سے ماخوذ ہے تو اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کو اپنے ظلم سے بےخوف بنا دیا ہے 'فلا یظلمهم فتیلا' یعنی امام ابوالحسن الاشعری نے اس ایمان سے 'خلق' کی نفی کی ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے، رہا وہ جو انسان کی صفت ہے تو اس کا قائل ہونا سراسر بہتان ہے اور کیونکر ممکن ہے کہ انسان تو حادث ہو اور اس کی صفت قدیم ہو اور وہی شخص اس بات کا تصور کر سکتا ہے جس کی انسانیت مسخ ہو کر بہیمیت بن گئی ہو۔

غرض زیر بحث رسالہ کا موضوع یہ ہے کہ ایمان پر کس صورت میں مخلوق ہونے کا اور کس صورت میں غیر مخلوق ہونے کا اطلاق ہوتا ہے، مگر جناب مستشرق کی معراج تحقیق یہ ہے کہ "ایک رسالہ عقائد پر اس بارے میں کہ آیا خلق کا استعمال صحیح ہے"۔

یہ ہے مشتے نمونہ از خروارے، مستشرقین یورپ کی تحقیق انیق!!

(۱) تبیین ص ۳۹۳، ۳۹۴

ابوالعلامعری کے متعلق مستشرقین یورپ کی غلطیاں

مولانا عبدالعزیز میمن مرحوم

ہمارے ہاں قدماء کے درس کا عام طریقہ یہ تھا کہ مدرس خود مسئلہ پر زبانی تقریر کرتا تھا، طلبہ سنتے تھے، اور یادداشت لکھتے جاتے تھے، اس طریقۂ درس کا نام املا تھا، آج کل یورپ کا طرز بھی یہی ہے، اور عموماً ہندوستانی کالجوں میں بھی اسی کی تقلید ہوتی ہے، اس طریقہ کا فائدہ یہ ہے کہ کم سے کم وقت میں الفاظ اور کسی خاص کتاب کی پابندی کے بغیر نفس مسئلہ حاضرین کے سامنے آجاتا ہے، طلبہ کا ذہن، عبارت الفاظ اور ضمیروں کی الجھن میں نہیں پڑ جاتا۔

ہم نے یہ چاہا ہے کہ دارالعلوم ندوہ کے جدید نصاب میں اس طریقۂ درس کو دوبارہ زندہ کریں ہم نے چند لائق دوستوں کو اس سلسلہ کے آغاز کے لئے خطوط لکھے، تو سب سے پہلے ہمارے فاضل دوست مولانا میمن عبدالعزیز صاحب راجکوٹی ادیب اورنٹیل کالج لاہور نے اس کے لئے سب سے پہلے آمادگی ظاہر کی، اور ۱۸ رجون ۲۵ء کو لکھنؤ آکر انھوں نے ہمارے عزیز طلبہ کے سامنے دو دن دو دو گھنٹے عنوان بالا پر املا کیا، اثنائے سخن اور آغاز کلام میں انھوں نے طلبہ کو یورپ کے اس علمی جدوجہد سے مطلع کیا، جو وہ ہمارے علوم وفنون کی حفاظت اور اشاعت میں کر رہا ہے، اس کے ساتھ عربی خواں طلبہ کو غیرت دلائی کہ وہ بلند ہمتی کے ساتھ ان خدمات کے ادا کرنے کے لئے کیوں اپنے کو آمادہ نہیں کرتے۔

خطیب ممدوح عربی ادب وتاریخ میں یدطولی رکھتے ہیں اور اسی کے ساتھ قلمی کتابوں

یورپین مطبوعات اور علمائے یورپ کی کوششوں سے پوری طرح آگاہ ہیں، اس لئے اس مضمون میں وہ پوری کامیابی حاصل کر سکے ہیں، مشرق کے قدیم الخیال اصحاب تو مغرب کے کمال کے یکسر منکر ہیں، لیکن جدید تعلیم یافتہ اشخاص اس کی ہر بات کو وحی آسمانی اور اس کے ہر مصنف کو معصوم یقین کرتے ہیں، یہ افراط وتفریط ہے، پہلا جہل مطلق ہے، تو دوسری مرعوبیت اور دماغی غلامی، خطیب نے اسی لئے خطبہ کا عنوان ''ابوالعلامعری کے متعلق مستشرقین کی غلطیاں'' مقرر کیا، تاکہ علمائے یورپ کے محاسن اور معائب دونوں ہمارے طلبہ کے سامنے آجائیں، خدا کا شکر ہے کہ ایک طرف ہمارے عزیز طلبہ اور فاضل مدرسین نے خطیب کے فضل وکمال کا اعتراف کیا، دوسری طرف ہمارے دوست نے طلبہ اور اساتذہ کے علمی ذوق وشوق، جدید معلومات کی تحصیل وطلب اور ان کے حسن مذاق اور ذوق سلیم کی پوری داددی اور تسلیم کیا کہ یہ خصوصیتیں کسی اور عربی مدرسہ میں انھوں نے نہیں پائیں۔

ذیل میں اس حصہ کے تحریر شدہ حصہ کو ہم شائع کرتے ہیں، اور عربی خواں طلبہ کو اس کو دقتِ نگاہ کے ساتھ پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ (سید سلیمان ندویؒ)

خطیب نے تمہید وشکریہ کے بعد کہا۔

اندلس کی کسی تاریخ میں کبھی کسی اندلسی فاضل کی شان میں متنبی کا یہ شعر نظر سے گذرا تھا۔

کبرت[1] حول بیوتهم لما بدت   منها الشموس ولیس فیها المشرق

بات بھی یہی ہے اور اس بیت میں ایک ذرہ برابر مبالغہ نہیں کہ اہل اندلس ہر فضیلت کے بجا طور پر سزاوار ہیں، مادر دہر نے ہر چند لیل ونہار کے ہزارہا سیاہ وسفید ورق الٹ ڈالے، مگر کبھی ایسی وارفتہ علم قوم کو پھر اس جہاں میں نہ لاسکی اور نہ بظاہر توقع ہے کہ آئندہ لائے۔

سو اس وقت آفتاب علم کا بلاد مغرب سے طلوع ہوتا کوئی اچنبھے کی چیز نہ تھی مگر افسوس کہ پھر وہ حالت نہ رہی اور وہ آفتاب پھر اپنے پرانے رخ یعنی مشرق سے نکلنے لگا، مگر اب ہمارے کانوں میں کوئی سو سال سے وہی بھنبھناہٹ محسوس ہو رہی ہے، جس کا باعث بجز اس افسوسناک امر کے اور کیا ہوسکتا ہے، کہ ہم نااہل اخلاف نے ان فاضل اسلاف کی پیروی ترک کر دی اور ہمارا علمی ترکہ اغیار لے اڑے اور جس طرح ہم ملک سے تہی دست ہوگئے تھے، اسی طرح علم وفضل سے بھی

(۱) میں نے ان کے گھروں کے پاس کھڑے ہوکر تعجب سے اللہ اکبر کہا، جب کہ ان میں سے سورج طلوع ہوا حالانکہ وہ کوئی مشرق میں نہ تھے بلکہ مغرب میں تھے۔

عاری ہونے لگے، اجانب بیدار تھے، انھوں نے اس یوسف گم گشتہ کی پوری تربیت ونگہداشت کی حتی کہ ان کی علمی خدمات کی صدائیں اپنی مسلسل گونج سے ہمارے کانوں کے پردے پھاڑنے لگیں، مگر واہ رے ہماری غفلت کہ ہمیں اس گہری نیند سے نہ جاگنا تھا اور نہ جاگے، کاہلی، تن آسانی اور سہل انگاری ہماری ممتاز خصوصیتیں ہوگئیں اور دنیا ہمیں طعنہ دینے لگی کہ یہ ہیں انھی نامور اسلاف کے ناکارہ اخلاف۔ حیف صد حیف۔

ادھر یورپ نے نہ صرف اپنے بلکہ ہمارے مخصوص علوم وفنون کی وہ بے لوث اور سرگرم علمی خدمتیں کیں، جو ان کے لئے ہمیشہ جلی حروف میں تمغائے امتیاز اور ہمارے لئے ننگ و عار کا ایک لازوال داغ بنی رہیں گی، جس کے مٹنے کی اگر لیل ونہار رہی ہے، تو کوئی قریبی توقع رکھنا سعی لاحاصل ہے، انھوں نے شرق وغرب کے ہزار ہا عمومی وخصوصی کتب خانے الٹ ڈالے، اور ہماری نادرۂ روزگار کتابوں کا ایک ایک کر کے کھوج نکالا ، پھر ان کا متعدد نسخوں سے مقابلہ کیا، ان کو ذیلی حواشی اور ملاحظات سے آراستہ کیا یعنی کہ ہم سے ہماری زبان میں ہم کلام ہوئے اور ادھر اپنے ابنائے وطن کے لئے اپنی زبانوں میں ترجمے کئے۔

اور اس طرح اجانب واقارب ہر دو کے دلوں میں اپنی سبقت کی مہر ثبت کردی اور دونوں کی گردنیں اپنے احسان کے سامنے خم کردیں، اور ہر مخالف وموافق کی زبان سے خراج تحسین و آفریں وصول کیا۔

میں گویا یورپ کی قصیدہ خوانی پر اتر آیا، اور اپنی انتہائی پستی کا ماتم کرنے پر، اس لئے اب ان باتوں کو یہیں چھوڑ کر اصل مطلب کی طرف ایک قدم بڑھاتا ہوں یعنی یہ کہ اہل یورپ نے ہر چند کہ ہماری زبانوں کی بیش بہا خدمتیں کی ہیں، مگر چونکہ وہ ہماری فطری اور کسبی عادات کی ترجمانی کے حقیقی اہل نہ تھے، اور گویا وہ اپنی لیاقت کے بل بوتے پر اور ہماری نالائقی سے فائدہ اٹھا کر ہمارا بوجھ اپنے دوش ہمت پر لینا چاہتے تھے اور اس طرح ہمارا کام خود انھوں نے سنبھالنا چاہا، اس لئے بمقتضائے سنت الہی ضروری تھا کہ حقیقی اجنبیت ومغایرت اور اکتسابی فضیلت ولیاقت خلقی خامی اور کمزوری کو ہمیشہ دبانے میں کامیاب نہ ہو۔

مگر افسوس جب کہ ہمیں سرے سے اصل ہی سے کوئی سروکار نہ تھا، تو ہم سے یہ امید کیسے وابستہ کی جاتی کہ ہم اصل ونقل میں تمیز کرسکیں، اس لئے ہم گم گشتگان بادیۂ حیرت کے دلوں میں روز بروز یہ عقیدہ اور مستحکم ہوتا گیا کہ اجانب خدانہ کرے کسی خارق فطرت اور مافوق العادۃ قوت

کے مالک ہیں، جو انھیں ہر دو میدانوں یعنی سیاست ولیاقت میں کامیابی سے ہم کنار کر رہی ہے، اور گویا فطرتاً ہم ان محاسن سے محروم پیدا کئے گئے ہیں، اس لئے بے بسی اور عاجزی ہماری ہو رہی ہے، اور ہم اس کے ہو گئے ہیں نہیں نہیں۔

نقصاں ز قابل است وگرنہ علی الدوام　　　فیض عنایتش ہمہ کس را برابر است

سچ پوچھئے تو مفتوحین ہمیشہ ایسے اخلاقی امراض کا شکار رہے ہیں و للّٰہ فی خلقه اسرار سونا گزیر تھا کہ ان کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرادی جائے کہ قدرت نے ہرگز ہرگز ان کے بارے میں بخل سے کام نہیں لیا، اور یہ ساری علمی پستی ان کی پست ہمتی کا کرشمہ ہے۔ بس

باضعف و ناتوانی ہمچوں نسیم خوش باش　　　بیماری اندریں رہ خوشتر ز تندرستی

جس طرح یہ ضرورت بھی بجائے خود اہمیت میں کسی طرح کم نہ تھی کہ ان گمراہوں کو راہ راست پر لایا جائے، اور ان کے اس بت پندار کو توڑا جائے، جس کا طاغوتی اثر یہاں تک پہنچا ہے کہ وہ مشرق کے بے لوث اور مخلص خادمان علم کی سرفروشانہ مساعی کو بادۂ نخوت سے سرشار ہو کر، شان بے نیازی سے ٹھکرا دینے کے عادی ہو گئے ہیں۔

اس سلسلہ کی پہلی کڑی معریات یعنی مضامین متعلقہ ابوالعلا معری ہیں، جن کا ایک حصہ بعنوان ''معری اور معارضہ قرآن'' معارف میں پہلے شائع ہو چکا ہے، اس کا سبب صرف یہ ہے کہ عاجز نے ان دنوں ابوالعلا پر عربی میں ایک کتاب مسمیٰ ''ابوالعلا و ما الیہ'' لکھی ہے، اور چونکہ ابوالعلا کے آزادانہ افکار و آراء اہل یورپ کو اس درجہ معمول سے زیادہ بھائے تھے کہ انھوں نے نہایت تگ و دو اور کدوکاوش کر کے اس کے احوال و اخبار میں بہت مخصوص غیر مخصوص اور بھلی بری بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں جرمن، انگلش اور فرنچ وغیرہ زبانوں میں لکھ ڈالی ہیں، ضرور معلوم ہوا کہ سردست اسی مضمون کو چھیڑوں جو ایک حد تک ان کے لئے مایۂ نازش اور منجھا ہوا رہا ہے، اور جس میں ان سے اغلاط کے سرزد ہونے کا نسبتہً بہت تھوڑا امکان رہا تھا، میں ابوالعلا کے مفصل سوانح اور نقد و تبصرہ کے لئے قارئین کو اپنی مذکورہ تالیف کا حوالہ دوں گا جو اگر خدا کو منظور ہوا اور حالات نے مساعدت کی تو کسی قریبی زمانہ میں نکل آئے۔

یہاں میرا مطلب صرف انہی اغلاط فاحشہ اور تناقضات قبیحہ سے ہے، جو ابوالعلا کے مغربی عشاق سے اس کی زندگی کے سمجھنے میں سرزد ہوئے ہیں، بدقسمتی سے میں جرمن اور فرنچ کتابوں سے اصالۃً کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا، مگر چونکہ اہل یورپ نے اس سلسلہ میں ایک دوسرے کی

ترجمانی پر ہی قناعت کی ہے اس لئے میں فی الجملہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان کے مضامین پر قدرے عبور ہے، اسی ترجمانی کا نتیجہ یہ اغلاط کا انبار ہے۔

اس لئے میں یہاں خصوصیت کے ساتھ مارگولیوتھ اور نکلسن صاحبان کے مشترک اور مخصوص اغلاط ہی سے بحث کروں گا اور ناظرین اپنے طور پر یہ یقین کرلیں کہ پورا یورپ کم وبیش انہی اغلاط میں مبتلا ہے، مارگولیوتھ نے رسائل معری مطبوعہ آکسفورڈ ۱۸۹۸ء کے شروع میں ایک زبردست پرمغز اور پرمواد مقدمہ نہایت متین لہجہ میں لکھا ہے، جس کی صدائے بازگشت نکلسن کی ہسٹری آف عربک لٹریچر، آرٹیکل انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور اسٹڈیز ان اسلامک پوئٹری ہے، میں نے چار کتابوں کے لئے علی الترتیب یہ علامات وضع کی ہیں (م۔آداب۔دائرہ، افکار) مارگولیوتھ صاحب کا مقدمہ کل ۴۳ صفحات کا ہے اور نکلسن صاحب نے سوانح کے سلسلہ میں دو چار چھ صفحوں سے زیادہ کہیں نہیں لکھا، اس لئے یقیناً یہ اغلاط ناظرین کے لئے مایہ حیرت واستعجاب ہوں گی میں نے بہت سی معمولی اغلاط کو مطلقاً نظر انداز کردیا ہے، مارگولیوتھ صاحب نے ترجمہ رسائل اور تصحیح ترجمہ معری از معجم الادبا میں اور بھی زیادہ غلطیاں کی ہیں مگر شاید وہ قارئین کی تضییع وقت کا باعث بنتیں، بشرط ضرورت میں ان کو بھی شائع کرسکتا ہوں، جس طرح نکلسن صاحب نے افکار معری کی ترجمانی اور الغفر ان کے ترجمہ میں لاتعداد اغلاط کا ارتکاب کیا ہے، ایک اور صاحب بھی ہیں، جنھوں نے انگریزی میں معری پر ایک مختصر مگر مستقل تالیف لکھی ہے، جو بے شمار اغلاط سے لبریز ہے اور چونکہ وہ عربی دانی کے خود بھی مدعی نہیں ہیں اس لئے گویا انھوں نے نہ ہمارے التفات کو اپنی طرف کھینچا اور نہ ہمارا وقت لیا، کہ جرح العجماء جبار

میرا مقصد نہ اپنے پچھلے اعتراف سے مکرنا ہے اور نہ ان محبان علم کی بے غرض کوششوں کی ناقدری کرنا بلکہ صرف حقائق کو اپنی اصلی شکل میں پیش کرنا ہے اور ان کے بیرونی لبادوں کو الٹ دینا ہے اور بس تاکہ آئندہ جو اصحاب اس سلسلہ میں کچھ کام کرنا چاہیں، وہ اپنے پیش رو مقلدین کی طرح پھر ان اغلاط کا شکار نہ ہوں اور ان کے مخلص کی یہ کوشش ان کے لئے کار آمد مواد فراہم کرے، اور سابق الذکر سلسلہ کی ایک کڑی ہو، جس پر جہاں تک مجھے علم ہے بہت کم لکھا گیا ہے، تاکہ پھر اس طرح ہماری مردہ غیرت وحمیت گدگدیاں لینے لگے اور ہم کسی مفید خدمت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، مضمون کی خشکی پر میں محترم قارئین سے طالب عفو ہوں اور ملتجی ہوں کہ خدارا وہ علمی ترقی کی راہ میں اس کو کوئی بڑی رکاوٹ نہ بنالیں، ورنہ پھر علوم کی قسمت معلوم!

مارگولیوتھ کے اغلاط

یہ اغلاط مختلف قسم کی ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو متعدد سرخیوں کے تحت ذیل میں ذکر کیا جائے۔

علمی کم مائیگی

(۱) رسائل[۱] کے اس جملہ وانصرفت وماء وجهي في سقاء غير سرب ماارقت منه قطرة في طلب ادب ولامال ومنذ فارقت العشرين من العمر ما حدثت نفسي باجتداء علم من عراقي ولا شامي سے آپ یہ مطلب اخذ کرتے ہیں،[۲] اپنے ایک مکتوب الیہ کو لکھتا ہے کہ اسے اپنی عمر کے بیسویں سال سے کسی عراقی یا شامی سے نہ مال کی ضرورت ہوئی اور نہ علم کی۔

ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ ابوالعلا کے دونوں جملوں کو بری طرح گڈمڈ کر دینے کا نتیجہ ہے، ورنہ ابوالعلا نے بیس سال کی عمر سے پہلے بھی کسی سے مالی امداد نہ طلب کی تھی، صحیح ترجمہ یوں چاہئے، اور جب سے میں نے بیسواں سال چھوڑا، کبھی میرے جی میں یہ خیال نہ آیا کہ کسی عراقی یا شامی سے طلب علم کروں۔

۲۔ کتاب الایک والغصون کی بابت جو ابوالعلا کی سب سے بڑی تصنیف ہے، ذہبی اور ابن خلکان کی بحوالہ ایک شاہد عینی یہ روایت ہے، وقد ذكر بعض الفضلاء انه وقف على المجلد الاول منه بعد المأة قال ولا اعلم ما يعوزه بعد ذلك، یعنی مجھ سے ایک فاضل نے کہا کہ اس نے کتاب الایک کی ایک سو ایک جلد دیکھی ہے، وہ کہتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ اس میں اور کتنی جلدوں کی کمی تھی، مگر مارگولیوتھ[۳] اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ وہ ۱۰۱ جلدوں کی کتاب تھی جس نے اور تمام کتابوں کو ناکارہ ثابت کر دیا، ان کے ترجمہ کے دونوں جزو غلط ہیں کہ فحوائے عبارت کا اقتضا یہ ہے کہ ممکن ہے اس کی ہنوز اور کچھ جلدیں رہی ہوں، مگر مجھے علم نہیں، اعواز کے معنی ناکارہ کرنا، دنیا کی کسی لغت میں نہیں۔

۳۔ ابن فورجہ[۴] کا املا لکھتے ہیں (Ibn faurajah) حالانکہ یوں ہونا چاہئے، (Ibn furajjah) جس طرح صاحب فوات الوفیات نے ضبط کیا ہے تتمۃ الیتیمۃ للثعالبی کے قلمی نسخہ[۵] محفوظہ ببلیوتھک نیشنل پیرس میں اعراب و حرکت کے ساتھ موجود ہے، اس بات کی مثالیں آئندہ بھی آئیں گی۔

(۱) ص ۳۲ (۲) م ص ۱۵ (۳) م ۲۹ (۴) م ۲۶ (۵) اس کے فوٹو یہاں لاہور میں ہم نے بچشم خود دیکھے ہیں۔

تصحیفات شنیعہ بعض اوقات ناکافی تامل کی بنا پر بری طرح الفاظ میں کتر بیونت یا ردوبدل کر ڈالتے ہیں۔ مثلاً

۴۔ سویقۃ غالب کو جس کا ذکر آئندہ آئے گا[1]، سویقۃ ابن غالب لکھا ہے، مگر یہ غلط ہے۔ ملاحظہ ہو معجم البلدان و ابن خلکان

۵۔ ابوالیسر شاکر کو جس کا ذکر خریدۃ القصر ادباء اور نکت الہمیان وغیرہ میں بار بار آیا ہے، اور بنوابوالعلا کے بھائی ابوالمجد محمد کے پوتے کے پوتے ہیں، آپ[2] ابوالنصر لکھتے ہیں۔

۶۔ اور منتخب الدولہ کو جس کا یہ لقب الظاہر الفاطمی نے ۴۲۰ھ سے کچھ پیشتر دے کر دمشق کا گورنر بنایا تھا، اور جس کا اصل نام امیر الجیوش انوشتکین الدزبری تھا[3]، آپ منتخب الدولہ بالخاء لکھتے ہیں، ملاحظہ ہو، ذیل تاریخ دمشق لابن القلانسی۔

۷۔ اغانی کے حوالہ[4] سے راوی ہیں کہ ابوتمام کی سفارش پر اہل معرہ نے بحتری شاعر کا ایک ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر کیا تھا، حالانکہ اغانی[5] کے علاوہ وفیات[6] میں بھی چار ہزار درہم ہیں نہ کہ ایک ہزار۔

۸۔ ایک جگہ لکھتے ہیں[7] کہ قاضی عبدالوہاب المالکی جب بغداد سے مصر کو روانہ ہوئے الخ، اور دوسری[8] جگہ کہ وہ مصر سے بغداد کو الخ حالانکہ مسافر اور سفر دونوں ایک ہی ہیں، پھر دونوں باتوں کے لئے حوالہ بھی ایک ہی دیا ہے یعنی ابن خلکان ۱×۳۸۳ جو مطبوعہ مصر ۱۳۱۰ھ میں ۱×۴۰۳ پر واقع ہے، یہ صاف تناقض بے سوچے سمجھے لکھ دینے کا نتیجہ ہے۔

بے دلیل دعوے عموماً اہل مغرب اور ان کے مقلدین دعووں کے بڑے شیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے استقرا غیر تام کے برتے پر فوراً دوٹوک فیصلہ کر دیتے ہیں، جس پر سامع ان کے وسعت معلومات پر انگشت بدنداں رہ جاتا ہے، اور لطف یہ ہے کہ فیصلہ میں کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑتے، شاید اسی بنا پر ہماری منطق میں استخراج کو استقراء پر ترجیح دی گئی ہے، قاضی علی بن عبدالعزیز الجرجانی کیا خوب کہتے ہیں۔

وما اعجبتنی قط دعوی عریضة ... وان قام فی تصدیقها الف شاهد

مارگولیوتھ صاحب ہر چند کہ اپنی سنجیدگی اور وسعت اطلاع کے باعث علمائے یورپ میں سب سے بہتر ہیں، مگر گردوپیش کے حالات سے صاف بچ نکلنا ان کے بس میں نہ تھا، اس لئے

(۱) م ۴۴ (۲) م ۳۸ (۳) م ۱۳، و ۴۴ (۴) م ۱۳ (۵) دوسرا ایڈیشن ۱۸×۱۶۹ (۶) ۲×۱۷۵ (۷) م ۲۹ (۸) م ۳۴

مخصہ رسدی وہ بھی دعاوی کے خون الوان سے زلہ چیں ہوئے۔

۹۔ کہتے ہیں [۱] کہ معرہ کے شعراء کے نام جو کتب تاریخ میں ملتے ہیں، اس کی سیاسی اہمیت کے مقابلہ میں بہت کم ہیں، پھر حاشیہ پر کوئی ۵ شعراء کے نام گنائے ہیں۔

یہ دعویٰ قلت تتبع کا نتیجہ ہے، حق تو یہ تھا کہ یوں لکھتے کہ وہ وہاں کی سیاسی اہمیت کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں، یہاں ناموں کی طول طویل فہرست پیش کرنا شاید کوئی دلچسپ مواد فراہم نہ کرتا اس لئے قارئین کو میں اپنی عربی کتاب کا حوالہ دوں گا، جس میں میں نے کوئی ۷۵ شعراء کا ذکر کیا ہے، جو بنوسلیمان، بنوالدریدہ، بنوعبداللطیف، بنوابی الحصین اور بنوالمہناز وغیرہ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۰۔ ایک جگہ [۲] مدعی ہیں کہ ابوالعلاء بینائی چلے جانے کے بعد بھی چند سال تک برائے نام بصارت سے متمتع رہا، کہ پھولوں اور حروف وغیرہ کی تعریف کرنا اس امر کی دلیل ہے۔

یہ دعویٰ پادر ہوا اور بلا دلیل ہے کہ وہ اس کے اثبات میں کوئی کتابی دستاویز نہیں پیش کر سکتے بلکہ خود ابوالعلا اس کی تکذیب کرتا ہے، اکثر مورخین اس سے ناقل ہیں کہ چیچک کے دنوں (جس سے بعمر ۴ سال یہ نابینا ہوگیا تھا) مجھے چونکہ سرخ لباس پہنایا گیا تھا، اس لئے میں بجز سرخ کے اور کسی رنگ کو نہیں پہچانتا، سو نا گزیر تھا کہ اگر چیچک کے بعد کسی قسم کی بصارت باقی رہی ہوتی تو وہ اور رنگوں کو بھی پہچان سکے، اس کے دیوان سقط الزند میں ستاروں کے وصف میں جو نونیہ قصیدہ ہے، وہ شاید مارگولیوتھ صاحب کی نظر سے نہیں گذرا جو آنکھ والوں کے بس سے بھی باہر ہے اور جس کے برابر حیرت انگیز اشعار شاید کسی اندھے نے نہ کہے ہوں، دیکھئے تنویر (۱×۹۲) اور نکہت الہمیان (۸۴) جاحظ نے اعشٰی اور بشار دو اندھے شاعروں کے دو معمولی سے شعروں پر حیرت کا اظہار کیا ہے، صفدی اس واقعہ کو نقل کر کے کہتا ہے کہ اگر جاحظ کہیں ابوالعلا کے نونیہ قصیدہ کو سن پاتا تو خدا جانے اس کی حیرت کا کیا عالم ہوتا، ظاہر ہے کہ ضعیف بصارت اس درجہ ستاروں کی تشخیص پر قادر نہیں ہوسکتی تو لازمی طور پر یہ غیر معمولی دماغی قویٰ کا نتیجہ ہوگا، ہلال کو نون سے تشبیہ دینا مستلزم بصارت نہیں کہ یہ تشبیہ ابوالعلا سے پہلے کی ہے، اور اندھوں کو یہ معلوم ہونا کہ ن گول ہوتا ہے، کوئی انوکھی بات نہیں۔

۱۱۔ کہتے ہیں [۳] کہ ابوالعلا نے بغداد پہنچ کر اپنا جہاز چھڑانے کے لئے قاضی ابوالطیب

(۱) م ۱۳۴ (۲) ایضاً (۳) م ۲۲

الطبری کے کہنے پر امام ابو حامد الاسفرائنی کو اپنے عینیہ قصیدہ سے مخاطب کیا۔

یہ دعوی نہ کوئی ثبوت رکھتا ہے، اور نہ ضرورت، اس لئے کہ ابو العلا کے لئے ابو الطیب اور ابو حامد ہر دو فقیہ مساویانہ حیثیت رکھتے تھے یعنی کہ دونوں سے بغداد ہی میں ملاقات ہوئی تھی اور پھر دونوں محض فقیہ تھے، ہاں اگر بالفرض کوئی ادیب ہوتا، تو وجہ ترجیح پیدا ہو جاتی، پھر اس کے لئے ابو الطیب کی ترجیحیت کی کیا حاجت تھی۔

۱۲۔ فرماتے ہیں (۱) الشریف الرضی کی علمی مجلس شاپور کی مجلس کے نمونہ پر قائم کی گئی تھی جس کا ابو العلا نے نثر و نظم ہر دو میں تذکرہ کیا ہے، الخ۔

شاپور کے دار العلم کا تو بے شک ابو العلا نے تذکرہ کیا ہے، مگر رضی کی کوئی ایسی مجلس سرے سے تھی ہی نہیں، کسی تاریخ سے اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا، اور واقعہ یہ ہے کہ شاپور کے دار العلم اور مرتضی برادر رضی کی علمی محفل کے ہوتے ہوئے نوعمر الرضی کو ایک نئی محفل قائم کرنے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہ تھی، ہاں یہ یاد رہے کہ شاپور رضی کے خسر تھے، اور رضی کے بڑے بھائی مرتضی کی مجلس میں تو علماء کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے رہا کرتے تھے، ہم نے اپنی کتاب میں ان کی مجلس کے چند دلچسپ واقعات قلم بند کئے ہیں، پھر ابو العلا کا اس میں حصہ لینا بہت سی معتبر کتابوں سے ثابت ہو چکا ہے، مگر رضی کی مجلس کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا، اور نہ ابو العلا کا اس سے کوئی تعلق معلوم ہوتا ہے، بہت ممکن ہے کہ تشابہ سے مرتضی کی جگہ رضی کا نام لکھ ڈالا ہو، جس طرح ابن تغری بردی بھی ان سے پیشتر اسی تشابہ میں گرفتار ہو چکا ہے۔

۱۳۔ کہتے ہیں (۲) کہ ابو العلا کے بغدادی دوست ابو احمد عبد السلام نحو و جغرافیہ میں شہرۂ آفاق تھے اور حاشیہ پر معجم البلدان کی فہرست کا حوالہ دیتے ہیں۔

میں نے نسبۃً ہر سوانح نگار سے بدر جہا زیادہ عبد السلام کے اخبار جمع کئے ہیں، مگر افسوس کہ مجھے اس کی جغرافی شہرت کا کہیں پتہ نہ چلا، شاید معجم البلدان کی فہرست میں عبد السلام کا نام آنا ہی حضرت کے وہم کا باعث بنا ہے، مگر یہ تو فرمائیں کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عیسیٰ، موسیٰ، امرء القیس اور اعشیٰ وغیرہ کا بھی تو ذکر ہے، کیا یہ بھی جغرافیہ میں شہرۂ آفاق تھے؟ معجم البلدان تو اولاً ادب و تاریخ و انساب کی کتاب ہے، اور ثانیاً جغرافیہ کی، ہاں اگر بجائے جغرافیہ، لغت وادب و شعر و تفسیر کا نام لیا جائے، تو قرین صواب ہو، صاحب ذکریٰ (صفحہ ۱۶۷) نے بھی

(۱) م-۲۴۰ پھر نکلسن کو بھی اسی غلطی نے آداب صفحہ ۳۱۴ میں گرفتار پایا (۲) م ۴۴

مارگولیوتھ کی کورانہ تقلید کی ہے،اس کے الفاظ یہ ہیں، صاحب الصوت البعید فی علم تقویم البلدان، دیکھیے ایک نے رائی کے برابر غلطی کی تھی، جس کو دوسرے نے پہاڑ کے برابر بنا دیا، یہ ہیں علمی تقالید کے قبیح نتائج۔

۱۴۔ کہتے ہیں [1] کہ بغداد سے واپس ہوتے ہوئے ابوالعلا موصل تک تو کشتی میں آیا اور پھر سانڈنی پر سوار ہوا۔

یہ دعویٰ بلا دلیل ہونے کے علاوہ خود ابوالعلا کی شہادت کے خلاف ہے کہ وہ رخصت ہوتے ہوئے اہل بغداد کو اس طرح مخاطب کرتا ہے۔

اذا اطّ نسع قلت واللوم کاربی اجد کمو لم تفهموا طرب النسع

وانی لنا من ماء دجلة ؟ علی الخمس من بعد المفاوز والربع [2]

نسع یعنی تنگ سانڈنیوں کے ہوتے ہیں اور مفاوز یعنی مہیب بیابانوں سے کشتی کو کیا سروکار؟ اور پھر اغلب یہی ہے کہ ابوالعلا کو اپنی کشتی ہنوز واپس ہی نہ ملی تھی، پھر اس میں سفر کیونکر کرتا؟ اچھا چلئے یوں ہی سہی مگر موصل میں اپنی کشتی کو کس کے پاس چھوڑتا اور کیوں، رسائل [3] کے لفظ وسرت عن بغداد سیرا تخط ابله و تنط نسوعه وتوقع الغرق سفنه الخ کسی یقینی نتیجہ تک نہیں پہنچاتے۔

۱۵۔ کہتے ہیں [4] کہ پچھلے محققین بظاہر ابوالعلا کی قبر کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے، حالانکہ اس کی قبر کا مقام معرہ میں بالکل مشہور ومعروف ہے، ایک شاہد عینی نے ۱۹۰۵ء میں معرہ کی سیاحت کی تھی، کہتا ہے کہ اس کی قبر شہر کے ایک گوشہ میں محل تکریم وتعظیم بنی ہوئی ہے، اور کوفی خط میں اس پر ایک کتبہ کندہ ہے، اور اس کے قرب وجوار میں اس کے ایک شاگرد کا مزار ہے، اور دونوں کے مقابل ایک گنبد میں شیخ محمد غباری کی تربت ہے، ہمارے ایک دوست نے لکھا ہے کہ مصر کے جریدہ العمران میں یہ چھپا تھا کہ معرہ کے رئیس نورس پاشا نے اس کے مزار کی اصلاح کرائی اور وہاں بچوں کے لئے ایک مکتب کھول دیا ہے۔

ناکافی تامل اور سہل انگاری کے نتائج

گاہ گاہ ناکافی تامل اور فقدان غور رسی کی بنا پر

(۱) م ۲۸ (۲) جب راہ میں کوئی تسمہ چرچرانے لگتا ہے تو میں یوں کہتا بحالیکہ ملامت گلوگیر ہوتی، بائے تم تسمہ کے اشتیاق کو نہیں سمجھے، ورود دشت بیابانوں کے بعد جب کہ جانوروں کو پانی پیے ہوئے چار چار پانچ پانچ دن گذر چکے تھے ہمیں آب دجلہ کا جرعہ کیونکر نصیب ہوتا (۳) ۳۲ (۴) م ۴۳

بعض عجیب وغریب اوہام کا شکار ہو گئے ہیں، مثلاً

۱۶۔ کہتے ہیں [۱] اس کے رسائل وغیرہ میں کہیں اس کے دونوں بھائی ابوالہیثم اور (ابوالمجد) محمد کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

ہاں ابوالہیثم کا اس کی اپنی تالیفات میں بے شک کہیں کوئی ذکر نہیں، مگر محمد کا ذکر تو موجود ہے، دیکھئے رسائل صفحہ ۱۱۲ پر اس کو وہ ان لفظوں میں یاد کرتا ہے، و اما سیدی ابو المجد فشغله من قلة الفائدة یکاد یمنع نومه الخ یعنی برادر ابوالمجد تو شب و روز دوسروں کی کاربراری میں منہمک رہتے ہیں، تعجب ہے کہ خود رسائل کا طابع و ناشر و مترجم یہ کہے کہ اس کا کہیں ذکر نہیں اس غفلت کے باعث بظاہر دو ہیں۔

(الف) مارگولیوتھ کو یہ معلوم ہی نہیں کہ محمد مذکور کی کنیت ابوالمجد ہے، حالانکہ ادبا، اور خریدہ وغیرہ میں یہ تصریح مذکور ہے۔

(ب) انھوں نے ابوالمجد [۲] سے کسی مستملی (کاتب) کو مراد لیا ہے، احتمالاً، مگر یہ احتمال باطل ہے، اس لئے کہ مامون کے خط میں مستملی کا ذکر بے محل ہے، اور پھر اس کو بلفظ سیدی یعنی میرے آقا یاد کرنا اور بھی ناموزوں اور یہ دونوں باتیں ابوالمجد محمد پر خوب چسپاں ہیں، اس لئے کہ وہ بڑے بھائی تھے اور ساتویں صدی ہجری تک ان کے سلسلہ نسب کی بقا کا ثبوت بذریعہ شجرہ ہم نے اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔

۱۷۔ کہتے ہیں [۳] کہ بغداد میں المغربی اور ابوالقاسم بن جلبات سے اس کے تعلقات نے اندرونی دائرہ میں اس کے داخلہ کی راہ کو صاف کر دیا۔

باوجود کاوش ہمیں کہیں نہیں معلوم ہوا کہ ابن جلبات ہنوز بقید حیات ہوں، ان کا پتہ بجز سقط کے میمیہ کے اور کہیں سے نہیں چلتا یتیمۃ الدھر میں مذکور ہے، کہ وہ شاپور کی مجلس کا شاعر تھا۔ اور میمیہ کہتا ہے کہ عضدالدولہ نے بغداد میں اس کو ایک نہایت جلیل القدر منصب پر فائز کیا تھا، عضدالدولہ کی وفات کے بعد وہ اس منصب سے معزول کئے گئے، جس کا نتیجہ بظاہر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ (معرہ میں) خانہ نشیں ہو گئے ہوں۔

المغربی کے متعلق مارگولیوتھ نے بہت کچھ غلطیاں کی ہیں ان کو ہنوز یہی معلوم نہیں کہ یہاں وہ لمغربی ہیں، ایک تو باپ یعنی ابوالحسن علی اور دوسرا فرزند یعنی ابوالقاسم الحسین جو ابوالعلا

(۱) م ۴۳ (۲) م ۴۴ (۳) م ۴۵

کا گہرا دوست اور اس کی فضیلت کا معترف ہے، ابوالقاسم الحسین اس وقت تک سرے سے بغداد پہنچا ہی نہ تھا، پھر اس کے اہل بغداد سے تعلقات کے کیا معنی، ابوالقاسم شام میں پیدا ہوا، اور پھر عنفوان شباب میں اپنے باپ کے ہمراہ مصر چلا گیا، جہاں شباب کے بقیہ ایام گذارے، پھر جب الحاکم العلوی نے اس کے باپ کو ۴۰۰ھ میں قتل کر دیا، تو یہ بھاگ کر حسان بن مفرج صاحب رملہ کے یہاں پہنچا، اور چند سال حاکم کے خلاف مصروف سازش رہا، پھر کہیں ۴۰۴ھ کے چند سال بعد بغداد کے اطراف میں پہنچا، جس طرح بلا اختلاف تمام عربی تاریخیں شاہد ہیں مثلاً ابن القلانسی اور ابن الاثیر وغیرہ۔

۱۸۔ کہتے ہیں [۱] کہ المغربی نے جب کہ مصری لشکر حلب کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، عام اہل معرہ کو اپنے ایک سیاسی خط سے مخاطب کیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ تمام اہل معرہ مصریوں کے ساتھ مل گئے پھر جب ان پر حلبی (آل حمدان) حملہ آور ہوئے تو مصری انھیں بچانے آئے۔

اس غلطی کے کھولنے کا محل کوئی اور موقع تھا مگر تسلسل مبحث کے لئے ہم نے یہیں ذکر کیا یہ قول چند اوہام کا مجموعہ ہے، (ا) دونوں مغربیوں میں کوئی تمیز نہیں رکھی کہ بتلائے گریزی وسیاسیات ابوالحسن تھا اور خط لکھنے والا ابوالقاسم جو بباعث صغرسنی کسی طرح سیاسیات میں حصہ لینے کا اہل نہ تھا، ملاحظہ ہو معری کا وفیات الاعیان وغیرہ میں اس کا حال (ب) ابوالقاسم نے یہ رسالہ مصر سے بھیجا تھا نہ کہ حلب سے، ملاحظہ ہو معری کا وہ جوابی رسالہ جس کا نام رسالۃ المنیح ہے، صفحہ ۹ وان ضرب ارواق البتیہ بمصر (ج) یہ غلط ہے کہ اہل معرہ حمدانیوں کو چھوڑ کر مصریوں کی طرف مائل ہوں، اس لئے کہ اسی زمانہ میں یعنی ۳۹۰ھ میں ابوالعلا نے سقط کا پہلا قصیدہ لامیہ سعید الدولہ نبیرۂ سیف الدولہ کی مدح میں تیار کیا تھا، ملاحظہ ہو قلمی نسخہ موجودہ ببلیوتھک نیشنل پیرس نیز ابوالعلا نے مصریوں سے نفرت ظاہر کرنے کے لئے بیسیوں اشعار کہے ہیں، جو اپنی کتاب میں دئے ہیں منجملہ ان کے دو شعر یہ ہیں:

یقولون [۲] فی المصر العدول وانما	حقیقة ما قالوا لعدول عن الحق
ولست بمختار لقومی کونهم	قضاة ولا وضع الشهادة فی رق

(۱) ترجمہ، رسائل، بعد کو دیکھا کہ یہ دعویٰ نکلسن نے بھی دائرہ صفحہ ۵۷ میں کیا ہے (۲) کہتے ہیں مصر میں ثقہ لوگ ہیں، سچ پوچھو تو باطل پرست ہیں، بھائی میں تو اپنی قوم کے لئے بھی یہ بات پسند نہ کروں گا کہ وہ قضا کا منصب سنبھالیں، یا دستاویزوں پر شہادتیں دیتے پھریں۔

نیز ابو العلا حمدانیوں کی طرف اپنے میلان بایں الفاظ ظاہر کرتا ہے: [۱]

لا تامنن فوارساً من عامر الا بذمة فارس من وائل

تبریزی کہتے ہیں کہ ملوک حلب وغیرہ آل وائل سے ہیں، اور ملوک عراق اور الجزیرہ اہل عامر بن صعصعہ سے، تو گویا وہ عامر سے شکایت ظاہر کرتا ہے، اور وائل کا شکریہ، پھر اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وائل کا ایک سوار عامر کے چند سواروں کے برابر ہے، الخ

(د) ابوالعلا کے رسالہ المنیح کو سیاسیات سے کوئی سروکار نہیں، جس طرح ہم نے اس کے مضمون سے اپنی کتاب میں بالتفصیل بحث کی ہے۔

لطیفہ ڈاکٹر طٰہٰ مصری نے اس موقع پر مارگولیوتھ کے رد کرنے کی بڑی کوشش کی ہے، مگر آنجناب والد کا نام ابوالحسن الحسین بن علی المغربی بتاتے ہیں، جو باپ اور بیٹے کے نام کا مجموعہ ہے، (دیکھو ذکری ص ۱۵۹)

۱۹۔ ابواحمد عبدالسلام کی بابت فرماتے ہیں کہ اس نے ابن السیرافی کے لکچر سنے تھے، جس کو آپ نے چھوٹے سیرافی کے نام سے یاد کیا ہے۔

یہ سراسر غلط ہے، اس لئے کہ ابواحمد سیرافی کے شاگرد تھے نہ کہ ابن السیرافی کے، جس طرح آئندہ حکایت بالتصریح دلالت کرتی ہے۔

اصلاح المنطق [۲] کے ایک نسخہ سے منقول ہے کہ ابوالعلا معری کہتے ہیں کہ مجھ سے عبدالسلام البصری نے کہا (جو بغداد کے دارالعلم کے لائبریرین اور میرے مخلص دوست تھے) کہ میں ابوسعید سیرافی کی مجلس میں اس وقت حاضر تھا جب کہ قاری ان سے اصلاح المنطق لابن السکیت پڑھتے ہوئے اس بیت پر پہنچا:

ومطویة [۳] الاقراب اما نهارها فسبت واما لیلها فذمیل

تو ابوسعید بولے اس کو مطویۃ بالکسر بنالو کہ یہ واو رب ہے، میں نے کہا ایہا الشیخ! پہلا شعر تو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ بالرفع ہو اور وہ یہ ہے کہ

اتاک [۴] بی الله الذی انزل الهدی ونور واسلام علیک دلیل

(۱) سقط ۱×۱۵۷ تو عامر کے سواروں سے کبھی مطمئن نہ ہو جائیں، جب تک کسی وائلی سوار کی ضمانت نہ ہو (۲) ابن خلکان ۲×۳۵۰ (۳) اور باریک کمر والی سانڈنی جو شب و روز ہلکی اور پھرتیلی چال چلتی ہے۔ (۴) مجھے تم تک وہ خدا لایا ہے جس نے ہدایت اتاری ہے، اور نور اور اسلام جس نے تم تک میری راہ نمائی کی ہے۔

ومطویہ الخ تو انھوں نے بالرفع بنوادیا، اس موقع پر ان کے صاحبزادہ ابومحمد (ابن السیرافی) حاضر تھے، وہ بگڑے اور فوراً اٹھ کر اپنی گھی کی دکان فروخت کر کے طلب علم کی طرف متوجہ ہوئے، تا آنکہ وہ جلیل القدر فاضل بن گئے اور اصلاح المنطق کی شرح تیار کی، ابوالعلا کہتے ہیں مجھ سے اس شخص نے کہا جس نے انھیں یہ شرح لکھتے ہوئے دیکھا تھا کہ اس کی تصنیف کے وقت ان کے پیش نظر چار سو کتابیں تھیں، یہ اشعار تہذیب الاصلاح کے نسخہ مطبوعہ کے صفحہ ۱۵ پر واقع ہیں، یوں بھی عبدالسلام اور ابن السیرافی قریباً ہم سن ہیں۔

۲۰۔ کہتے ہیں [۱] کہ ابوالعلا کو اس کے ماموں (ابوطاہر) نے شرح کتاب سیبویہ للسیرافی کے نقل کرانے کے لئے لکھا، جب کہ ابوالعلا بغداد میں تھا الخ۔

مارگولیوتھ صاحب کی یہ وہ فاش اور مہمل غلطی ہے، جس نے رسائل کے دسویں اور سوانح کے بیسویں حصہ کا ستیاناس کر دیا ہے، اسی بنا پر وہ ابوبکر احمد [۲] (کذا اور درست محمد ہے، دیکھو رسائل ص ۴۵) الصابونی کو ابوالعلا کے بغدادی احباب میں شمار کرتے ہیں، اور پھر رسائل ۱۰، ۱۱، ۱۵ کے تراجم میں بری طرح خبط کر دیا ہے، تعجب ہے کہ ہمارے مصری نابینا ادیب عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے بھی چشم بصیرت وا نہ کی اور اندھادھند مارگولیوتھ کے پیچھے ہو لئے۔ [۳]

اس غلطی کا منشا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عنوان رسالہ ۱۰ کے یہ الفاظ ہیں وکتب الی ابی طاھر المشرف بن سبیکہ وھو ببغداد یذکر لہ امر شرح السیرافی وماجری فیہ من التعب" ممکن ہے کہ یہ غلطی جامع رسائل کی ہو جس طرح خود مارگولیوتھ نے اس غلطی سے ایک اور [۴] جگہ نسبت دی ہے، مگر جامع کی بہ نسبت خود مارگولیوتھ صاحب غلطی سے نسبت دیے جانے کے کہیں زیادہ اہل ہیں کہ صرف اس زعم پر کہ ابوالعلا کی رحلت بغداد ثابت ہے انھوں نے بتقاضائے ظاہر مضامین محتویہ سے آنکھیں بند کر کے ھو کی ضمیر کا مرجع ابوالعلا کو گردانا ہے نحاۃ نے کیا خوب کہا ہے کہ ضمائر مبہمات میں سے ہیں، میری رائے تو یہ ہے کہ بجائے معارف کے ان کو نکرات میں شمار کیا جائے، تاکہ پھر قلیل البضاعۃ لوگ ایسی غلطیوں سے محفوظ رہیں، مگر جائے حیرت ہے کہ مارگولیوتھ یہ بھول گئے ہوں کہ یہ چاروں رسائل متعلقہ شرح ۱۰ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۳ ایک ہی سلسلہ میں منسلک ہیں، اور عنوان رسالہ ۱۲ و ۱۳ میں یہ تصریح موجود ہے، کہ خود ابوطاہر بغداد سے واپس آئے تھے، حالانکہ مارگولیوتھ تو ان کو حلب میں بٹھلا کر ان کے ہاتھوں ابوالعلا کی طرف یعنی بغداد کی طرف

(۱) م ۲۵ (۲) م ۲۶ (۳) ذکری ۱۳۲ (۴) م ۴۰

شرح کے لئے خط لکھوا رہے ہیں، یہی نہیں بلکہ مضامین کی طرف مطلقاً توجہ نہیں کی، رسالہ ۱۰ میں ہے کہ "آپ نے جو نسخہ کی تحصیل کی کیفیت لکھی ہے، اس کو میں سمجھ گیا آپ بڑے مہربان ہیں اور میں ناحق بار خاطر بنتا ہوں، آپ نے حسب معمول کرم کیا اور میں ناحق بفند ہوا۔"

اسی رسالہ میں ابو عمرو استر آبادی کا تذکرہ ہے، جن کی طرف اسی مطلب کے لئے رقعہ نمبر ۱۱ لکھا گیا ہے، اگر ابو العلا خود بغداد میں ہوتا تو ابو عمرو کی طرف رقعہ کیوں بھیجتا پھر رسالہ نمبر ۱۰ کے اختتام پر ہے، میں آپ کی طرف وہ سلام بھیجتا ہوں جس سے کاغذ معطر اور آپ کے خشک راستے سرسبز ہو جائیں"۔ میں مارگولیوتھ ہی کے جواب پر قانع ہوں، اس لئے وہی بتائیں کہ خشک راستے مقیم کے ہوتے ہیں یا مسافر کے، رسالہ نمبر ۱۲ میں جس کے عنوان میں ابو طالب کے بغداد سے واپس آنے کا تصریحاً ذکر ہے، ابو العلا لکھتا ہے "براہ کرم مجھے یہ تو بتایئے کہ میری فرمائش پر آپ نے کتنی رقم صرف کی ہے تاکہ میں فوراً ارسال کر دوں کہ اگر میں خود بھی موجود ہوتا تو مجھے آپ کے برابر کبھی مطلب برآری میں کامیابی نہ ہوتی۔" العجب ثم العجب بین جمادی و رجب کہ جب نفس رسالہ اور اس کے عنوان ہر دو میں ابو طاہر کے بغداد سے واپس ہونے کا ذکر ہے، تو مارگولیوتھ صاحب ابو العلا کو کیوں بغداد بھیج رہے ہیں، ابو العلا نے رحلت بغداد میں اپنے ماموں کے جہاز پر سفر کیا تھا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دریائے فرات میں ایک مخصوص جہاز اپنے تجارتی اغراض کی خاطر ہمیشہ محفوظ رکھتے تھے، جس کا بظاہر مارگولیوتھ نے یہ مطلب سمجھا ہے کہ ابو العلا کے لئے یہ جہاز عمداً مہیا کیا گیا تھا، جس کا کوئی ثبوت نہیں، نیز عقلاً بھی یہ خیال بے معنی ہے کہ ایک شخص اپنے اس سفر کے لئے جس سے وہ واپسی کا کوئی ارادہ نہ رکھتا ہو جس طرح مارگولیوتھ کو بھی تسلیم ہے، ایک مستقل جہاز بنوائے، ابو العلا اپنے ماموں کی دائمی سیاحت کے متعلق کہتا ہے:

كان بني سبيكة فوق طير يجوبون الغوائر والنجادا
ابا الاسكندر الملك اقتديتم فما تضعون في بلد وسادا

یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ بیچارہ غریب ابو طاہر جو بجز تجارت کے اور کوئی مشغلہ نہ رکھتا تھا شرح سیرانی کو جو نحو کی انتہائی کتاب ہے، کیا کرتا؟ ہاں ابو العلا کو بیشک اس کی سخت ضرورت تھی، کہ وہ ابھی ابھی تصنیف ہوئی تھی، اور ہنوز شام میں اس کے نسخے عام طور پر نہیں ملتے تھے سو تا گزیر ہے کہ شرح کے لئے ابو العلا نے اپنی رحلت بغداد سے پیشتر ابو طاہر کو لکھا ہو، ورنہ بغداد میں تو اس نے شرح کے بیسیوں نسخے دیکھے ہوں گے، جس طرح وہ اس کے کثیر نسخوں کے بغداد میں پائے

جانے کا خود[۱] ہی ذکر کرتا ہے، اور یوں بھی بغداد سے واپس ہو کر ابو العلا کو کتب نحو کا اتنا شوق نہ رہا تھا جس طرح لزوم میں خود ہی کہتا ہے (ملاحظہ ہو ہماری کتاب) اگر یہ کہا جائے کہ بغیر سابقہ ملاقات کے وہ ان اصحاب کو شرح کی تحصیل کی زحمت کیونکر دے سکتا تھا، تو ہم کہیں گے کہ قبل از رحلت بغداد ابو العلا کے اہل بغداد سے دوستانہ تعلقات موجود تھے، (ملاحظہ ہو اس کا رقعہ قاضی[۲] ابو الطیب کی طرف) یہ بات[۳] مارگولیوتھ کو بھی تسلیم ہے کہ بغداد میں ابو طاہر کے بہت سے احباب تھے، جنھیں ہمیشہ وہ بذریعہ خطوط ابو العلا کی خاطر مدارات کی تاکید کرتا رہتا اور یہ واقعہ اس امر کی دلیل ہے کہ ابو طاہر عموماً بغداد آیا جایا کرتا تھا۔

۲۱۔ کہتے ہیں[۴] کہ ابو العلا جب بغداد جاتے ہوئے دریائے فرات میں کشتی پر سوار ہوا تو انبار تک کشتی صحیح وسلامت پہنچ گئی، جہاں سے ایک اور نہر دریائے دجلہ سے جا ملتی ہے اور بغداد پہنچاتی ہے، مگر چونکہ یہ راستہ اس موسم میں ناقابل سفر تھا اس لئے کسی اور راہ (صراط) سے قادسیہ پہنچی، الخ۔

مارگولیوتھ صاحب کی تحریر میں اس سے بڑھ کر حیرت انگیز اور مضحکہ خیز غلطی شاید اور کوئی نہ ہو، بھلا قادسیہ سے جو بادیہ میں واقع ہے، اور کوفہ سے ایک مرحلہ پر ہے، کشتی سے کیا سروکار، کیا یہاں بھی یورپ کے آلات جر ثقیل کی مدد سے کشتی کو خشکی پر چلا دیں گے، بہت اچھا مگر اس خشکی کے شہر پر ٹیکس وصول کرنے والے کہاں سے آئے کہ وہ تو بندرگاہوں پر متعین ہوتے ہیں کیا انھیں وائرلیس کے ذریعہ یہ اطلاع پہنچ گئی تھی کہ ابو العلا کی کشتی قوت اعجاز کی مدد سے خشکی پر چلنے والی ہے۔

یہ لفظ فارسیہ ہے، بالفاوالراء جو نہر عیسی کے کنارے محول کے بعد بغداد سے دو فرسنگ کی مسافت پر ایک گانوں ہے، تبریزی کی شرح السقط مسمّی ایضاح السقط وضوئه میں یہ لفظ اسی طرح بالفاوالراء ہے، یہاں قادسیہ نام کا ایک گانوں جو سامرا کے قریب نہر دجیل پر واقع ہے، مراد نہیں لیا جا سکتا کہ جب ابو العلا کے لئے یہ ممکن ہے کہ بغداد کے ایک قریبی اسٹیشن پر اتر سکے، تو دور جانے سے کیا فائدہ، افسوس کہ ڈاکٹر طٰہٰ نے بھی مارگولیوتھ کی کورانہ پیروی کی ہے، (دیکھو ذکری ص ۱۳۰)

اشتباہ کا باعث سقط کے یہ دو بیت ہیں:

سارت فزارت بنا الانبار سالمة	تزجی وتدفع فی موج ودفاع

(۱) رسائل صفحہ ۳۸ اذ کانت عند طلاب العلم بمدینة السلام کشجر العری لایسقط ورقه الخ

(۲) رسائل ۶۲ (۳) ایضاً ص ۳۱ (۴) م ۲۱

والقادسیة ادتها الی نفر طافوا بها فاناخوها بجعجاع

تمام نسخ سقط اور طبعۂ تنویر میں بھی یہ قادسیہ ہی ہے، اور یہ تصحیف و تحریف کوئی آج کی نہیں بلکہ اب سے کوئی ساڑھے آٹھ سو سال پیشتر شیخ برہان الدین ابوالمظفر ناصر الدین ابن ابی المکارم عبدالسید المطرزی بھی (جو سقط کو اپنے والد سے اور وہ ابوالمکارم الابہری سے جو ابوالعلا کے مشہور ترین شاگرد ہیں، روایت کرتے ہیں) اسی تحریف میں مبتلا ہو گئے تھے حتی کہ ایک فاضل نے انھیں ٹوکا کہ حضرت یہ الفارسیہ ہے، نہ کہ القادسیہ مگر جب وہ بضد ہوئے تو وہ ان کو خوارزم کے ایک علامہ کے پاس لے گیا، جس نے اس فاضل کے حق میں فیصلہ کیا، غلطی تو بارع سے بھی سرزد ہوئی تھی، مگر انھوں نے ابوالعلا کے جہاز کو کشتی پر چڑھانے کی جانکاہ زحمت نہ اٹھائی، یہ مہم مارگولیوتھ صاحب ہی نے سر کی۔

۲۲۔ یہ امر مسلم ہے کہ ابوالعلا کے ایک لائبریرین ابومنصور نامی سے دوستانہ تعلقات موجود تھے، جن کا ثبوت رسالہ نمبر ۱۹ سے ملتا ہے، جس میں علاوہ طول طویل دوستانہ اشتیاق کے اس امر کا بھی اظہار ہے کہ میں نے ایک لزومیہ قصیدہ، بحر طویل میں بھیجا تھا نہ معلوم وہ پہنچا یا نہیں۔

یاقوت اور ابن حجر دونوں بزرگوں نے ابومنصور محمد بن طاہر بن حمد الخازن کا ترجمہ دیا ہے، جو تنوخی صغیر کے تلمیذ تھے، اور ان کی ولادت ۴۱۸ھ اور وفات ۵۱۰ھ میں واقع ہوئی تھی، یاقوت نے غرس النعمہ کی کتاب سے ایک دلچسپ حکایت نقل کی ہے کہ شاپور بن ازدشیر وزیر بہاء الدولہ دیلمی کے کتب خانہ میں ابومنصور نامی ایک لائبریرین متعین تھے شاپور کی وفات کے بعد کتب خانہ کی سرپرستی شریف مرتضی کے متعلق ہوئی، انھوں نے ابومنصور کے ساتھ ابوعبداللہ بن حمد کو متعین کیا، ابوعبداللہ آفت کا پرکالہ تھا، ہمیشہ ابومنصور کی تضحیک کی فکر میں رہا کرتا تھا، حتی کہ اس نے ابومنصور سے کہا کہ حضرت کتابیں تو اب تباہ ہو گئیں، وہ بولے کیوں؟ کہا پسوؤں کی خباثت سے لہذا آپ فوراً سید مرتضی کو اطلاع دیں تاکہ وہ آپ کو پسوؤں کے فنا کرنے کی دوا دیں، جو ان کے یہاں ہمیشہ تیار رہتی ہے، یہ بھولے بھالے فرشتے لپکے ہوئے سید مرتضی کے ہاں آ دھمکے، اور مؤدبانہ طور پر ماجرا عرض کیا، اس پر مرتضی نے کہا "ارے پسوؤں سے ارے پسوؤں سے! خدا ابن حمد کو سنوارے اسے ہمیشہ شرارت و تمسخر ہی سوجھتی ہے، آپ جائیں اور آئندہ کبھی ابن حمد کی نہ سنیں۔" یاقوت نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ اس میں ابن حمد کی کنیت بجائے ابومنصور کے ابوعبداللہ بتائی گئی ہے، نیز اس پر کہ ابن حمد کی ولادت ۴۱۸ھ میں ہوتی ہے اور مرتضی کی وفات ۴۳۶ھ میں سو ابن حمد

تیرہ چودہ سال کی عمر میں کیونکر اس عہدۂ جلیلہ پر متمکن ہوسکتا تھا۔

اب ذرا مار گولیوتھ صاحب کے چار دعوے سنیئے جو حیرت انگیزی میں اپنی آپ ہی نظیر ہیں (ا) علاوہ رسالہ نمبر ۱۹ کے سقط [۱] کا طائیہ قصیدہ جس کا عنوان ''بنام خازن دار العلم بغداد ہے'' انہی کو مخاطب کرتا ہے اور (ب) رسالہ نمبر [۲] ۱۹ میں جس قصیدہ کے ارسال کا ذکر ہے اس سے یہی طائیہ مراد ہے (ج) ابوالعلا [۳] کا ابومنصور وہی ہے، جس کا یاقوت نے بنام محمد ابن حمد الخ کا ترجمہ دیا ہے (د) یاقوت [۴] کا تعدد کنیت پر شک ظاہر کرنا سراسر وہم ہے۔

یہ تھا دعاوی فارغہ کا مجموعہ، حیرت ہے کہ ان میں نہ عقل سے کام لیا گیا ہے اور نہ علم سے، بھلا جب وہ ادباء میں اپنی آنکھوں سے اس کا سنہ ولادت ۴۱۸ھ کو دیکھ رہے ہیں اور پھر خود ہی مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ ابوالعلا بغداد میں اس ابومنصور سے ملا تھا، ۳۹۹ھ میں تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ اپنی ولادت سے ۱۹ سال پیشتر کم از کم جوان ہوکر ابوالعلا کا دوست بنا، ان ھذا الا اختلاق سقط کا طائیہ رسالہ نمبر ۱۹ کے مذکورہ لزومیہ سے کیونکر مراد ہوسکتا ہے کہ طائیہ سقط میں ہے، جس میں لزوم کے دو شعر بھی نہیں ہیں، رہا طائیہ کا مخاطب تو ابومنصور کے بجائے ابواحمد عبدالسلام کا ہونا کہیں زیادہ قرین قیاس ہے، جن کا ابوالعلا کی تالیفات میں بارہا ذکر آیا ہے، اور یاقوت کو وہم سے نسبت دینا محض خالی خولی دعوی کی بنا پر کیونکر روا ہوسکتا ہے، آیئے اب یہ ناچیز نو سو سال کے کثیف پردوں کو چشم زدن میں الٹ دیتا ہے، **وللہ الحمد علی ذلک۔**

یہاں تین تاریخی شخص ہیں (ا) ابوالعلا کے دوست ابومنصور، خازن دار الکتب القدیمۃ جن کا نام بتصریح ابوالعلا محمد بن علی ہے، اور جو صاحب اسمٰعیل کی مجلس میں آمد و رفت رکھتے تھے اور بڑے زبردست ادیب ولغوی تھے، انھوں نے لغت میں الشامل لکھی ہے، جو ۴۱۶ھ میں ان سے پڑھی گئی تھی، اصل میں ہیرے کے باشندے تھے، مگر اصفہان میں ایک عرصہ رہے تھے، غرس النعمہ کی حکایت میں ابومنصور سے یہی مراد ہیں۔ (ب) ابومنصور ابن حمد جن کا ترجمہ یاقوت اور ابن حجر نے دیا ہے، ان کو ابوالعلا سے ذاتی طور پر کوئی واسطہ نہیں، ہاں ان کے نام کا محمد ہونا نیز ان کے نام کے ساتھ خازن کا استعمال ہونا، یقیناً وہم کا باعث بنا ہے، ہم جزماً کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کس کتب خانہ کے خازن تھے، یا سرے سے ان کو خازنی سے نسبت دینا ہی وہم ہے۔ (ج) ابومنصور ابن حمد کے برادر ابوغالب ابن حمد الخازن، ان کا نام بھی بدقسمتی سے محمد ہی ہے، لپزیگ یونیورسٹی

(۱) حاشیہ ۴ ترجمہ رسالہ نمبر ۱۹ (۲) ایضاً (۳) حاشیہ معجم الادباء ۶×۳۵۸ (۴) ایضاً ایضاً ۶۰×۳

لائبریری میں شعرابی ذہبل الجمی کا ایک نہایت قدیم نسخہ محفوظ ہے، جس کے اول وآخر کے ورقوں پر متعدد ائمہ کے خطوط سماع ثبت ہیں، جن میں ان ابو غالب الخازن نے قاضی تنوخی صغیر سے دیوان مذکور پڑھتے ہوئے تمام شرکائے درس علماء کے اسامی دئے، جن میں ان کے برادر ابو منصور ابن حمد کا نام بھی بدون لفظ خازن مذکور ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ ابو غالب خازن ہو، جس طرح ان خطوط میں موجود ہے، اور ابو منصور نہ ہو، اور اس کو اپنے سابق کے ساتھ اتحاد اسمی کی بنا پر خواہ مخواہ غلطی سے خازن بنادیا گیا ہو، بظاہر غرس النعمہ کا ابو عبداللہ ابن حمد یہی ابو غالب ہو، جس طرح ابو غالب کے لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابو منصور بن حمد کا برادر بزرگ ہے، سو ممکن ہے کہ اس کی دو کنیتیں ہوں بایں صورت یاقوت کا کم سنی کا اشکال بھی رفع ہو جائے گا کہ ہم نے ابو منصور صاحب ابی العلا کے ساتھ دوسرا خازن اس کمسن کے برادر مہتر ابو غالب کو قرار دیا ہے، فتخلصت قاعبة من قوب و لله الحمد خطوط سماع کے فوٹو کے لئے ملاحظہ ہو، جرنل آر، اے، اس ۱۰۱۷، ۱۰۷۵ ۱۹۱۰ء، میں نے یہ مضمون ایک معقول اضافہ کے ساتھ اپنے مضمون مطبوعہ اورنٹیل کالج میگزین لاہور، فروری ۱۹۲۵ء سے لیا ہے۔

۲۳۔ کہتے ہیں (۱) کہ وہ بغداد کے ایک پرانے حصہ سویقہ ابن غالب میں ٹھہرا۔

یہ بیان ناکافی اور موہم ہے، حاشیہ میں وہم نے اور بھی اضافہ کردیا ہے، سویقہ ابن غالب کی تصحیح ہم نے پہلے کردی ہے یعنی کہ وہ سویقہ غالب ہے، بے شک ابو العلا بغداد پہنچتے ہی سویقہ ابن غالب میں ٹھہرا تھا، جس طرح حکایت (۲) ابو الطیب میں موجود ہے، مگر پھر مستقل قیام کے لئے شاپور کے دار العلم متصل دار الکتب القدیمہ میں منتقل ہو گیا تھا، جو قطیعۃ الفقہاء واقعہ کرخ بغداد میں تھا، ہماری دلیل مہیار دیلمی کے یہ ابیات ہیں:

نزلنا في بني ساسان دورا ۔۔۔ بها تسلى بيوتک في قضاعه

اذا ما الضيم رابک فاستنجزى ۔۔۔ ذرى سابور وانتجعى بقاعه

اور خود ابو العلا کے یہ ابیات (در بغداد)

وغنت لنا في دار سابور قينة ۔۔۔ من الورق مطراب الاصائل ميهال

قاضی تنوخی کو لکھتا ہے، بعد از رجوع

ايام واصلتني ودا وتكرمة ۔۔۔ وبالقطيعة داری تحفر النهر

بمجلة الفقهاء لا يعشو الفتى ۔۔۔ ناری ولا نيضو المطى عزائمى

(۱) م ۲۲ (۲) وفیات ۱× ۲۳۳

تعجب انگیز تو یہ ہے کہ مارگولیوتھ نے کرخ یعنی نئے بغداد سے نکال کر اس کو ایک پرانے حصہ ہی میں مقیم رکھا، حالانکہ اس نے کرخ کی یاد میں لزوم وسقط میں بہت سے ابیات کہے ہیں، چنانچہ بغداد سے روانہ ہوتے ہوئے وہ اہل کرخ کو ان الفاظ میں مخاطب کرتا ہے:

وما الفصحاء والصيد واليد ودارها بافصح قولا من امائكم الوكع

اس بحث کا تسلسل ہماری اصل کتاب میں ملاحظہ ہو۔

عادات شرق سے بے گانگی بعض اغلاط اہل مشرق کے عادات سے نابلد ہونے کا نتیجہ ہیں مثلاً

۲۴۔ کہتے ہیں [۱] کہ ابوالعلا بار بار اپنے وطن کی جو دماغی اور جسمانی حالت بیان کرتا ہے، وہ قابل افسوس ہے، لیکن اس کی تصدیق اور کسی نے نہیں کی، پھر فرماتے ہیں کہ ہم معرہ کے لوگوں کی بابت جو کچھ جانتے ہیں، وہ اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم وہاں کی دماغی حالت کا اندازہ ابوالعلا کے اپنے بیان سے زیادہ کریں گے، گویا آپ ابوالعلا کے وطن کے متعلق خود ابوالعلا سے زیادہ واقف ہیں اور وہ اپنے بیان میں کاذب ہے، سبحان اللہ وہ بیچارا مشرقی ہے، کسر نفسی اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، یعنی کہ خود اپنے کو اور اپنے سے متعلق ہر شے کو اس کی موجودہ حالت سے کمتر ظاہر کرتا ہے، ابوالعلا لزوم میں کہتا ہے:

اتسالون جهولا ان يفيدكم وتحلمون سفيا ضرعها يبس

کیا مارگولیوتھ صاحب ابوالعلا کو جاہل کہیں گے، یا دوسرے کے بیان کی مدد پر اس کی تکذیب کو اٹھ کھڑے ہوں گے، نیز ابوالعلا کا مطمح نظر اتنا بلند تھا کہ معرہ اس کے لئے کافی جولانگاہ فراہم کرنے کے قابل نہ تھا، اس لئے وہ ابتدائے شباب ہی سے بغداد کا خواب دیکھتا تھا۔

كلفنا [۲] بالعراق ونحن شرخ فلم نلمم بها الا كهولا

عصبیت بہت سے اغلاط مسیحی تعصب یا ملی منافرت کا نتیجہ ہیں، مثلاً

۲۵۔ انھوں نے ابوالعلا کے غیر معمولی حافظہ کے متعلق جو حکایات مشہور ہیں، ان کی بلاوجہ تکذیب کی ہے [۳]، حالانکہ بعض تو روایت و درایت ہر دو اصول پر صحیح اترتی ہیں، ایک حکایت کے راوی تو تبریزی ہیں، جو ابوالعلا کے خاص الخاص شاگرد ہیں، اور ان کی بابت علمائے رجال کا یہ قول ہے، و كان ثقة فيما يرويه تبریزی سے سمعانی صاحب انساب راوی ہیں،

(۱) ص۹۴ (۲) ہم آغاز شباب ہی سے بغداد کے مشتاق تھے، مگر کہیں ادھیڑ پن میں جا کر وہاں پہنچے (۳) ص۱۵

جو دو ایک واسطے [۱] سے ان تک پہونچتے ہیں، و کلھم ثقات ہم نے اپنی کتاب میں ان سے کہیں زیادہ محیر العقول واقعات اصمعی اور امام بخاری کے حافظ کے متعلق نقل کئے ہیں، تو کیا مارگولیوتھ صاحب ان کی بھی تکذیب کریں گے:

اکل امرئ الفی اباہ مقصرا معادٍ لاھل المکرمات الاوائل [۲]

ملت اسلامیہ اور خاصۃ عرب جس فطری مزیت پر اقوام عالم کو چیلنج دے سکتے ہیں، وہ یہی غیر معمولی حافظہ ہے، جس نے الغیث وا لمسجم کی فصل حفظ و عمیان اور نکت الھمیان و مقدمہ الصبح المنبی کا مطالعہ کیا ہے، وہ کیسے ابو العلا کے حافظہ کی تکذیب کرے گا، جس کو اس کے معاصر ابن القارح نے نہ صرف یہی کہ زور دار الفاظ میں تسلیم کیا ہے، بلکہ اس کی بنا پر ابو العلا کو ابن خالویہ ابو علی الفارسی اور ابو الطیب اللغوی وغیرہ پر ترجیح دی ہے۔

ولم تزل قلۃ الانصاف قاطعۃ بین الرجال وان کانوا ذوی رحم [۳]

ہاں اگر سرد سیر ممالک میں بباعث کثافت اخلاط و امشاج و غلظ طبیعت و مزاج ایسی نادر مثالیں نہ ملیں تو نہ سہی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ دیدہ و دانستہ اوروں کے فضائل سے انکار کیا جائے کہ ممالک گرم سیر نے بحمد اللہ ہر زمانہ میں مافوق العادۃ حافظہ کی صدہا نادر مثالیں پیش کی ہیں، ابھی کوئی دس پندرہ سال کا عرصہ ہوا ہوگا کہ اخباروں نے ایک مدراسی لڑکی کا حال چھاپا تھا، جس نے قریباً دس برس کی عمر میں علاوہ کئی بولیوں کے سنسکرت کی چند منظوم کتابیں بھی ازبر کرلی تھیں، اور جس چیز کو وہ ایک بار سن پاتی تھی، اس کو کبھی نہ بھولتی، اس لئے ڈاکٹروں کے مشورے سے روزانہ اس کو ایک تنہا کمرے میں بند کردیا جاتا تھا تاکہ ادھر ادھر کی آوازیں اس کے دماغ کو مشوش نہ کریں کیا مارگولیوتھ صاحب کوئی ایسا آدمی اپنی قوم میں بتائیں گے جس کو دس لاکھ حدیثوں کے برابر نثر عبارت یاد ہو۔

۲۶۔ کہتے ہیں [۴] کہ وہ قصہ جس میں یہ ہے کہ جب ابو العلا اپنی رحلت شام میں لاذقیہ کی طرف سے گذرا تو ایک مسیحی راہب نے اسلام کی طرف سے اس کے دل میں کچھ شکوک پیدا کردئے، جن سے وہ اپنے تئیں تادم زیست نجات نہ دے سکا، ممکن ہے درست ہو مگر اسلامی روایات میں راہب کا نام اس درجہ مطعون چلا آتا ہے کہ وہ ہمیں اس قصہ کو نگاہ شک سے دیکھتے ہیں

(۱) یعنی کہ السمعانی عن الجوالیقی عن التبریزی (۲) کیا ہر وہ شخص جس کے اسلاف کوتاہ کار ہوں، کارگذار اسلاف والے لوگوں سے مخاصمت مول لے گا (۳) بے انصافی ہمیشہ لوگوں میں قطع تعلقات کا باعث بنتی ہے، خواہ وہ قرابتی عزیز ہی کیوں نہ ہو (۴) م ۱۶

حق بجانب ٹھہراتا ہے۔

گویا آپ ایک بدیہی بات کو جو روزمرہ مشاہدہ میں آتی ہے، اپنے پادر ہوا استدلال سے نظری بنانا چاہتے ہیں، حالانکہ اس قصہ کا راوی ذہبی ہے، اور اغلباً قفطی سے جو ابوالعلا کا ہم وطن ہے، لزوم میں ایسے صدہا ابیات ہیں جو ابوالعلا کی احبار و رہبان سے غیر معمولی واقفیت اور دلچسپی کا پتہ دیتے ہیں، ملاحظہ ہو میری تالیف نظرۃ فی النجوم من اللزوم، سو اسلامی روایات کا اس میں کیا قصور آپ اپنی حیات میں جو اعمال کرتے ہیں، ان کا حقیقی عکس یہاں دیکھ لیں۔

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

۲۷و۲۸۔ (۱) دو اور جگہوں پر حضرت نے مسیحیت کے عشق میں ایسی باتیں لکھی ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا اور پھر رد کرنا ناحق قارئین کے وقت کو ضائع کرنا تھا۔

۲۹۔ (۲) آپ فرماتے ہیں کہ ابوالعلا نے اپنی طویل عزلت (۴۰۰۔۴۴۹) کو علاوہ تعلیم و تصنیف کے مشغلہ کے شطرنج و نرد کھیلنے میں صرف کیا، الخ

یہ بات بتاتی ہے کہ مارگولیوتھ صاحب نے ہنوز ابوالعلا کو پہنچانا ہی نہیں ہے، بیشک ثعالبی نے یہ قصہ نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو **تتمة اليتيمة** نسخہ خطیہ پیرس جس کے الفاظ یہ ہیں، **كان (۳) حدثني ابو الحسن الدلفي المضيصي الشاعر وهو من لقيته قديما و حديثا في مدة ثلثين سنة قال لقيت بمعرة النعمان عجبا من العجب رايت اعمى شاعرا ظريفا يلعب بالشطرنج و النرد ويدخل في كل فن من انجدو الهزل** الخ مگر شاید **في مدة ثلثين سنة** کو بالکل بھول گئے۔ ثعالبی کی وفات ۴۲۹ھ میں ہوئی تھی اور یقین ہے کہ اس نے وفات سے پہلے تتمہ تیار کیا ہوگا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ابوالحسن الدلفی نے ابوالعلا کو قریباً ۳۹۵ھ میں دیکھا ہو بلکہ اس سے بھی پیشتر، ابوالعلا اس سے زیادہ عاقل تھا کہ اپنی عزلت کے قیمتی وقت کو عبث ضائع کرے۔ وہو القائل

جنيت ذنبا و الهي خاطري دسن   عشرين حولا فلما نيه اعتذارا

اس غلطی کا محل نمبر ۲۳ کے بعد تھا، مگر سہواً یہاں درج ہوگئی۔

---

(۱) م۔ص ۳۵و۱۷ (۲) م۔ ۳۰ (۳) مجھ سے ابوالحسن الدلفی نے بیان کیا تھا جس سے میں بہت پہلے اور ابھی بھی کوئی تیس سال کی مدت میں ملا ہوں کہ میں نے معرہ میں ایک حیرت انگیز بات دیکھی یعنی کہ ایک ظریف الطبع نابینا کو دیکھا، جو شطرنج اور نرد کھیلتا تھا، اور سنجیدگی اور مزاح کے ہر باب میں دسترس رکھتا تھا۔

نکلسن کے اغلاط

۳۰۔ دائرہ [۱] میں لکھتے ہیں کہ ابوالعلا بغداد سے واپس آکر ۴۰ سال عزلت گزیں رہا اور افکار [۲] میں کہتے ہیں کہ وہ بعد از رجوع پچاس سال جیا۔

حیرت ہے کہ ایک شخص کی دو زبانیں ہوں اور دونوں باہم دگر متناقض، واقعہ یہ ہے کہ بعد از رجوع وہ ۴۸ سال اور قریباً ایک ماہ عزلت گزینی میں جیا، اس لئے کہ وہ خود رسائل [۳] میں لکھتا ہے کہ میں ۲۴ رمضان ۴۰۰ھ کو بغداد سے روانہ ہوگیا، سو بظاہر اوائل ذی الحجہ یا اواخر ذی القعدہ میں معرہ پہنچا ہوگا، جہاں وہ ربیع الاول ۴۴۹ھ میں مرا، جس طرح تمام مورخین نے بلا خلاف لکھا ہے، یعنی صفدی، عباسی، ابوالفداء، یافعی، ابن الاثیر، ابن الانباری، سمعانی، یاقوت، ابن خلکان اور سیوطی وغیرہ نے۔

۳۱۔ آداب [۴] میں ہے کہ وہ ۸۴ سال کی عمر میں مرا، اس قول کی تکذیب کے لئے ہمیں جملہ سابق الذکر مولفین کی کتب کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں، بلکہ خود نکلسن دائرہ [۵] میں اپنے قول کی اس طرح تکذیب کرتا ہے یعنی کہ وہ ۳۶۳ھ میں پیدا ہوا اور ۴۴۹ھ میں مرا، ظاہر ہے کہ اس حساب سے اس کی عمر ۸۶ سال کی ہوتی ہے، وهو الصواب جس طرح معجم الادباء [۶] میں تصریحاً مذکور ہے، وعاش ستا و ثمانين سنة ہاں مگر یہ یاد رہے کہ مارگولیوتھ نے ستا کو شیئا لکھا ہے، جو نا قابل معافی تصحیف ہے، ابوالبرکات [۷] ابن الانباری راوی ہیں کہ ابوبکر الصوفی نے اس حدیث کو جب روایت کیا، من صام رمضان واتبعه شيئا من شوال الخ تو محمد بن العباس نے کہا، ایہا الشیخ، یہ نیچے کے نقطے اوپر لگا لیجئے، مگر وہ کچھ نہ سمجھے تو پھر کہا کہ اس کو ستا بنا لیجئے چنانچہ انھوں نے بنا لیا، کیا میں مارگولیوتھ صاحب سے بھی یہی توقع رکھوں، چند کے لئے عربی میں علی العموم لفظ نیف آتا ہے نہ کہ شیء۔

۳۲۔ دائرہ [۸] میں ہے کہ ابوالعلا ۴۰۰ھ تک معرہ میں رہا، اور پھر بغداد جانے کا ارادہ کیا، اس مہمل غلطی کی تکذیب کے لئے مارگولیوتھ [۹] کا یہ قول جو عربی تواریخ میں بھی بالاتفاق موجود ہے بہت کافی ہے، یعنی ابوالعلا ۳۹۸ھ میں معرہ سے بغداد کی طرف روانہ ہوا اور ۴۰۰ھ میں معرہ واپس آ گیا۔

(۱) م ۷۶ (۲) م ۴۷ (۳) ۳۲ (۴) ۳۲۳ (۵) ۷۵، ۷۶ (۶) ۱x۱۷۰ (۷) نزہۃ الالباء ص ۳۴۳ (۸) م ۷۵

۳۳۔ دائرہ[1] میں لکھتے ہیں کہ سقط کی بہترین شرح خود ابوالعلا کی شرح ضوء السقط ہے اور اس کے شاگرد تبریزی کی شرح بھی لکھی ہے۔

اس دعویٰ کی تکذیب کے لئے مارگولیوتھ[2] کا یہ قول کافی ہے کہ تبریزی کی شرح نہ واحد شرح ہے نہ بہترین اور ابن خلکان[3] کا یہ قول کہ ابن السید البطلیوسی کی شرح خود ابوالعلا کی شرح سے بہتر ہے۔

آداب[4] میں لکھتے ہیں کہ ابوالعلا کی وفات سے دس سال پیشتر ناصر خسرو معرہ پہنچا اور دائرہ[5] میں ہے کہ ناصر خسرو اس کی وفات سے گیارہ سال پہلے ۴۳۹ھ میں معرہ پہنچا، دونوں قول متناقض ہیں نیز ناصر خسرو جب ۴۳۸ھ میں معرہ پہنچا تھا، ملاحظہ ہو اس کا سفرنامہ[6] یعنی ابوالعلا کی وفات سے دس سال پیشتر، صاحب ذکری کہتے[7] ہیں کہ وہ ۴۲۸ھ میں پہنچا تھا اور اس سنہ کو اسماء اعداد میں لکھا ہے، اور پھر اس پر اپنے خیالات و مستنتجات کی اونچی عمارتیں کھڑی کی ہیں، سبحان اللہ چہ خوب، صاحب ذکریٰ تو فارسی نہ جاننے کا خود ہی معترف ہے مگر نکلسن صاحب تو فارسی کے پروفیسر تھے۔

افکار[8] میں ہے کہ ابوالعلا کے زیادہ تر رسائل بغداد سے واپس آکر لکھے گئے ہیں، میں نے بہت غور کیا ہے، جس طرح مجھ سے پہلے مارگولیوتھ صاحب نے بھی کافی زحمت اٹھائی ہے مگر یہ حکم ہم سے بن نہیں آیا، ابوالعلاء کے بیشتر رسائل کے متعلق کوئی حتمی حکم لگانا دور از کار ہے، اور پیشتر و پس تر ہر دو قسم کے رسائل کی تعداد قریباً مساوی ہے۔

۳۶۔ افکار اور دائرہ میں رہن المحبسین کا املا یوں ہے Rahnulmahbasyan اور چاہئے یوں Rahnulmahbisyan

۳۷۔ کہتے ہیں[9] کہ وہ اپنے والد کی وفات کے وقت ۱۴ برس کا تھا صاحب ذکری[10] نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

مگر قرین قیاس یہ ہے کہ اس کو تقریباً ۱۵ سال کا فرض کیا جائے بشمول سنہ ولادت یعنی ۳۶۳ھ اس کے والد ۳۷۷ھ میں مرے تھے، جس طرح خریدہ اور ادباء میں ہے۔

۳۸۔ آداب[11] میں ہے کہ ابوالعلا رحلت شام سے واپس آکر تا رحلت بغداد ۱۵ سال

(۱) م۷۶ (۲) م۳۵ (۳) ۲۶۵x۱ (۴) ۳۲۳ (۵) ۷۶ (۶) مطبوعہ برگن ص۱۴و۱۵ (۷) ۴۲ (۸) ۴۸
(۹) افکار ۴۵ (۱۰) ۱۴۸ (۱۱) ۳۱۳

معرہ میں مقیم رہا۔

انسب یہ ہے کہ ۱۵ سال ۹ ماہ کیا جائے، یا تقریباً ۱۶ سال۔ تفصیل کے لئے ہماری کتاب ملاحظہ فرمائیں۔

۳۹۔ آداب [۱] میں ہے کہ وہ اپنی رحلت شام سے بیس سال کی عمر میں معرہ واپس پہنچا، مجھے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، بلکہ اس کا صنعاء میں ایک سال رہ کر گوشت نہ کھانا، جس کے راوی ابن حجر ہیں، یقیناً اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ۲۰ سال کی عمر کے بعد بھی اپنے ملک میں سیاحت کرتا رہا تھا، بظاہر ۲۰ سال کی عمر کو ختم سفر سے اس لئے نسبت دی ہے کہ خود ابوالعلا رسائل میں لکھتا ہے کہ میں نے ۲۰ سال کے بعد کسی کے سامنے زانوے ادب تہ نہیں کیے مگر یہ استنتاج غلط ہے، اس لئے کہ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ وہ اس عمر کے بعد بغرض سیر کتب نہ بغرض تعلیم سیاحت کرتا رہا۔

۴۰۔ آداب [۲] میں جب ابوالعلا کے ایک بیت واقع لزوم ۲×۲۸۰ از طبع اول مصر جو لزوم طبع دوم مصر ۲×۲۴۲ میں واقع ہے۔

غدوت ابن وقتي ما تقضي نسية　　　وما هو آت لا احس له طعما

کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ ابوالعلا اپنے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے عصر کا (ممتاز) فرزند ہوں۔

مگر ان کا یہ ترجمہ سراسر غلط ہے، ابوالعلا کا خیال یہ ہے کہ انسان کو موجودہ حالات کی بنا پر قیاس کیا جاتا ہے، مضی ماضی اور آئندہ کے متعلق کوئی حتمی حکم نہیں لگایا جا سکتا، ہمارے پاس اس کے ثبوت میں لزوم کے یہ ابیات ہیں۔

انت ابن وقتک والماضی حلیث کری　　　ولا حلاوة للباقي الذی غبرا

خذ الآن فيما نحن فيه وخليا　　　غدا فهو لم يقدم واعس فقد مرا

گویا ابوالعلا نے قریباً ابن الوقت سے وہی معنی مراد لئے ہیں جو ڈپٹی نذیر احمد مرحوم نے اپنی کتاب کو ابن الوقت کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اگر نکلسن صاحب سابق الذکر ہم معنی ابیات پر غور کر لیتے تو اس غلطی سے بچ جاتے۔

(۱) ۳۱۳ (۲) ۳۲۴

مارگولیوتھ اور نکلسن کے مشترکہ اغلاط

۴۱۔ مارگولیوتھ [۱] لکھتا ہے، ابوالعلا کا ننہال اور ددھیال دونوں مذہبی خیالات میں آزاد تھے جن کا اثر ابوالعلا پر بھی پڑا، اس نظم سے جو صفدی نے نقل کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انہی کی اقتداء میں حج نہیں کیا، الخ

اور نکلسن [۲] کہتا ہے کہ یہ حقیقت کہ نہ اس کے والد نے حج کیا، نہ اس کے چچاؤں اور ماموں نے جن کو وہ اپنے لئے بطور مثال پیش کرتا ہے، اس کے مذہبی معتقدات کی تشکیل میں اہمیت سے خالی نہیں۔

عصبیت کی اس سے بڑھ کر مثال پیش کرنا ناممکن ہے، اس لئے کہ اسی حکایت کو جس میں مندرجۂ ذیل اشعار بھی موجود ہیں۔

قالوھرمت ولم تطرق تهامة في	مشاة وفد ولا ركبان اجمالي
فقلت انى ضرير والذين لهم	لرأى رأوا غير فرض الحج امثالي
ماحج جدى ولم يحجج ابى واخى	ولا ابن عمى ولم يعرف منى خالي
وحج عنهم قضاء بعد ما ارتحلوا	قوم سيقضون عنى بعد ترحالي

خود مارگولیوتھ نے ایک اور جگہ نہایت سخت تمسخر آمیز لہجہ میں بطور تغلیط ٹھکرا دیا ہے [۳]، اور یہاں اس کے ایک جزو سے ایک بڑے واقعہ پر استشہاد کر رہے ہیں، سبحان اللہ! کیا منصفانہ بددیانتی کی اس سے زیادہ بھدی نظیر کہیں اور مل سکے گی؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ قصہ سراسر لغو اور بے ثبوت ہے، جس طرح صاحب ذکریٰ نے بھی اس کی سخت تردید کی ہے اور اس کا اصل ماخذ یعنی سر العلمین للغزالی، نہ غزالی کی تصنیف ہے اور نہ کسی عالم کی، بلکہ وہ تو کسی نالائق جاہل کی جو عربی کے دو حروف بھی نہیں جانتا، گھڑنت ہے، جس طرح مولانا شبلیؒ نے بھی الغزالی میں انکار کیا ہے، الغزالی ابوالعلا کی وفات کے کئی سال بعد عالم وجود میں آئے ہیں، مگر اس کتاب میں وہ ایک اور جگہ مدعی ہیں کہ خود ابوالعلا نے مجھے ذیل کے اشعار سنائے ہیں، اس پر طرہ یہ کہ وہ اشعار بشار اور جریر کے ہیں، جو ابوالعلا سے تین سو سال پہلے ہوئے ہیں۔

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا	الا ایها الساقی ادر کاسا وناولها

(۱) م۔۱۴ (۲) اذکار ۴۵ (۳) م ۴۳

بے شک ابو العلا نے حج نہیں کیا تھا، جس کا باعث بظاہر اس کی معذوری تھی ہم اس مدعی کے اثبات کے لئے لزوم کے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔

(۱) اردت الی ارض الحجاز تحملا ۔۔۔ فعاقتک عنه عائقات الحواجز

من خوف بارئک امتطیت نجیبة ۔۔۔ عادت بسیرک مثل قوس الباری

فاذا اوردت منی فغایات المنی ۔۔۔ ملقی جرائم فی الحیاة کبار

کوئی صحیح الذوق ان ابیات کو پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ ابو العلا اصل حج کا مخالف تھا، وہ

(۲) ان یسمعوا ریبة طاروا بها فرحا ۔۔۔ عنی وما سمعوا من صالح دفنوا

صم اذا سمعوا خیرا ذکرت به ۔۔۔ وان ذکرت بشر عندهم اذنوا

ہاں ابو العلا ان حجاج کا سخت دشمن تھا جو حج کر کے اپنے اعمال قبیحہ کی فہرست میں بے دھڑک اضافہ کرنے لگتے تھے، کہ

اصبح الشیخ ماردا ۔۔۔ بعد ما حج واستلم

سقط (۳) میں حجاج کے بدرقہ روکی زبان سے ایک لامیہ کہا ہے، جو پس ہمتوں کو بیت العتیق کی طرف ان الفاظ میں گدگدیاں لے کر اٹھاتا ہے۔

(۴) وسریت تحت انمدجنا ۔۔۔ ت ممارسا اهوالها

فی فتیة تزجی الی البیـ ۔۔۔ ـت الحرام نعالها

تبغی بمکة حاجة ۔۔۔ قدر العزیز مآلها

حتی قضیت طوافها ۔۔۔ سبعا وزرت جبالها

وسمعت عند صباحها ۔۔۔ ومسائها اهلا لها

ترجو رضا الملک الذی ۔۔۔ منح الملوک جلالها

(۱) تو نے حجاز کے سفر کا ارادہ کیا مگر کچھ عوائق مانع ہوئے تو اپنے خالق کے خوف سے اس ناقہ پر سوار ہو گیا جو کمان کی طرح خمیدہ ہو گئی، سو اگر تو منی میں پہنچا تو انتہائی تمنا بڑے گناہوں کی مغفرت ہوگی۔ (۲) اگر وہ میری کوئی برائی سن پاتے ہیں تو خنداں خنداں اسے لے اڑتے ہیں اور اگر کوئی بھلائی ہوتی ہے تو اس کو دفن کر دیتے ہیں، اگر میرا خیر سے مذکور ہو تو بہرے بن جاتے ہیں اگر شر سے ہو تو کان دھرتے ہیں۔ (۳) ۳۲۹×۲ (۴) اور تو اندھیری گھٹاؤں میں بڑی مشقتیں جھیل کر راتوں رات چل پڑا ہے، ان جوان کے ساتھ جو بیت الحرام کی طرف پیادہ پا جا رہے ہیں تو ایک ضرورت سے مکہ جاتا ہے، جس سے مقصد ذات الٰہی ہے، حتی کہ تو نے پورے سات طواف کر لئے اور وہاں کے پہاڑ دیکھے اور تو نے صبح و شام تلبیہ کی بلند آواز سنی، بڑی تمنا اس خدا کی رضا جوئی تھی، جس نے بادشاہوں کو جلال بخشا ہے۔

(۴۲) مارگولیوتھ [۱] کہتا ہے کہ ابوالعلا نے قرآن کا چیلنج منظور کرلیا اور نکلسن [۲] آداب میں کہ ابوالعلا کو قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں کلام تھا، اسی بنا پر محمدؐ کے چیلنج کو اس نے منظور کرلیا، اور ایک برابر کی کتاب تیار کی الخ، ان کے علاوہ براؤن نے لٹریری ہسٹری آف پرشیا میں بھی اس خیال کو دہرایا ہے، اور اصل میں یہ زعم فاسد گولڈزیہر نے زڈ، ڈی، ایم، جی کے مضمون کے ذریعہ تمام یورپ میں پھونک دیا ہے، جس کا ہم اپنے مضمون مطبوعہ معارف فروری ۲۵ء میں پورا رد کر چکے ہیں، مگر ہم یہاں خود ابوالعلا کی شہادت در ۴۲۴ھ قرآن کے اعجاز کے متعلق نقل کرتے ہیں، جو الفصول کی تصنیف کے قریباً دس پندرہ سال بعد کی ہے، ہر ملحد [۳] اور مسلم اور گمراہ اور راہرو کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس کتاب نے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے لائے ہیں اپنے اعجاز کے ذریعہ سب کو مبہوت کردیا ہے۔ الخ

۴۳-۴۶ [۴] مارگولیوتھ بحوالہ تاریخ اسلام راوی ہے، کہ جب ابوالعلا (۳۸۳ھ میں) شام کی رحلت سے واپس آیا، تو اسے ایک وقف میں سے سالانہ تیس دینار ملنے لگے، مگر ذہبی کے اپنے الفاظ یہ ہیں [۵]: لہ وقف یحصل منہ فی العام نحو ثلثین دینارا قدر منها لمن نجدمه النصف...... و اتفق انه عورض فی الوقف المذکور من جهة امیر حلب فسافر الی بغداد الخ نکلسن [۶] نے دو جگہ اس طرح لکھا ہے مگر آداب [۷] میں اتنا اور اضافہ ہے کہ اس کی بجز ان تیس دیناروں کے اور کوئی آمدنی نہ تھی اور افکار میں ہے کہ شاید اس کی کچھ اور بھی آمدنی ہوگی، جو اس کو بسیغۂ تعلیم حاصل ہوتی ہو، ظاہر ہے کہ یہ دونوں قول صریحاً متناقض ہیں، مگر اس سے بڑھ کر حیرت انگیز یہ تناقض ہے کہ خود افکار [۸] ہی میں لکھتے ہیں کہ اس کو اپنے تلامذہ سے معتدبہ رقوم ملتی تھیں، پہلے حوالۂ افکار میں ''شاید اور کچھ'' یہ دو مریض لفظ تھے اور دوسرے میں ان کی بجائے ''معتدبہ'' کا زبردست لفظ ہے، حالانکہ دونوں حوالے ایک ہی کتاب کے ہیں، درحقیقت یہ مارگولیوتھ [۹] کی تقلید ہے، جو کہتے ہیں کہ یہ بات کوئی خلاف عادت نہیں کہ دور دراز کے طلبہ اپنے استاذ کو اپنی عقیدت کا ٹھوس ثبوت دئے بغیر واپس نہ جاتے ہوں، پھر مارگولیوتھ ایک اور جگہ لکھتے ہیں [۱۰] کہ ابوالعلا کی تعلیم قدرتی طور پر زرطلبی کی زندگی کے لئے تیاری تھی، ایک اور جگہ [۱۱] ہے کہ ہرچند ابوالعلا بار بار یہ خیال دہراتا ہے کہ اس کی نظمیں صلہ کی طمع میں نہیں تیار کی گئیں،

(۱) ۳۶۴ (۲) ۳۱۸ (۳) الغفران ۱۵۸ (۴) م ۱۵ (۵) ۱۲۹ (۶) افکار ۳۶ دائرہ ۷ (۷) ۳۱۳ (۸) ۱۲۵
(۹) م ۴۴ (۱۰) م ۱۷ (۱۱) م ۱۸

پھر ڈاکٹر ریو سے ناقل ہیں کہ سقط کا پہلا قصیدہ سعید الدولہ نبیرۂ سیف الدولہ کی مدح میں ہے الخ یعنی گویا بقول مارگولیوتھ یہ قصیدہ ابوالعلا کے طالب زر ہونے کی اٹل شہادت ہے، مارگولیوتھ بہت بے تاب نظر آتے ہیں کہ کس طرح ابوالعلا کو طماع شعراء کی صف میں لا کھڑا کریں۔

مگر تحقیق یہ ہے کہ مذکورہ بالا رقم ۲۵ دینار تھی، جس کا بیشتر حصہ نہ کہ نصف اس کا خادم لے جاتا تھا، بتصریح ابوالعلا[1] میں برخلاف ذہبی کے یہ کہوں گا کہ یہ قلیل رقم اس کو بغداد سے واپس ہونے کے بعد ملتی تھی کہ خود ابوالعلا تصریحاً اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ سفر بغداد سے پہلے کچھ ثروت رکھتا تھا[2]، اور ظاہر ہے کہ ۲۵ دینار کو ثروت سے نہیں تعبیر کیا جا سکتا، مگر مارگولیوتھ اور نکلسن کی یہ اپنی ایجاد ہے کہ یہ حقیر رقم اس کو رحلت شام کے بعد سے ملنے لگی، ذہبی کی عبارت ہرگز اس مفہوم پر نہیں دلالت کرتی، بلکہ بظاہر اس رحلت سے پہلے بھی اس کو مذکورہ رقم ملتی ہوگی، رہی یہ بات کہ اسے اپنے طلبہ سے کوئی اجرت ملتی ہو، تو یہ حکم عادات مشرق اور حالات ابوالعلا سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے، کیا ابوالعلا ان دونوں کی طرح کیمبرج اور آکسفورڈ کا کوئی پروفیسر تھا یا متفرق شائقین کو ٹیوشنوں پر پڑھاتا پھرتا تھا، نہیں بلکہ ابوالعلا اپنے طلبہ کی امداد کیا کرتا تھا، ذہبی راوی[3] ہیں کہ وہ ان طلبہ سے جو اس کی طرف رحلت کر کے آتے یہ عذر کیا کرتا کہ وہ بے بضاعت ہے، اور معرہ کے متمول لوگ تو بخل کے لئے مشہور ہی ہیں اور اس بات پر اس کو سخت تاسف تھا، میں نے لزوم میں اسی معنی میں چند ابیات دیکھے ہیں:

یزورنی القوم هذا ارضه یمن	لوگ میرے پاس آتے ہیں، ایک یمن کا
من البلاد وهذا داره الطبس	ہے، دوسرا طبس (خراسان کا ایک ضلع)
قالوا سمعنا حدیثا عنک قلت لهم	کا، کہتے ہیں ہم نے تمہارا شہرہ سنا ہے
لا یبعد الله الا معشر البسوا	میں کہتا ہوں خدا طمع کاروں کو دور کرے۔
اعاننا الله کل فی معیشة	خدا ہم سب کی دست گیری کرے کہ ہر
یلقی العناء قدری فوقنا دبس	ایک اپنی گذران میں زحمت برداشت کر
ماذا تریدون لا مال تیسرلی	رہا ہے، ہوا نے آسمان ہم پر برس!
فیستماح ولا علم فیقتبس	تم چاہتے کیا ہو کہ نہ میرے پاس مال ہے

(۱) معجم الادباء ۱×۲۰۱ (۲) سقط مع تنویر ۲×۱۱۹ میری بغداد سے واپسی کا باعث علالت والدہ اور فقدان ثروت تھا، خدا نے دونوں کو میری واپسی سے پہلے زندہ رکھا مگر اس کے بعد دونوں پر موت کا حکم صادر کر دیا۔ (۳) م۔ ۱۳۰

اتساءلون جھولا ان یفدکمو	جس کو مانگو اور نہ علم جس سے مستفید ہو، کیا
وتحلبون سفیا ضرعھا یبس	تم ایک جاہل سے افادہ چاہتے ہو، اور کیا
انا الشقی بانی لا اطیق لکم	بے دودھ کی اونٹنی کو دوہتے ہو، جس کا
معونة وصروف الدھر تحتبس	پستان خشک ہے، میں بدنصیب ہوں جو
	تمہاری اعانت نہیں کرسکتا، ہاں زمانہ کی
	گردشیں تنگ حال کردیتی ہیں۔

قفطی راوی ہیں، ایک روز طلبہ نے مل کر ابوالعلا سے حلب کے تربوز کی خواہش کی، ابوالعلا نے آدمی بھیج کر وہ منگائے، جن کو ان سب نے مل کر کھایا، اور کچھ حصہ ابوالعلا کے لئے الگ کردیا، جو یونہی پڑے پڑے سوکھ گیا، اور ابوالعلا نے اس کو ہاتھ تک نہ لگایا، یہ حکایت نص صریح ہے کہ ابوالعلا طلبہ کی امداد کرتا تھا نہ کہ علی العکس، اسی طرح ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ (۳×۳۱۵) میں ابوالعلا کے شاگرد رشید تبریزی سے روایت کی ہے کہ میں دمشق کی جامع مسجد میں خطیب بغدادی سے ادب کی کتابیں پڑھا کرتا تھا، ایک روز خطیب میرے حجرہ میں آکر مجھے ۵ دینار دے گئے، اور کہا ان کی قلمیں خرید لانا، پھر ایک مرتبہ اور اسی طرح قریباً اتنی ہی رقم دے گئے۔

مارگولیوتھ اور نکلسن ہردو نے وقف کا ترجمہ کہیں ٹرسٹ فنڈ سے اور کہیں پنشن سے کیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ابوالعلا کے چند مکانات تھے، جن سے کرایہ آتا تھا، اور کچھ زمین تھی جو سالانہ کچھ پھل دیا کرتی تھی، جس طرح خود ابوالعلا کے اپنے بیانوں سے ہم نے اپنی کتاب میں ثابت کیا ہے ظاہر ہے کہ ایسی آمدنی پر ہر دو لفظوں کا اطلاق مشکل ہے۔

یہ قول بھی کتنا پا در ہوا ہے کہ ابوالعلا کی تعلیم زرطلبی کے لئے ہو، حالانکہ سینکڑوں جگہ وہ اس سے انکاری ہے، نیز ذہبی [1] وغیرہ کہتے ہیں کہ وہ بڑا عالی ہمت تھا کسی کا احسان نہ اٹھاتا، ورنہ اگر شاعری اور مدح خوانی کو ذریعۂ معاش بنانا چاہتا تو اسے یقیناً دنیوی ریاست حاصل ہو جاتی، ہمیں ان استدلالوں کی بھی ضرورت نہیں ہے، کہ ابوالعلا کی پوری زندگی قناعت کا بہترین نمونہ اور مثال ہے، گویا مارگولیوتھ صاحب اس کو یورپ کی للچائی ہوئی اور مادہ پرست آنکھوں سے اپنی طرح جوع البقر میں مبتلا دیکھتے ہیں، حالانکہ ابوالعلا اپنے لڑکپن کے قصائد کے متعلق خود مقدمۂ سقط میں کہتا ہے۔

(۱) م۔۱۲۹

"میں نے اپنی مدح سے رؤسا کے کانوں کو دستک نہیں دی، نہ کسی سے صلہ ملنے کی طمع میں یہ تعریفیں لکھی ہیں، میرا مقصد تو صرف طبع آزمائی اور مشق سخن تھا، بس! اللہ کے ہزار ہا شکر ہیں کہ اس نے قوت لایموت سے میرا پردہ ڈھانک رکھا ہے، اور مجھے وہ قناعت بخشی ہے جو میرے لئے ایک بڑی ثروت کے برابر ہے۔"

کیا یہ دونوں صاحبان ابوالعلا سے راست بازی میں کچھ زیادہ بڑھے ہوئے ہیں، میں مانتا ہوں کہ ریو صاحب نے سچ کہا ہے، جس طرح سقط نسخۂ پیرس کے عنوان میں ہے کہ اس کا پہلا قصیدہ سعید الدولہ کی مدح میں ہے، مگر اے کاش کہ یہ مدعی اسی قصیدہ کے عنوان پر نظر ڈالتا، جس میں ہے (ولم یکن من طلاب الفوائد) اور مطبوعہ نسخوں میں من طلاب الرفد اس تصریح کے بعد یہ کہنا کہ سقط کی مدائح زرطلبی کے لئے ہیں، صاف ہٹ دھرمی، مکابرہ اور عصبیت جاہلیت نہیں تو اور کیا ہے، یہ اس کے لڑکپن کا بیت ہے

قناعت [1] فخلت ان النجم دونی	وسیان التقنع والجهاد

۴۷۔ دونوں [2] صاحب کہتے ہیں کہ ابوالعلا کا سفر بغداد تلاش معاش یا قسمت آزمائی یا طلب ملازمت کے لئے تھا، مگر ابوالعلا تو خود بغداد میں اور وہاں سے پلٹ کر بھی یہ کہہ رہا ہے۔

سیطلبنی رزقی الذی لو طلبته لما زادوا لدنیا حظوظ و اقبال	مجھے میری رزق خود ہی ڈھونڈے گی کہ میرے ڈھونڈنے سے وہ کسی طرح بڑھے گی نہیں اس لئے کہ دنیا بخت و اقبال کا نام ہے،
رحلت لم آت قروشا ازاوله ولا المهذب ابغی النیل تقویتا والموت احسن بالنفس التی الفت عزالقناعة من ان تسال القوتا وکم ماجد فی سیف دجلة لم اشم له بارقا والمرء کالمزن هطال	میں بغداد سے واپس ہوا میں مہذب صاحب البطیح اور قروش صاحب موصل سے روزی مانگنے نہ آیا تھا۔ اس شخص کے لئے جو خوگر قناعت ہو بھیک مانگنے سے تو مرجانا کہیں بہتر ہے۔ ساحل دجلہ میں بہت سے (فیاض) شریف تھے جن کی بارش کا میں منتظر نہ رہا حالانکہ وہ ابر کی طرح ریزاں تھے۔

(۱) ۱×۶۵ سقط (۲) م ۱۲۱ افکار ۶ ۴ آداب ۳۱۳ وغیرہ

وانی تیممت العراق لغیرما	میں اس مقصد سے بغداد نہ گیا تھا جس
تیممہ غیلان عند بلال	سے ذوالرمہ بلال بن ابی بردہ بن ابی
	موسیٰ الاشعری کے ہاں پہنچا تھا۔

ناظرین مختار ہیں، چاہیں ابوالعلا کی تصدیق کریں اور چاہیں اس کے مادہ پرست سوانح نگاروں کی، پھر دونوں صاحب فرماتے ہیں کہ ایسے انکاری اشعار سے تو ابوالعلا گویا خود اپنے مقصد کو شکست دیتا تھا، اے سبحان اللہ! شاید آپ نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا ہے، ھلاشققت عن قلبه

۴۸۔ دونوں [۱] کہتے ہیں کہ ابوالعلا بغداد سے واپس آ کر دو تحبیر ین یعنی مقتنع علی النبات بنا، الخ

یہ قول ابوالعلا کے اپنے بیان کے خلاف ہے، وہ صاف لکھتا ہے [۲]، جب ناچیز کی عمر ۳۰ سال کو پہنچی تو اس نے مدۃ العمر کا روزہ اور اقتناع علی النبات شروع کر دیا، یعنی کہ ۳۹۳ھ رحلت بغداد سے کوئی ساڑھے پانچ سال پیشتر، اس کے علاوہ ہمارے پاس ایک زبردست بیرونی شہادت بھی موجود ہے، قال ابن حجر انه بقی فی صنعاء سنة لا یاکل اللحم یعنی بقول ابن حجر وہ صنعا شام میں ایک سال گوشت خوری سے مجتنب رہا، یہ متفق علیہ ہے کہ وہ بغداد سے واپس آ کر پھر اپنے کنج تنہائی سے کہیں باہر نہیں نکلا، اس لئے یہ صنعا کی رحلت حتماً قبل از رحلت بغداد واقع ہوئی ہے، یہ غلطی کہ ابوالعلا کے جین ازم یا برہمن ازم سے ملتے ہوئے خیالات بغداد سے پلٹ کر بر روئے کار آئے ہیں، قریب قریب تمام سوانح نگاروں کی مشترکہ لغزش ہے، ہاں یہ صحیح ہے کہ ان خیالات کا علم دنیا کو بعد ہی کو ہوا، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے ان کی سخت پابندی واپس آ کر ہی کی ہو، جب کہ وہ اپنی آئندہ زندگی کے لئے راہ عمل سوچ چکا۔

۴۹۔ دونوں فرماتے ہیں [۳] کہ وہ جاتے ہوئے حلب سے روانہ ہوا، مگر افسوس کہ خود مسافر ان کی تصدیق کرنے کو تیار نہیں وہ تو صاف کہتا ہے۔ [۴]

ماانکبت حلب فی الابداء	میں بغداد جاتے اور آتے حلب سے اسی
والانکفاء الا الــخ	لئے روگرداں رہا، الخ

ناظرین کے لئے یہ بات مایۂ حیرت ہوگی کہ ناشر و ترجمان رسائل ایسا کہے۔

۵۰۔ رسائل نمبر ۸ میں ہےنبذة کنبذة فنیق النجوم یعنی کہ ستاروں کے سانڈ کی سی عزلت،

(۱) م-۳۶ آداب ۳۱۵ دائرہ ۶۰ ۷ (۲) ادباء ۱۔ ۱۹۹ (۳) م-۱۲۱ ذکار ۱۳۶ (۴) رسائل ص ۲۹

اس میں مارگولیوتھ اور نکلسن ہر دو فنیق کو کوئی ستارہ سمجھے بیٹھے ہیں۔[۱]

یہ زعم غلط ہے فنیق نام کا دنیا میں کوئی ستارا نہیں، اصل میں فنیق سانڈ اونٹ کو کہتے ہیں، اور چونکہ سہیل تمام ستاروں سے الگ تھلگ اور مستبعد نظر آتا ہے، اس لئے اس کو مجازاً فنیق کہہ دیتے ہیں، کتاب الازمنہ[۲] میں امام ابوعلی مرزوقی چند اشعار دیتے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے۔

شـــآمية الا سهيلاً كـــانـــه فنيق غدا عن شوله وهو جافر[۳]

یہ ایک مارگولیوتھ کی غلطی ہے، جس کا ذکر پہلے رہ گیا تھا۔

۵۱۔ داعی الدعاۃ[۴] نے مصر سے ابوالعلا سے گوشت خوری کے ترک پر خط وکتابت کی۔

یہ صحیح نہیں کہ داعی الدعاۃ خود کہتا ہے[۵] فلـمـا رمت بي الـمـرامي الى الشام وسـمـعـت ان الشيخ وفقه الله تعالى الخ یہ پوری عبارت کوئی شک کی گنجائش نہیں چھوڑتی، صاحب ذکری نے بھی مارگولیوتھ کی اندھی تقلید کی ہے۔ (دیکھو ذکری ص ۶۹)

حیرت در حیرت

یاقوت نے فلک المعالی سے نقل کیا ہے[۶] کہ بعض نادان لوگ موت کو خدا کی طرف سے ظلم خیال کرتے ہیں، معری بھی انہی میں سے ہے، خدا نے اس پر داعی الدعاۃ کو مسلط کردیا، اور دونوں میں کچھ رسائل دائر ہوئے، جن کا انجام اس پر ہوا کہ داعی نے اس واقعہ کے بعد اس کو حلب میں آنے کے لئے لکھا تاکہ اگر وہ اسلام لائے تو اسے بیت المال سے ایک گراں قدر رقم دیجائے، جب ابوالعلا کو یہ معلوم ہوا کہ یا مجھے قتل کیا جائے گا، یا جبراً مسلمان بنالیا جائے گا تو خود ہی زہر کھا کر مر گیا۔

فلک المعانی ابویعلیٰ ابن الہباریہ کی تالیف ہے، ملاحظہ ہو، کشف الظنون یاقوت نے اس سے جابجا نقل کیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ ایا صوفیہ لائبریری قسطنطنیہ میں موجود ہے، دیکھو اس کے دفتر مطبوعہ ۱۳۰۴ھ کا نمبر ۴۱۵۷، ابن الہباریہ ایک نہایت گندہ دہن اور بدزبان شاعر ہے، تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ کوئی بھلا آدمی اس کی ہجو سے نہیں بچا، دیکھو ابن خلکان وغیرہ، ایسی حالت میں ابوالعلا کا اس کی مذمت سے نہ بچ سکنا اس کی فضیلت کی دلیل ہے۔

واذا[۷] اتتک مذمتي من ناقص فهي الشهادة لي باني كامل

(۱) ترجمہ رسائل ۴۳ وافکار ۴۷ (۲) ۲×۳۲۲۔۳۲۳ و ۳۸۱ (۳) وہ سارے ستارے شامی ہیں بجز سہیل کے (جو یمانی ہے) گویا وہ کوئی سانڈ ہے جو جفتی چھوڑ کر سانڈنیوں سے الگ تھلگ ہو گیا ہو (۴) م ۳۹ وجرنل آر۔ اے۔ ایس حاشیہ نمبر ۳ ص ۳۱۴ سن ۱۹۰۲ء (۵) ادباء ۱×(۶) ادبا ۱×۱۹۴ (۷) جب تم کو کسی ناقص شخص کی زبان سے میری برائی پہنچے تو وہ گویا میری فضیلت کی پختہ دلیل ہے۔

خیر اس کا تو ہم نے اپنی کتاب میں پورے طور پر رد کر دیا ہے، اسی طرح ابو العلا کے زہر کھا کر مر جانے کا، کسی مورخ نے ذکر نہیں کیا، اور ابن الہباریہ ثقہ نہیں، لہٰذا یہ قول مردود ہے۔

اب سنئے ڈاکٹر طٰہٰ حسین [1] مذکور الصدر قصہ کو غرس النعمہ کے نام سے نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "اس مہمل واقعہ کی خود یاقوت ہی نے تکذیب کر دی ہے، اور حیرت اس پر ہے کہ فرنچ مستشرق سلامون نے یاقوت کی عبارت کا مطلب بالکل نہیں سمجھا، اور یہ خیال کیا کہ خود یاقوت ہی اس قول کا قائل ہے، اس لئے اس بے چارہ پر ناحق لے دے کی ہے، اگر وہ یاقوت کی عبارت پر ذرہ غور کرتا تو اپنے تئیں رد کی اس طویل زحمت سے چھڑا لیتا۔"

ناچیز کہتا ہے کہ ایک سلامون کی غلطی سے یاقوت کی طرف اس قول کو منسوب کیا، مگر یا حضرت آپ بھی ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈالئے کہ آپ بھی معصیت نہیں ہیں، بیچارے غرس النعمہ کو اس حکایت سے کیا سروکار، ذرا میرے لکھنے سے پھر معجم الادباء کا مطالعہ کیجئے اور ہاں یہ یاد رہے کہ فلک المعانی ابن الہباریہ کی کتاب ہے، نہ کہ غرس النعمہ کی، کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں اس مقام پر ہمارے متفقہ دوست کا ایک بیت پڑھوں۔

وبصیر [2] الاقوام مثلی اعمی   فھلموا فی حندس نتصادم

راقم کو زندگی میں یہ مشغلہ بالکل نہیں بھاتا کہ اوروں کی طرح لوگوں پر زبان طعن دراز کر کے اپنے لئے راستہ صاف کرے، مگر چونکہ مستشرقین کا عموماً ہمارے ہاں آج تک ایک ہی پہلو دکھایا گیا ہے، اس لئے بتقاضائے سنت الٰہی ضرور تھا کہ یہ باب مضامین سے سراسر خالی نہ رکھا جائے، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ انسان کا کوئی کام خامیوں سے خالی نہیں رہ سکتا، اس لئے میں اپنے کو بری بنا کر بازار مصر میں نہیں پیش کر سکتا، ہاں یہ خیال میرے لئے فی الجملہ مایۂ طمانیت ہے کہ حتی المقدور میں نے دعووں سے اپنے تئیں بچایا ہے، نیز یہ کہ اگر خدا کو منظور ہوا تو ہمارے ملک کے مبہوت الحواس مدعیان علم مستشرقین کو آئندہ پھر معصومیت سے نسبت دینے کی جسارت نہ کر سکیں گے۔

یہی نہیں، بلکہ مضمون بہت سی انوکھی تحقیقات پر مشتمل ہے، اس لئے امید ہے کہ طالبان حق اس کے حقیقی فوائد پر نظر رکھیں گے۔

الا لیقل [3] من شاء ما شاء انما   یلام الفتی فیما استطاع من الامر

(۱) ذکری ص ۲۲۵ (۱) قوم کا بینا بھی میری طرح اندھا ہی ہے اور ہم اندھیرے میں باہم ٹکر سر مار رہے ہیں (۳) ارے بھئی جو جس کسی کے جی میں آئے کہہ ڈالے کہ انسان اسی امر میں قابل سرزنش ہو سکتا ہے جو اس کے بس کا ہو۔

اسلامی علوم وفنون اور مستشرقین یورپ

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

اس وقت یورپ اس قدر متمدن دنیا پر چھایا ہوا ہے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں یورپ نے مسلمانوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا اور اپنی زبان میں اسلامی علوم وفنون کے ترجمے کئے تھے، تو لوگوں کو تعجب ہوتا ہے، بلکہ اس کو مبالغہ سمجھتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یورپ کو ابتدا ہی سے مسلمانوں سے علمی تعلقات پیدا ہو گئے تھے، آٹھویں صدی عیسوی میں جب کہ تمام یورپ جہالت، تعصب، توہمات اور خرافات کا مرکز بنا ہوا تھا، مسلمانوں کی علمی وتمدنی ترقی کا عنفوانِ شباب تھا، بغداد میں حکما، فلاسفر، شاعر، متکلم سب کے سب علمی ترقی میں مصروف تھے، ہارون رشید کا قصر خلافت علوم وفنون کی اکاڈمی بنا ہوا تھا، اس ترقی کی شہرت کی بنا پر اکثر سلاطین وقت ہارون رشید سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنا چاہتے تھے، انہی میں ایک شارلیمان بھی تھا، یہ اگرچہ اپنی ملکی وسعت کے لحاظ سے بڑے جاہ وجلال کا بادشاہ تھا، پھر بھی علمی وتمدنی حیثیت سے اس کو یورپ اور اسلامی ملکوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا تھا، یورپ میں اس وقت صرف مذہبی تعلیم جاری تھی اور وہ بھی صرف گرجوں تک محدود تھی، اس تعلیم کے ذریعہ خرافات واوہام کی تلقین کی جاتی تھی، شارلیمان پہلا شخص ہے، جس نے اس دماغی تنزل کو محسوس کیا اور خلیفۂ اسلام ہارون رشید کی تقلید میں اپنے دربار میں علماء حکماء اور شعراء کو جمع کیا، ان میں کوین سب سے زیادہ نامور ہے، یہ شاعر بھی تھا اور عالم بھی، اس نے خود عربوں سے یا ان یہودیوں سے جنھوں نے عرب علماء سے تعلیم حاصل کی تھی، اسلامی علوم وفنون پڑھے تھے، عبرانی اور لاطینی زبانوں کا بہت بڑا ماہر تھا، اس کے ذریعہ یورپ میں علمی دور شروع ہوا۔

یورپ میں اگرچہ اس سے بہت پہلے مسلمانوں کا علمی وتمدنی اثر قائم ہو چکا تھا، مسلمان

پہلی ہی صدی میں جنوبی فرانس میں اقامت گزیں ہو گئے تھے، انھوں نے پورے یورپ میں آزادی وحریت کی روح پیدا کردی تھی، لیکن کلیسا کی سخت گیریاں بھی قائم تھیں، اس لئے وہاں کوئی آزادانہ صدا بلند نہیں ہوسکتی تھی، پھر بھی شارلیمان نے روشن خیال علماء کی مدد سے تمام گرجوں میں مذہبی علوم کے ساتھ موسیقی، ہندسہ، نجوم اور منطق وغیرہ کی کتابیں داخل نصاب کیں، لیکن شارلیمان کے بعد اس کی علمی اصلاحات کا خاتمہ ہوگیا، اور کلیسا کی جابرانہ حکومت پھر قائم ہوگئی اور وہ ان اصلاحات کو گوارا نہیں کرسکتا تھا، شارلیمان کے پوتے شارل نے نویں صدی میں جب اپنے دادا شارلیمان کے نقش قدم پر چلنا چاہا اور ایک انگریز عالم سے جو عبرانی، یونانی، عربی زبانوں اور طب اور فلسفہ کا بڑا ماہر تھا، مسلمانوں کے علوم وفنون کا اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کی خواہش کی تو اس سے تمام یورپ گونج گیا، اور کلیسا نے اس پر کفر کا فتویٰ لگایا، تاہم ان رکاوٹوں کے باوجود آزادی کی روح برابر ترقی کرتی گئی اور جب اندلس میں مسلمانوں نے اپنے عظیم الشان مدارس قائم کئے اور وہ تمام دنیا کی علمی ترقیوں کا کعبۂ امید بن گیا، تو اس کا اثر یورپ پر پڑے بغیر نہیں رہا، چنانچہ بہت سے لوگوں نے مسلمانوں کے ان مدرسوں میں علوم وفنون حاصل کئے جن میں ایک جربرٹ بھی تھا، جو نویں صدی کے آخر میں پوپ ہوگیا تھا، اس نے اسلامی علوم وفنون کے تراجم کو اس قدر وسعت دی کہ یورپ میں علمی بہار آگئی، لیکن خود یہاں کے لوگوں نے اسلامی علوم وفنون کی تعلیم کے لئے کوئی مدرسہ قائم نہیں کیا تھا، شارلیمان نے قائم کرنے کی کوشش کی تو کامیاب نہیں ہوا، فریڈرک ثانی پہلا شخص ہے، جس نے یورپ میں اسلامی علوم وفنون کے مدارس قائم کئے، فریڈرک ثانی ۲۶ دسمبر ۱۱۹۴ء میں پیدا ہوا اور بلرم میں تعلیم وتربیت پائی، بلرم اس وقت عرب حکماء سے بھرا ہوا تھا، اس بنا پر اس کو ابتدا ہی سے بے تعصبی کے ساتھ علمی ذوق کو ترقی دینے کا موقع ملا، اس کی بے تعصبی کا اظہار اس کے علمی کارناموں ہی سے نہیں ہوتا، بلکہ اس کی ذاتی زندگی بھی اس کا بہترین مظہر تھی، چنانچہ اس کے باڈی گارڈ مسلمان ہوتے تھے، اس نے جو قلعے اور عمارتیں تعمیر کرائی تھیں ان میں اندلس کی عمارتوں کی طرح عربی طرز تعمیر کا خاص لحاظ رکھا گیا تھا، پھر خوش قسمتی سے بے تعصبی سے کام لینے کے لئے زمانہ نے پہلے ہی سے اس کے لئے راستہ صاف کردیا تھا، چنانچہ جب مسلمانوں نے اندلس کو فتح کیا اور فرانس میں داخل ہوئے تو آزاد خیالی اور لٹریچر نے فرانس پر بھی بہت نمایاں اثر ڈالا بالخصوص شاعری پر اس کا خاص اثر پڑا، فرانس کے شعراء پہلے جو اشعار کہتے تھے ان میں قافیہ کی پابندی نہیں ہوتی تھی، لیکن عرب شعراء کی تقلید اور تتبع میں وہ بھی

قافیہ کی پابندی کرنے لگے، خود عربی اشعار اور رجز وہاں کے لوگوں کی زبانوں پر اس قدر چڑھ گئے کہ وہاں کے فقراء عربی اشعار پڑھ پڑھ کر بھیک مانگتے تھے صلیبی لڑائیوں نے بھی مسلمانوں کے شاندار تمدن وتہذیب کا جو نمونہ یورپ کے سامنے پیش کیا تھا، اس نے بھی اچھا خاصا اثر ڈالا، اور یورپ کے لوگ اس سے متاثر ہوئے۔

جب اندلس میں مسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا، اور ان کے بڑے بڑے شہر عیسائیوں کے قبضہ میں آگئے، تو مسلمان وہاں سے نکل کر جنوبی فرانس میں پھیل گئے، مسلمانوں کے اس انتقال مکانی سے مونبیلیہ یونیورسٹی پر خاص اثر پڑا، اہل یورپ نے مونبیلیہ میں ایک طبی مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی، جب ان کو اندلس کے عرب علماء سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا تو یہ مدرسہ مذہبی اور علمی آزادیٔ فکر کے لحاظ سے تمام یورپ کی دماغی ترقی کا مرکز بن گیا۔

سسلی کو بھی جب مسلمانوں نے فتح کیا تو اس پر بھی ان کے تمدن کا رنگ چڑھ گیا، سسلی چونکہ وسط یورپ میں واقع تھا، اس بنا پر یورپ کی مختلف قومیں اسی رنگ میں رنگ گئیں، نورمانیوں نے جب سسلی کو فتح کیا، تو یہاں کے تمدن میں کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا ہوا، بلکہ اس زمانہ میں مسلمان علمی دائرے سے نکل کر سیاست کے میدان میں بھی آگئے، خصوصاً فوجی اور انتظامی معاملات میں ان پر پورا بھروسہ کیا جاتا تھا، جنگی جہاز تو بالکل ان کے ہاتھ میں تھے، ان کے اثر سے جہاز سے متعلق بہت سے الفاظ اور اصطلاحات یورپ کی زبانوں میں آگئے، جو اب تک موجود ہیں، مثلاً امیرال یورپ کی زبانوں کا ایک متداول لفظ ہے، حالانکہ یہ لفظ امیر البحر کی بگڑی ہوئی شکل ہے، بہر حال سسلی کے شہروں سے لے کر دیہات تک میں عربی تمدن کا اثر نمایاں تھا، خصوصاً اس کے دو شہر بلرم اور سالون تو عربی تمدن کا مرکز تھے۔

ان تمام قدرتی اسباب سے فریڈرک ثانی کو فائدہ اٹھانے کا خوب موقع ملا، چنانچہ اس نے دو عظیم الشان مدرسوں کی بنیاد ڈالی، ان میں پہلا مدرسہ نابولی کا ہے، فریڈرک نے اس میں وہاں کے مقامی علماء کے علاوہ عرب پروفیسر بھی مقرر کیے، کتب خانوں سے بھی اس کے مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے، چنانچہ اس نے مصر، اندلس، شام اور گرجوں کے تمام کتب خانوں کو ملا کر ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا، نابولی بحر متوسط کے وسط میں تھا، اس بنا پر پورے بر اعظم یورپ کے تمام اطراف وجوانب سے نہایت کثرت سے طالب العلم آتے تھے اور تعلیم حاصل کرتے تھے، غرباء کو مفت تعلیم دی جاتی تھی، سالرن کا مڈیکل کالج بہت وقیع اور بلند تھا، اس کے

مقابلہ میں نابولی کا مدرسہ کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا، سالرن کے اس کالج کو سب سے پہلے آٹھویں صدی میں بعض عرب اور یہود علماء نے قائم کیا تھا، لیکن اس کی اصلی ترقی فریڈرک ثانی کے عہد میں ہوئی، اس میں اس وقت کی تمام مروجہ زبانوں مثلاً لاطینی، یونانی، جرمن، عربی، عبرانی میں تعلیم دی جاتی تھی، تاکہ کسی زبان کا جاننے والا بھی تعلیم سے محروم نہ رہے، تعلیم کا طرز یہ تھا کہ تمام علوم وفنون پر لیکچر دیئے جاتے تھے، علم التشریح کی بھی تعلیم ہوتی تھی، چونکہ عیسائی مردہ آدمیوں کے جسموں کو چھونا ناجائز سمجھتے تھے، اس لئے اس قسم کے تجربات بجائے انسانی جسموں کے بندروں کے جسموں پر کئے جاتے تھے، جو تمام جانوروں میں انسانوں سے سب سے زیادہ مشابہ ہیں، لیکن کبھی کبھی پوشیدہ طور پر انسان کے جسم کی بھی تشریح کی جاتی تھی، داخلہ کے لئے کسی خاص مذہب کی قید نہ تھی، ہر مذہب کے اساتذہ بھی اس میں رکھے جاتے تھے اور ہر مذہب کے طلبہ بھی اس میں داخلہ لے سکتے تھے۔

اس مڈیکل کالج میں خاص طور سے ہر مرض کے اسپشلسٹ بھی تیار کئے جاتے تھے، بعض صرف آنکھ کے امراض کا علاج کرتے تھے، بعضوں کو مثانہ کے امراض میں کمال ہوتا تھا، بعض صرف نباتات کے خواص کی واقفیت رکھتے تھے، ان کے تمام تجربات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر دیئے گئے ہیں، جن کا نام رجیمن سینٹیٹس ہے، محققین کا بیان ہے کہ یہ کتاب اسحاق بن سلیمان کے تجربات سے ماخوذ ہے، جو قرطبہ کا مشہور حکیم تھا، اس کتاب میں امراض کی تشخیص، اعضائے انسانی کی تشریح، اصول حفظان صحت، کواکب کا تعلق صحت ومرض کے ساتھ، غرض اس قسم کے مفید مباحث درج ہیں، اس مدرسہ نے اس قدر ترقی کی کہ خود حکومت نے عطاروں کی نگرانی اپنے ذمہ لے لی، کہ وہ عطاری کے ساتھ طبابت نہ کرنے پائیں، جس سے خاص اطباء کے حقوق میں دست اندازی ہوتی تھی، اس مدرسہ کی سرپرستی میں متعدد شفاخانے قائم تھے، جن پر بڑی بڑی جائدادیں وقف تھیں، ان میں پہلا شفاخانہ خاص ان اصولوں کے مطابق قائم کیا گیا تھا جو اندلس میں خلفائے بنی امیہ کے شفاخانوں کا سنگ بنیاد تھے، لیکن یورپ کو ان مدارس کے علاوہ مسلمانوں کی تصنیفات کے تراجم سے بہت زیادہ فائدہ پہنچا، یورپ میں تراجم کا ذوق سب سے پہلے جربرٹ نے پیدا کیا اور پھیلایا، جو ۹۹۹ء میں عیسائیوں کا سب سے بڑا پوپ گذرا ہے اور جو بابا سلوسٹر ثانی کے نام سے مشہور ہے، اس نے تراجم کی اشاعت میں ایسی سرگرمی دکھائی کہ اہل یورپ نے اس پر یہ تہمت لگائی کہ اس نے اپنی روح شیطانوں کے ہاتھ بیچ ڈالی ہے، اس کے بعد ہرمان مقفع قسطنطین

افریقی، افلاطون طیبوری، اذلاء ماطی، یوحنا اشبیلی، کوندیسالفی، ہرمان الدلانی، مرقس طلیطلی، کریمونی، فیلنوف، ارمنکو، اسکاٹ، فراغوث غرض کہ نہایت کثرت سے مترجمین پیدا ہوگئے، ان مترجمین میں اگرچہ اٹالین، فرانسیسی اور انگریز بھی تھے، لیکن عربی تصنیفات کا ترجمہ عموماً لیٹن زبان میں کیا جاتا تھا، ان مترجمین نے جن کتابوں کے ترجمے کئے ان کی تعداد تقریباً ۳۰۰ تک پہنچی ہے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

علم	تعداد
فلسفہ وطبیعات	۹۰
ریاضی ونجوم	۷۰
طب	۹۰
کیمیا وغیرہ	۴۰

تراجم کا یہ ذوق روز بروز بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ۱۱۳۰ء میں لارڈ بشپ رایمونڈ کی سرپرستی میں طلیطلہ میں تراجم کا ایک خاص محکمہ قائم ہوا، جس کے ذریعہ یورپ میں تراجم کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، ڈاکٹر لوکارک نے اپنی کتاب تاریخ علم طب عربی میں لکھا ہے کہ عربی کی صرف ۳۰۰ طبی کتابوں کا ترجمہ لیٹن زبان میں کیا گیا، پندرہویں صدی تک یورپ میں کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی، اس کی تمام دماغی ترقیوں کا دارومدار انہی تراجم پر رہا، ڈاکٹر گستاولی بان کا بیان ہے کہ یورپ میں چھ سو برس تک انہی تراجم کے ذریعہ سے تعلیم ہوتی رہی، بالخصوص طب میں ابن سینا کی تصنیفات اٹھارہویں صدی تک مونپلیہ کی یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی تھیں۔

عربی زبان سے جن کتابوں کا ترجمہ یورپ میں کیا گیا، ان کی دو قسمیں ہیں:

ایک تو وہ کتابیں ہیں، جن کو خود اہل عرب نے یونانی زبان سے ترجمہ کیا تھا، یورپ میں اگرچہ ان کتابوں کا ترجمہ عربی تراجم کے ذریعہ ہوا، لیکن یہ کتابیں اصل مصنفین کی طرف منسوب کردی گئیں، یہ کتابیں زیادہ تر ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس، اقلیدس، ارشمیدس کی تصنیفات تھیں۔

دوسری وہ کتابیں ہیں جن کو ان علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد خود علمائے اسلام نے تصنیف کیا تھا، ہم اس موقع پر ان مصنفین کی ایک فہرست درج کرتے ہیں، جن کی تصنیفات کا ترجمہ یورپ کی زبانوں میں کیا گیا۔

شمار	نام مصنف	کیفیت
۱	ابوالحسن فلکی	اس کی تمام تصنیفات علم الفلک میں تھیں، اس کی کتاب اوائل واواخر کے بعض اجزاء کا ترجمہ مورخ سیدیو نے کیا اور ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا۔
۲	ابوالوفا جوز جانی بتانی	یہ بہت بڑا ہیئت داں تھا، سیدیو نے اس کی تمام تصنیفات کا ترجمہ کیا اور یہ تمام ترجمے ۱۸۴۰ء میں پیرس سے شائع ہوئے
۳	یعقوب کندی	اس کی ایک طبی تصنیف کا لیٹن زبان میں ترجمہ ہوا، اور ۱۵۳۱ء اور ۱۶۰۳ء کے درمیان متعدد بار شائع ہوا۔
۴	موسیٰ خوارزمی	اس نے جبر ومقابلہ میں ایک رسالہ لکھا تھا، جس کا ترجمہ علامہ روزن نے ۱۸۳۱ء میں انگریزی زبان میں کیا، اس سے پہلے بارہویں صدی میں علامہ رودولف دی بروج نے اس کا ترجمہ لیٹن میں کیا تھا۔
۵	ابوالحسن الفرغالی	اس نے علم الفلک میں ایک کتاب لکھی تھی جس کے لیٹن میں تین ترجمے کئے گئے، ایک ترجمہ یوحنا اشبیلی نے بارہویں صدی میں کیا تھا، جو ۱۴۹۳ء میں فراری سے شائع ہوا اور اخیر میں ۱۶۹۹ میں بھی چھاپا گیا۔
۶	ابونصر فارابی	اس کی کتابوں کا عبرانی زبان میں ترجمہ ہوا، لیکن ان کی اشاعت نہیں ہوئی۔
۷	ابن رشد	وہ طب، فلسفہ، ہیئت، تمام فنون کا جامع تھا، اس کی اکثر طبی تصنیفات کا لیٹن میں ترجمہ ہوا اور ۱۵۵۲ء میں یہ تراجم مختلف عنوانات سے شائع کئے گئے۔

۸	ابن سینا	قانون اس کی مشہور تصنیف ہے، لاطینی زبان میں یہ کتاب ترجمہ ہوکر بار بار چھپی، اس کی پہلی اشاعت مقام بندقیہ سے ۱۴۸۴ء میں ہوئی تھی، ابن سینا کی تصنیفات کی شرحیں تو اٹھارہویں صدی کے آخر تک شائع ہوتی رہیں۔
۹	قسطنطین افریقی	یہ وہ شخص ہے جس نے اٹلی میں عربی طب کو رواج دیا اس نے اپنی تمام کتابیں لیٹن زبان میں لکھی تھیں جن کا ماخذ طب عربی تھی، یہ کتابیں ۱۵۳۶ء میں مقام بال سے شائع ہوئیں۔
۱۰	جابر بن حیان	کیمسٹری کا بہت بڑا عالم تھا، پیرس کے پبلک کتب خانہ میں لیٹن زبان میں اس کی چھ کتابیں موجود ہیں، اس کی اکثر کتابوں کی اشاعت ہوئی، سب سے پہلے اس کی کتابیں ۱۴۹۰ء میں چھاپی گئیں اس کے بعد ۱۶۷۲ء میں لیٹن سے فرنچ میں ان کا ترجمہ ہوا، اس کی کتابوں کے انگریزی میں ترجمے ہوئے اور ۱۶۶۸ء میں ان کی اشاعت ہوئی۔
۱۱	جابر فلکی	یہ دوسرا شخص ہے، اشبیلیہ میں رہتا تھا، ہیئت میں اس نے ایک مفید کتاب لکھی تھی، جس کا لیٹن میں ترجمہ ہوا۔
۱۲	عباس	اس نے طب میں پچاس اجزاء میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام مالکی تھا لیٹن میں اس کا ترجمہ ہوا اور مقام وینس سے ۱۴۹۲ء میں شائع ہوئی۔
۱۳	حسن بن الہیثم	یہ ریاضی کا بہت بڑا عالم تھا، اس کی کتابوں کا لیٹن میں ترجمہ ہوکر ۱۵۷۱ء میں شائع ہوا، اس نے ہندسہ میں ایک کتاب لکھی تھی، سیدیو نے اس کا خلاصہ شائع کیا۔

۱۴	ابن العوام اندلسی	علم النباتات کا ماہر تھا، اس نے فن زراعت پر ایک کتاب لکھی تھی، موسیو کلیمان مولیہ نے فرنچ میں اس کا ترجمہ کر دیا، اور ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا۔
۱۵	قزوینی	ہیئت، جغرافیہ، تاریخ طبیعی کا عالم تھا، اس کی کتاب عجائب المخلوقات کا فرنچ میں ترجمہ ہوا اور ۱۸۰۵ء میں پیرس سے شائع ہوا، حال میں اس کے ہیئت کے ایک رسالہ کا جرمن زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔
۱۶	ضیاء ابن بیطار اندلسی	علم النباتات میں مہارت رکھتا تھا، اس کی ایک کتاب مفردات کا ترجمہ ڈاکٹر لوکلرک نے دو جلدوں میں کیا اور ۱۸۷۷ء میں پیرس سے شائع ہوا۔
۱۷	ابن یونس	یہ ہیئت داں تھا، زیچ حاکمی جو ہیئت میں بے مثل تصنیف ہے، اس کی تالیف ہے، علامہ کوسان دو برسفال نے اس کے بعد اجزاء کا ترجمہ کیا اور ۱۸۰۴ء میں پیرس سے شائع ہوا۔
۱۸	یحیٰی بن ماسویہ	بہت بڑا طبیب تھا، خواص ادویہ میں اس کی بہت سی کتابیں ہیں، جو بار بار چھپ چکی ہیں، لیٹن میں اس کی کتابوں کا ترجمہ ہوا اور مقام بندقیہ سے ۱۴۷۱ء میں شائع ہوا۔
۱۹	محقق طوسی	اس نے ایک زیچ مرتب کی تھی، اس کا خلاصہ لیٹن زبان میں ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا اور ۱۶۵۲ء میں بھی چھاپا گیا۔
۲۰	الغ بیگ	یہ تیمور لنگ کا پوتا اور ریاضی کا بہت بڑا عالم تھا اس نے ایک زیچ مرتب کی تھی جو اسی کے نام سے مشہور ہے، لیٹن میں اس کا ترجمہ ہوا اور ۱۶۶۵ء میں آکسفورڈ سے اور ۱۸۴۷ء میں پیرس سے اس کی اشاعت ہوئی۔

۲۱	زکریا رازی	طبیب اور بہت بڑا مصنف تھا، اس کی تصنیفات کی تعداد ۲۲۶ تک پہنچی ہے، اس کی اہم کتابوں کا لیٹن میں ترجمہ ہوا، اور ۱۴۸۶ء میں ان کی اشاعت ہوئی، چیچک کے متعلق اس کا ایک رسالہ تھا جو ۱۷۴۵ء و ۱۷۶۶ء میں لیٹن زبان میں چھاپا گیا، آج تک علم کیمیا میں اس کی تین کتابوں کے ترجمے متداول ہیں۔
۲۲	ثابت بن قرہ	یہ پہلا شخص ہے جس نے جبر و مقابلہ اور ہندسہ میں تطبیق دی، سیدیو نے اس کی تصنیفات کا خلاصہ شائع کیا ہے۔

مصنفین کی صراحت کے ساتھ ہم ان تمام تصنیفات کی ایک مفصل فہرست درج کرتے ہیں، جن کا ترجمہ یورپ کی زبانوں میں ہوا، یہ فہرست اگرچہ جامع اور مکمل نہیں ہے، تاہم اس سے اس امر کا اندازہ ہوگا کہ یورپ پر کس قدر مسلمانوں کا گراں بار احسان ہے۔

شمار	نام کتاب	مصنف	مترجم
۱	السمع والبصر	یعقوب کندی	کریمونی
۲	الغایہ	”	”
۳	الاحکام	”	”
۴	التوحید	”	”
۵	الاسباب المختلفہ	”	نامعلوم
۶	مستقبل العرفہ	”	”
۷	خصائص العناصر	فارابی	”
۸	السمع الطبیعی	”	کریمونی
۹	المنطق	”	”
۱۰	مطلع العلم	”	کندیسالفی
۱۱	اقسام الفلسفہ	”	”

شمار	کتاب	مصنف	مترجم
۱۲	العلوم	فارابی	کریمونی
۱۳	العقل والمعقول	،،	نامعلوم
۱۴	الکیمیا	،،	،،
۱۵	الحاوی	زکریا رازی	فراغوت
۱۶	المنصوری	،،	کریمونی
۱۷	الضوء	،،	،،
۱۸	الابتسام	،،	،،
۱۹	المدخل فی الطب	،،	،،
۲۰	الاغذیہ	،،	،،
۲۱	علل المفاصل	،،	نامعلوم
۲۲	امراض الجلد	،،	،،
۲۳	التریاق	،،	،،
۲۴	الجدری والحصبہ	،،	،،
۲۵	القانون	ابن سینا	کریمونی
۲۶	قلب الانسان	،،	فیلنوف
۲۷	الارجوزہ فی الطب	،،	ارمنکو
۲۸	شرحہا	،،	،،
۲۹	الشراب	،،	الیاغوس
۳۰	النفس اشبیلی	،،	اشبیلی
۳۱	مابعد الطبیعیہ	،،	کوندیسالفی
۳۲	الطبیعیات	،،	،،
۳۳	اسماء العالم	،،	،،
۳۴	مختصر الحیوان	،،	اسکاٹ

شمار	کتاب	مصنف	مترجم
۳۵	التعریفات	ابن سینا	نامعلوم
۳۶	الکیمیا	"	"
۳۷	الجبر الفلسفی	"	"
۳۸	الحدود	"	"
۳۹	المنطق	"	"
۴۰	الفلسفۃ الاولیٰ	"	"
۴۱	الکلیات	ابن رشد	ارمنکو
۴۲	شرح ارجوزہ ابن سینا	"	"
۴۳	الادویۃ المفردہ	ابن سینا	مائن
۴۴	التریاق	"	نامعلوم
۴۵	السموم	"	"
۴۶	شرح السماء والعالم	"	اسکاٹ
۴۷	شرح النفس	"	"
۴۸	القوی الطبیعیہ	"	"
۴۹	الرجم	"	"
۵۰	المجسطی	ثابت بن قرہ	"
۵۱	الاوزان	"	"
۵۲	ترکیب الدوائر	"	"
۵۳	التصور	"	اشبیلی
۵۴	السیارات	"	نامعلوم
۵۵	الثوابت	"	"
۵۶	التقارب والتباعد	"	"
۵۷	الدائرۃ الشمسیہ	"	"

شمار	کتاب	مصنف	مترجم
۵۸	التناسب	ثابت بن قرہ	نامعلوم
۵۹	احکام النجوم	ماشاءاللہ	اشبیلی
۶۰	احکام القرانات والممازجات	"	"
۶۱	الاسطرلاب	"	نامعلوم
۶۲	الدائرہ	"	کریمونی
۶۳	البول	اسحاق الاسرائیلی	قسطنطین
۶۴	الحمیات	"	"
۶۵	العناصر	"	کریمونی
۶۶	الاغذیہ	"	"
۶۷	الحدود	"	"
۶۸	الجراحۃ	زہراوی	"
۶۹	الرق	"	سمعان الجنوی
۷۰	النظر والعمل	"	نامعلوم
۷۱	التصریف	"	"
۷۲	الملکی	علی بن عباس	قسطنطین
۷۳	تقویم الابدان	ابن جزلہ	فراغوت
۷۴	الصحۃ	ابن بطلان	"
۷۵	تذکرۃ الکحالین	عیسیٰ بن علی	نامعلوم
۷۶	التیسیر ابن زہر	ابن زہر	نیافینوس
۷۷	البسائط	سرائیون	سمعان الجنوی
۷۸	صناعۃ جالینوس	ابن رضوان	کریمونی
۷۹	الکتب الاربعہ	"	یامر الفونس
۸۰	الطبیعۃ وماوراءہا	امام غزالی	کوندیسالفی

شمار	کتاب	مصنف	مترجم
۸۱	الزیج	خوارزمی	ادلار الباطی
۸۲	المدخل	"	"
۸۳	الجبر	"	کریمونی
۸۴	الہندسہ	اولاد شاکر	"
۸۵	ینبوع الحیاۃ	ابن جبرئیل	کوندیسالفی
۸۶	حرکات النجوم	البتانی	الطیبوری
۸۷	مأۃ مسألۃ	"	نامعلوم
۸۸	الزیج	"	اوبرت الترینی
۸۹	القانون	"	یامرلفونس
۹۰	الجبر	ابو کامل نجا	کریمونی
۹۱	الاسطرلاب	ابن صفا	نامعلوم
۹۲	المشکلات الکرویہ	جابر بن افلح	"
۹۳	النصرانیہ والاسلام	البتروجی	اسکاٹ
۹۴	زاد المسافر	ابن الجزاء	قسطنطین
۹۵	المدخل فی النجوم	القبیصی	اشبیلی
۹۶	الشفق	ابن ہیثم	کریمونی
۹۷	المختصر	سرابیون	"
۹۸	الحمیات	ماسویہ	نامعلوم
۹۹	الجراحۃ	"	فراغوت
۱۰۰	الایساغوجی	حنین	نامعلوم
۱۰۱	المنطق	السرخسی	"
۱۰۲	النفس والروح	قسطا بن لوقا	اشبیلی
۱۰۳	التعاویذ	"	فیلنوف

شمار	کتاب	مصنف	مترجم
۱۰۴	اللاہوت	جابر	کریمونی
۱۰۵	الانواء	ابن العوام	،،
۱۰۶	الزیج	للزرقانی	،،
۱۰۷	السموم	المیمونی	السینی
۱۰۸	النجوم	الفرغانی	کریمونی واشبیلی
۱۰۹	زہر النجوم	البلخی	اشبیلی
۱۱۰	الاختیار	،،	نامعلوم
۱۱۱	الرعد	،،	،،

یہ ان کتابوں کی فہرست ہے، جن کو خود مسلمانوں نے تصنیف کیا تھا، لیکن وہ کتابیں جن کا مسلمانوں نے یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا، مثلاً المجسطی، کتاب الحواس وغیرہ اس سے الگ ہیں شاید کہا جائے کہ یہ کتابیں اگرچہ مسلمانوں کی تصنیف ہیں، لیکن یہ مسلمانوں کی کتابیں نہیں ہیں، مسلمانوں کے اصلی علوم وفنون حدیث، تفسیر، فقہ، ادب، بلاغت، فصاحت وغیرہ ہیں اور ان تمام کتابوں میں ایک کتاب بھی اس موضوع پر نہیں ہے لیکن یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے، مسلمانوں نے صرف یونانی زبان کی کتابوں کے ترجمے ہی نہیں کئے بلکہ ان پر اضافہ کیا، ان کی حک واصلاح کی، جدید مسائل پیدا کئے مختصر یہ کہ ان علوم کو گویا خاص اپنا فن بنالیا، اس بنا پر ان تراجم کے ذریعہ سے یورپ میں جو عقلی علوم کا ذخیرہ پہنچا، وہ گویا خاص مسلمانوں کی تحقیقات کا لب لباب تھا، اس کے علاوہ مسلمانوں نے جن کتابوں کے لفظی ترجمے کئے تھے، ان میں بعض کتابوں کی اصل ضائع ہوگئی حکمائے یونان میں تموفارس ارتلوس، منیلادس، ثادون کی کتابوں کے ترجمے عربی میں ہوئے اور ان کی اصل کتابیں ضائع ہوگئیں، کلیلہ ودمنہ کا ترجمہ ابن مقفع نے فارسی سے عربی میں کیا، اور اصل نسخہ غائب ہوگیا، کتاب الفلاحۃ النبطیہ کا ترجمہ ابن وحشیہ نے سریانی سے کیا اور اصل کتاب برباد ہوگئی، اس بنا پر یورپ کو ان حکماء کے اصول اور ان کتابوں کی اطلاع صرف مسلمانوں ہی کے تراجم سے ہوئی، بہرحال یورپ مسلمانوں کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتا، لیکن اس زمانے میں مسلمانوں کے لئے صرف اسی پر فخر کافی نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ جس طرح زمانہ قدیم میں ہم سے یورپ نے سیکھا تھا، اسی طرح ہم اس زمانہ میں یورپ سے سیکھیں، قدیم زمانہ

میں فلسفہ کا دائرہ محدود تھا، اب یورپ نے ہر چیز کو فلسفہ بنادیا ہے، اس لئے فلسفہ کے ان تمام اقسام کو اپنی زبان میں لانا چاہئے، ہندوستان میں جدید تعلیم روز بروز ترقی کررہی ہے، لیکن ابھی تک تراجم کے سلسلہ میں بہت کم وسعت ہوئی ہے، اردو میں صرف چند کتابیں انگریزی سے ترجمہ ہوئی ہیں، جن کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا ہے، مصر میں بلاشبہ تراجم نے ترقی کی ہے، اور انگریزی کے علاوہ فرنچ اور جرمن زبان کی کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے ہیں، بالخصوص محمد علی پاشا کے زمانہ میں اس صیغہ نے خاص وسعت حاصل کی، اگر یہی حالت قائم رہتی تو یورپ کا تمام سرمایہ عربی زبان میں منتقل ہوگیا ہوتا، محمد علی پاشا کے زمانہ میں جدید علوم وفنون کی جو کتابیں ترجمہ وتالیف کے ذریعہ عربی میں آئیں، ان کی ایک فہرست ہم درج کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ ہماری علمی کوششوں کو یورپ کی علمی کوششوں سے کیا نسبت ہے۔

شمار	کتاب	مؤلف	سنہ اشاعت
۱	الآیات البینات فی علم النباتات	محمود فوزجی	۱۸۸۸ء
۲	الظواهر البدیعه فی علم الطبیعیه	”	۱۳۰۸ھ
۳	منافع الحیوانات	”	۱۳۰۶ھ
۴	علم طبقات الارض	احمد زے	۱۲۸۸ھ
۵	بنیة الکرة الارضیه	”	۱۲۵۷ھ
۶	حسن الصناعه فی علم الزراعه	”	۱۲۹۱ھ
۷	علم النبات	”	۱۲۸۳ھ
۸	علم الحیوانات	”	۱۲۸۴ھ
۹	الکیمیاء الزراعیه	ابوالسعود	۱۲۹۰ھ
۱۰	الجواهر البدیعة فی علم الطبیعیه	محمد کامل الکفروی	۱۳۰۵ھ
۱۱	الکیمیاء العمومیه له احزاء	ابراہیم لطفی	۱۳۰۳ھ
۱۲	مبادی الطبیعیه	”	۱۳۰۵ھ
۱۳	علم الحیوانات للافقریة	”	۱۳۰۳ھ
۱۴	الباتولوجیا	محمد شافعی	۱۲۵۹ھ
۱۵	الحصون القحیه	”	۱۲۰۵ھ
۱۶	التذکرة الطبیه	ابراہیم مصطفےٰ	۱۸۸۱ھ

شمار	کتاب	مؤلف	سنہ اشاعت
۱۷	التصریح الخاص	محمود صدیقی و محمد امین	۱۳۰۴ھ
۱۸	المادة الطبیعیه جزآن	علی ریاض	۱۲۹۷ھ
۱۹	جراحة الاقسام	محمد الدری	۱۳۰۴ھ
۲۰	امراض النساء	احمد الرشیدی	۱۲۶۰ھ
۲۱	امراض الجلدیه جزآن	"	۱۲۶۲ھ
۲۲	فی علمی الادویة والعلاج ۴ جلد	"	۱۲۸۳ھ
۲۳	امراض الاطفال	احمد الرشیدی	۱۲۶۱ھ
۲۴	قواعد التحضیر	محمد ایشیاسی	۱۲۶۴ھ
۲۵	الاقرباذین	حسن الرشیدی	۱۲۶۵ھ
۲۶	الطب السیاسی	ابراہیم حسن	۱۲۹۳ھ
۲۷	العملیات الجراحیة الکبری	محمد علی البقلی	۱۲۵۹ھ
۲۸	فن الجراحه ۲ جلد	"	۱۲۸۲ھ
۲۹	اعمال الجراح ۲ جلد	"	۱۲۶۲ھ
۳۰	الامراض الجلدیه	حسن محمود	۱۲۹۲ھ
۳۱	السیاسة الصحیحه	محمد صفوت	۱۳۰۳ھ
۳۲	علم التشریح	حسن عبدالرحمٰن	۱۲۸۳ھ
۳۳	فن الولادة	عیسیٰ حمدی	۱۲۹۷ھ
۳۴	مختصر الطب الباطنی والعلاج	"	۱۳۰۲ھ
۳۵	صحة الحوامل والاطفال	"	۱۲۹۹ھ
۳۶	امراض الاطفال	"	۱۳۰۰ھ
۳۷	التسمیع والقرع	"	۱۳۰۴ھ
۳۸	مختصر فن العلاج	"	۱۳۰۱ھ
۳۹	مختصر الطب الباطنی ۲ جلد	"	۱۲۹۸ھ
۴۰	الطب الباطنی والعلاج ۴ جلد	سالم سالم	۱۲۲۸ھ
۴۱	المیاہ المعدنیه	"	۱۳۰۰ھ

عربی میں جدید علوم وفنون کی اشاعت میں مصر کے علمی رسالوں نے خاص طور پر حصہ لیا ہے۔

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم وفنون
اور
مستشرقین

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

''مسلمانوں کے لئے درحقیقت یہ بات سخت قابل شرم ہے کہ جس میدان میں انھیں ہمت کا قدم رکھنا تھا، آج اغیار وہاں بازی لے گئے ہیں، عربی زبان نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے بلکہ مسلمانوں کی جان، روح، عنصر جو کچھ کہو عربی ہے، مسلمانوں کے تمام علوم وفنون اسی خزانہ میں محفوظ ہیں، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج اس بے بہا خزانہ پر یورپ کا قبضہ ہے، اور مسلمان خالی ہاتھ اس کی اس جرأت کو تک رہے ہیں، درحقیقت مسلمانوں کی غفلت سے عربی کا تمام سرمایہ تباہ ہونے والا تھا، اگر یورپ اس کی حفاظت پر آمادہ نہ ہو جاتا، تاریخ وادب کی وہ بے بہا کتابیں جن کو الگ کر دینے کے بعد عربی کا اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا کچکول خالی ہو جاتا، صرف یورپ کی سرپرستی سے آج دنیا میں نظر آرہی ہیں، صرف یہی نہیں کہ یہ سرمایہ یورپ کی بدولت بربادی سے محفوظ رہا اور بجائے ایک کرم خوردہ نسخہ کے دنیا میں ہزاروں نسخے پیدا ہو گئے، بلکہ عربی زبان اور عربی علوم کے متعلق یورپ کی زبانوں میں جس قدر معلومات اور تحقیقات کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، ان کو ہمارے علماء کے دماغوں میں ایک لمحہ کے لئے بھی جگہ نہ ملی

ہوگی، عربی کی علم اللسان لغت، صرف، نحو، عروض اور قوافی کے متعلق بیسیوں کتابیں اس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھی گئی ہیں کہ اگر اس کا نصف حصہ بھی ہماری زبان میں آجائے، تو بیش بہا معلومات سے ہم مالا مال ہوجائیں۔

ڈاکٹر لائٹنر ہماری اس افسوسناک غفلت کو محسوس کر کے لکھتے ہیں کہ مسلمان ہیں تو بہت مگر وہ جانتے کیا ہے، گر آج عربی کی کوئی عمدہ تاریخ یا کوئی عمدہ دیوان درکار ہو، تو یورپ سے مانگنا پڑے گا، ابن خلدون، ابن رشد، ابن بطوطہ، حاجی خلیفہ، ابن اثیر اور مقریزی جو اسلام میں آسمان علم کے آفتاب ہیں، یہاں ان کو کوئی جانتا بھی نہیں، تابط شرا، امراء القیس، بحتری اور ابوتمام کا دیوان کتنے آدمیوں نے پڑھا ہوگا، یورپ میں صدہا آدمی یہ کتابیں پڑھتے ہیں اور ترجمۂ قرآن تو لاکھوں۔

ڈاکٹر لائٹنر کو تو صرف اس کا افسوس ہے، کہ اگر عربی کی کوئی عمدہ کتاب درکار ہو تو مسلمانوں کو یورپ سے مانگنا پڑے، لیکن ہمیں یہ افسوس ہے کہ مسلمانوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یورپ نے عربی کی کون کون سی نایاب کتابیں چھاپی ہیں، اور انھیں چھاپ کر ہم پر اور ہمارے علوم پر کتنا بڑا زبردست احسان کیا ہے، اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون کے ذریعہ علمائے اسلام کو یورپ کی ان خدمات سے واقف کریں، جن کی بدولت آج انھیں، اس امر کا موقع حاصل ہے کہ اپنے علمی ذخیرہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اس مضمون کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں یہ دکھلایا ہے کہ یورپ کو عربی اور عربی علوم پر کب توجہ ہوئی اور صرف ونحو، لغت وادب کے متعلق کون کون سی قابل ذکر کتابیں یورپ کی زبانوں میں ترتیب دی گئیں۔ دوسرے حصہ میں ان کتابوں کی مفصل فہرست دی ہے، جو یورپ کی کوششوں سے چھپ کر شائع ہوئیں۔ (ابوالکلام)

یورپ کو عربی اور عربی علوم کی طرف کب توجہ ہوئی اور کیوں کر ہوئی، یہ بجائے خود ایک دلچسپ مضمون ہے، جس کے بیان کرنے کی یہاں نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت، صرف اس قدر

بتلانا سلسلۂ مضمون کے لحاظ سے ضروری ہے کہ عربی سے یورپ کب روشناش ہوا اور کیوں کر عربی علوم وفنون مشرق سے مغرب میں منتقل ہوگئے، دنیا کے حیرت انگیز واقعات میں غالبًا یہ واقعہ بھی عجیب وغریب ہے کہ یورپ کی شایستگی کی بنا ایک ایسی پولٹیکل خوں ریزی نے رکھی، جو دنیا کا سب سے زیادہ نقصان کرنے والی جنگ تسلیم کی گئی ہے، گیارہویں صدی عیسوی میں جب کہ مسلمان ترقی کے انتہائی درجہ تک پہنچ چکے تھے، یورپ میں ہر طرف تاریکی تھی، لیکن صلیبی لڑائیوں نے یکایک یورپ کو موقع دیا کہ مسلمانوں کی شایستگی کا مطالعہ کرے، بیت المقدس اور انطاکیہ میں جب رومی سلطنت قائم ہوگئی، اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کے ذرائع وسعت کے ساتھ پیدا ہوگئے، تو یورپ کی آنکھیں کھلیں اور مسلمانوں کی شایستگی کا اسے پہلا تجربہ ہوا، شام میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد جب یورپ کے جانبازوں نے مغرب کا رخ کیا تو یہ اثر بھی اپنے ساتھ لے گئے کہ مسلمان علمی وعملی ترقیات کے دنیا میں اکیلے مخزن ہیں اور تہذیب وشایستگی کا سرچشمہ اسلامی دنیا کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

اس اثر کا یہ نتیجہ ہوا کہ یورپ میں مسلمانوں کی ترقی اور شایستگی پر عام توجہ پیدا ہوگئی اور یہ توجہ برابر بڑھتی گئی، کیوں کہ صلیبی حملوں کی بدولت بار بار یورپ کا اسلامی ممالک میں گذر رہا اور ہر مرتبہ مسلمانوں کی علمی ترقی کے حیرت انگیز آثار نظر آئے، اس لئے ایک طرف تو یورپ نے مسلمانوں کی تباہی کا بیڑہ اٹھایا، اور دوسری طرف اپنے حریف کی شاگردی پر آمادہ ہوگیا۔

اس ذکر میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ چوں کہ اس زمانہ میں یورپ میں عام تعلیم نہ تھی، اور لاطینی ویونانی زبانوں کی تعلیم پادریوں اور ارا کین سلطنت کے لئے مخصوص تھی، اس لئے مغرب سے مشرق کی طرف جس گروہ کا علمی تلاش میں اول قدم اٹھا، وہ مذہبی پیشواؤں کا مقدس گروہ تھا، حیرت یہ ہے کہ یہی گروہ آگے چل کر الحاد اور بے دینی کے پریشاں خواب دیکھنے لگا اور اسلامی فلسفہ کی اشاعت اس کی تعبیر بتلائی گئی، حالانکہ ابتداء میں اشاعت کا ذریعہ بھی یہی نادان گروہ ہوا۔

گیارہویں صدی کے اوائل سے مسلمانوں کے علوم وفنون پر یورپ کو توجہ ہوئی، اور چودہویں صدی کے اواخر تک فلسفہ کی تمام کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ کی گئیں[1]، ابتدا میں متعدد محکمے قائم کیے گئے کہ لاطینی داں یہودیوں کی مدد سے فلسفہ کی کتابیں ترجمہ کی جائیں، پھر یورپ اکلرمنڈس پنجم کے حکم سے عربی اور دیگر مشرقی زبانوں کی تحصیل کے لئے یورپ سے نوجوان طلبہ

(۱) سیاحۃ المعارف ص ۲۹۷

اندلس روانہ کئے گئے [۱]، اندلس میں چونکہ خود عیسائی اور یہودی فلسفہ میں مسلمانوں کے شاگرد رشید تھے، اس لئے یورپ کے طلبہ ان کی اعانت سے فائدہ اٹھا کر بہت جلد عربی اور عبرانی میں قابلیت حاصل کر لیتے، اور فارغ التحصیل ہو کر علمی کتابوں کے ترجموں میں مشغول ہو جاتے [۲]، جن لوگوں نے یورپ کے مختلف حصوں سے اندلس کا سفر کیا اور عربی زبان سے واقفیت پیدا کر کے علمی تراجم میں مشغول ہوئے ان کے نام آج تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں، ان میں بہت سے طالب علم ایسے ہیں، جنھوں نے طلب علم میں حب الوطنی کے تقید سے خود کو ہمیشہ کے لئے آزاد کر لیا اور ساری عمر طلیطلہ کے پرائیویٹ مدرسوں اور قرطبہ کے دار العلوموں میں صرف کر دی، کچھ طالب علم ایسے ہیں جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد مشرق کے ممتاز ملکوں کی خاک چھانتے پھرے اور ایک عرصہ کی تلاش و تحقیق کے بعد جب سرزمین مغرب میں قدم رکھا تو اسلامی علوم وفنون کی معلومات سے ان کا کاسۂ دماغ لبریز تھا۔ ہارڈمن کریمون اس زمانہ کا مشہور طبیب اور ہیئت داں ہے، یہ اپنے وطن اٹلی سے نکل کر محض عربی کے شوق میں طلیطلہ پہنچا اور ایک عرصہ کی اقامت کے بعد جب کافی واقفیت حاصل کر لی تو متعدد کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔

پیٹرز مارمٹ ایک فرانسیسی راہب تھا، جس کو جغرافیہ کا شوق دامن گیر ہوا، اسی شوق میں اندلس کا سفر کیا، افریقہ کی خاک چھانی اور مدت کی آوارہ گردی کے بعد مسلمانوں سے اس علم کو حاصل کیا۔

ڈنیل مارلی اور پیٹرز ماکرنے اسی طرح اندلس کا سفر کر کے عربی زبان سے واقفیت پیدا کی آخر الذکر نے قرآن شریف کا لاطینی ترجمہ بھی کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری بھی لاطینی میں ترتیب دی [۳]، ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں کے نام تاریخ میں پائے جاتے ہیں، جن میں سے بعض کے ترجمے اور تصنیفات اس وقت تک یورپ میں موجود ہیں [۴]، ان کوششوں نے یورپ کو مسلمانوں اور مسلمانوں کے علوم سے واقف کر دیا اور اسلامی فلسفہ نے عام طور پر مقبولیت حاصل کر لی۔

لیکن چونکہ یورپ میں اس وقت تک عربی زبان کی کوئی باضابطہ درسگاہ نہ تھی، اس لئے عربی زبان سے وہی خوش قسمت اشخاص واقفیت حاصل کر سکتے تھے، جن میں مشرقی ممالک کے سفر اور وہاں کے کثیر اخراجات اور دقتوں کے متحمل ہونے کی طاقت تھی، لیکن سولہویں صدی سے

(۱) سیاحۃ المعارف ص ۲۹۷ و ۳۲۱ (۲) ایضاً (۳) ایضاً ص ۳۰۰ (۴) انسائیکلوپیڈیا آف برنانیکا

عربی زبان کی باضابطہ تعلیم خود یورپ میں شروع ہوگئی، ۱۶۲۲ء میں پندرہویں گری گورس پوپ نے روم میں ایک انجمن قائم کی، جس کا مقصد اگرچہ مسیحی عقائد کی اشاعت تھا، مگر اس کے قیام سے بہت بڑا ضمنی فائدہ یہ ہوا کہ عربی زبان کی تعلیم پر یورپ کی توجہ ہوگئی، اس کے بعد ہی ۱۶۲۷ء میں خاص پوپ اربانس کے حکم سے اس انجمن کے متعلق مشرقی زبانوں کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا تاکہ نوجوان پادری مشرقی زبانوں کی تعلیم پاکر اشاعت مذہب کی غرض سے باہر جاسکیں، اس مدرسہ میں خاص طور پر عربی و سریانی زبانوں کے پروفیسر مشرقی ممالک سے بلوا کر مقرر کئے گئے تھے، عربی کتابیں پہلے پہل دنیا میں اسی مدرسہ کی بدولت چھپ کر شائع ہوئیں، تعلیم کے لئے ضرورت ہوئی کہ صرف ونحو اور ادب کی کتابیں بکثرت مہیا ہوں، اس لئے چند رسالے خود پروفیسروں نے لکھے، اور کچھ کتابیں قدیم زمانہ کی لکھی ہوئی دستیاب کیں اور انھیں اہتمام سے طبع کرا کر شائع کیا۔

صرف ونحو عربی کی کتابیں جو یورپ میں لکھی گئیں

اس انجمن نے عربی کے لئے جو کچھ کیا، وہ درحقیقت ایک مذہبی کام تھا، لیکن اسی زمانہ میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوگئے، جنھوں نے محض ذاتی کوشش اور مذاق سے عربی زبان میں قابلیت بہم پہنچائی، اور پھر صرف ونحو اور ادب ولغت کی کتابیں لکھ کر یورپ میں اس مذاق کو عام کیا، ان لوگوں میں پہلا شخص آر۔ پی۔ نیو نامی ایک عالم ہے، جو ہالینڈ کا باشندہ تھا، مشرقی زبانوں کے شوق میں وطن سے نکل کر دور دراز ملکوں کی سیاحت کی اور متعدد زبانوں کو حاصل کر کے ۱۶۱۳ء میں ہالینڈ واپس آیا، ہالینڈ میں چونکہ اس کی قابلیت کی شہرت پیشتر ہی سے ہوچکی تھی، اس لئے ہالینڈ پہنچتے ہی لیڈن یونیورسٹی کا پروفیسر ہوگیا، اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہالینڈ کے مدرسوں میں عربی زبان کی تعلیم داخل ہوگئی اور صرف ونحو عربی میں سب سے پہلے ایک رسالہ ترتیب دیا۔[1]

آر۔ پی۔ نیو کے بعد لافن وارنر نامی ایک شخص نے عربی کی طرف خاص توجہ کی، یہ عالم ۱۶۱۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۶۵ء میں وفات پائی، ۱۶۴۰ء میں مشرقی ممالک کا سفر کر کے عربی کی نادر کتابیں جمع کیں اور لیڈن یونیورسٹی کے کتب خانہ میں داخل کر دیں۔

سترہویں صدی کے اواخر تک اسی طرح خاص خاص لوگوں کی کوشش سے عربی لٹریچر کا

(۱) سال ولادت ۱۵۸۴ء اور وفات ۱۶۲۴ء ہے، صرف ونحو کے علاوہ اور تصنیفات حسب ذیل ہیں عربی تعلیم کا ابتدائی رسالہ، عربی اور عبرانی کا باہمی تعلق، عہد جدید کا عربی میں ترجمہ۔ چند کتابوں کا عربی سے لاطینی میں بھی ترجمہ کیا، لیکن ان کا تفصیلی حال معلوم نہیں۔

مذاق ترقی کرتا رہا، لیکن اٹھارہویں صدی کے اوائل سے یورپ میں عربی کا وہ نیا دور شروع ہوا جس نے موجودہ زمانے کی عظیم الشان توجہ کی بنیاد رکھی، اس دور کا افتتاح ایک فرانسیسی عالم پروفیسر سل وسٹر کی تصنیفات سے ہوا، جو نہ صرف عربی کا ماہر تھا، بلکہ مشرق کی دیگر مشہور زبانوں میں بھی کافی مہارت رکھتا تھا، علاوہ اور تصنیفات کے اس کی ایک قابل قدر تصنیف عربی کی مبسوط صرف ونحو ہے، جس کی دو ضخیم جلدیں ۱۸۱۰ء میں چھپ کر شائع ہوئیں، اس کتاب میں مصنف نے ایک مفید التزام یہ کیا ہے کہ جن جن صرفی ونحوی مسائل کو لکھا ہے۔ ان کے متعلق بطور شواہد کے عربی اشعار بھی پیش کردئے ہیں۔ (۱)

(۱) اس کا پورا نام ان ٹوان آیزک سیل وسٹر دے ساسی ہے، بچپن میں صحت کی حالت اچھی نہ تھی، اس لئے ابتدائی تعلیم ایک پرائیویٹ استاد سے حاصل کی، باوجود اس کے ذہن اس قدر تیز تھا کہ کم عمری ہی میں یونانی اور لاطینی میں کافی لیاقت پیدا کرلی، بارہ برس کی عمر میں ایک فاضل راہب کی ملاقات ہوئی، جس کا نام لے۔ ٹی۔ ڈ یگ ۔ ٹاین تھا، اس راہب کی صحبت سے مشرقی زبانوں کا شوق پیدا ہوا، اور دس برس کی محنت اور مطالعہ سے مشرق کی سات مشہور زبانوں میں غیر معمولی قابلیت حاصل کرلی، ۱۷۸۰ء میں جب کہ اس کی عمر صرف ۳۰ برس کی تھی، انجیل کے بعض قیمتی مسائل کا پتہ لگایا اور ۱۷۸۵ء میں اکاڈیمی آف انس کرپ شن (یعنی قدیم کتبہ جات کی انجمن) کو دو قابل قدر یادگاریں نذر دیں، ان دو کارناموں نے اس کی شہرت دور دور تک پہنچادی، اور یورپ کی تمام علمی انجمنیں اس کی قدردانی کے لئے آمادہ ہوگئیں، یہ وہ زمانہ تھا کہ فرانس میں ہر طرف پولیٹکل بے چینی پیدا ہوگئی تھی، اور عنقریب بغاوت کی آگ مشتعل ہونے والی تھی، ۱۸۰۰ء میں یکا یک یہ آگ بھڑکی اور فرانس میں انقلاب ہوگیا، اس بے اطمینانی کے زمانہ میں وہ مشرقی لٹریچر کی بعض اہم تحقیقات میں مشغول تھا، کچھ عرصہ کی خوں ریزی کے بعد جب دوبارہ بادشاہت قائم ہوئی، تو گورنمنٹ کی طرف سے اس کی خاص طور پر قدردانی کی گئی، اور جنیوا بھیجا گیا تاکہ ان مشرقی نسخوں کا مطالعہ کرے، جو اس شہر میں محفوظ تھے، ۱۸۰۶ء میں جنیوا سے واپس آیا، اور اپنی تحقیقات کی رپورٹ اکاڈیمی میں پیش کی، پھر ۱۸۰۸ء میں فارسی لٹریچر کا پروفیسر مقرر کیا گیا اور نپولین اول شاہ فرانس نے بیرن کے عہدہ پر سرفراز کیا، اس عرصہ میں فرانس کی پولیٹکل حالت میں دوبارہ انقلاب شروع ہوا، اور ۱۸۱۱ء میں بادشاہت کا خاتمہ ہوکر نئے سرے سے بوربون قائم ہوئی، اس زمانہ سے دے ساسی کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے، اول سررشتہ تعلیم کی کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا، پھر ایشیاٹک سوسائٹی پیرس کا پریذیڈنٹ منتخب ہوا، یہ ایک ایسی علمی جماعت تھی، جس کی بالذات بھی وہ بہت کچھ مدد کیا کرتا تھا، دی فلپ کے عہد میں شاہی توجہ پھر مبذول ہوگئی اور شاہی کتب خانہ کے مشرقی حصہ کا محافظ اور اکاڈیمی آف انس کرپ شن کا لائف سکریٹری مقرر کیا گیا، اسی ممتاز محقق نے منجملہ دیگر کتابوں کے عربی صرف ونحو پر ایک ضخیم کتاب لکھی جو پندرہ سال کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے، اس کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسی کی کوششوں سے پیرس میں اردو سنسکرت اور چینی زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اسی کی تجویز وہدایت سے روس اور جرمنی میں مشرقی زبانوں کی تعلیم شروع ہوئی، سال ولادت ۱۷۸۵ء اور سال وفات ۱۸۳۸ء، صرف ونحو کے علاوہ دیگر تصنیفات حسب ذیل ہیں، تذکرہ شعرائے عجم (بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۶ پر)

اس دور میں چند اسباب ایسے جمع ہو گئے، جن سے عربی پر یورپ کو غیر معمولی توجہ ہوگئی، منجملہ ان کے ایک بڑا سبب انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط ہے اگرچہ مسلمانان ہند کا یہ زمانہ انحطاط تھا، مگر پھر بھی عربی تعلیم کا مذاق عام طور پر موجود تھا، یہاں تک کہ لکھنؤ اور دہلی کے جو علماء آج زیادہ مشہور ہیں وہ اسی آخری دور کی یادگار ہیں، اس لئے انگریزوں کو بھی عربی پر توجہ ہوئی، اس توجہ سے جو مفید نتائج پیدا ہوئے، ان میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور بمبئی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، لیکن اس کا مفصل بیان آگے آئے گا، یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ انگریز بھی فرانسیسیوں کے ساتھ اس دوڑ میں برابر کے شریک رہے، مشہور انگریزی عالم لمڈن [1] نے کلکتہ میں چند مولویوں کی مدد سے ایک عمدہ کتاب صرف ونحو پر لکھ کر ۱۸۱۳ء میں شائع کی، اسی طرح کلکتہ میں دو اور رسالے اسی زمانہ کے قریب قریب شائع ہوئے، جن میں سے ایک رسالہ میں عربی کی چھوٹی بڑی حکایتیں جمع کی تھی، اور دوسرے رسالہ میں الف لیلہ کے تیسرے حصہ کا انتخاب اور ترجمہ تھا [2]، اس دور میں صرف ونحو کی تین کتابیں اور قابل ذکر لکھی گئیں۔

۱۔ علامہ ای والڈ جرمنی کی صرف ونحو عربی، ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۲ء تک چھپ کر لیپزگ سے شائع ہوئی۔

۲۔ علامہ کاسپری کی صرف ونحو پہلی مرتبہ ۱۸۴۸ء میں چھپ کر لیپزگ سے شائع ہوئی، پھر علامہ اگسٹس نے ترمیم وتہذیب کے بعد ۱۸۵۲ء میں دوبارہ شائع کیا، یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ ۱۸۸۷ء تک اس کے پانچ اڈیشن نکل چکے تھے۔

۳۔ پھر ۱۸۵۹ء میں ایک انگریز عالم رایٹ نے کاسپری کی صرف ونحو کو چند مطالب بڑھا کر انگریزی ترجمہ کے ساتھ دو جلدوں میں مرتب کیا، جو لنڈن میں چھپ کر شائع ہوئی۔

یورپ کے علماء نے جب عربی زبان پر توجہ کی، تو ان کو صرف ونحو کی ایسی کتابوں کی تلاش ہوئی، جو ان کے لئے مفید ہوں، جب ایسی کتابیں نہیں ملیں، تو خود انھوں نے کوشش کر کے کتابیں

(صفحہ ۱۶۵ کا بقیہ) اصول عامہ صرف ونحو، اس میں مختلف مصنفین عرب کے کلام نظم ونثر کا انتخاب ہے، ایک عربی قصہ کا ترجمہ، قدامت فارس، مذہب دروز کے حالات، یہ آخری تصنیف ہے، اس میں شام کے ایک پراسرار مذہب کے حالات درج کئے ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اورینٹل) (۱) اس کا پورا نام لمسڈن میتھیو ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ہے، فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا عربی اور فارسی کا پروفیسر تھا، عربی کے علاوہ فارسی میں بھی اس کی ایک صرف نحو موجود ہے، ۱۸۳۰ء میں ایسٹ انڈیا کی ملازمت ترک کر کے انگلستان گیا، اور علمی مشاغل میں مصروف رہا، ولادت ۱۷۰۷ء وفات ۱۸۳۵ء (۲) وقائع ولیم نامولیس، مصنفہ مولوی کبیر الدین احمد مرحوم کا دیباچہ

تصنیف کیں اور آنے والے زمانہ کے لئے عربی زبان کی تعلیم کا سامان مہیا کیا، اس دور میں جتنی کتابیں لکھی گئیں، وہ اسی کوشش پر مبنی ہیں۔

لیکن بڑا احسان جو یورپ نے عربی زبان پر کیا، وہ ان محققانہ لغتوں کی ترتیب ہے، جن کی نظیر عربی میں نہیں مل سکتی۔

یورپ نے عربی کے جو لغت ترتیب دیئے

سب سے پہلا لغت جو یورپ میں شائع ہوا، جیوس نامی ایک فاضل مستشرق کی تصنیف ہے، جو اٹلی کا رہنے والا تھا، پھر علامہ جولیس نے اس کی تقلید کی اور ۱۸۵۲ء میں اپنا عربی لغت لیڈن سے شائع کیا، یہ دونوں لغت چونکہ صرف عربی کے تھے، اس لئے علامہ مانینس نے دو نہایت ضخیم جلدوں میں مشرق کی تین مشہور زبانوں عربی، فارسی، ترکی کا ایک جامع لغت تیار کیا، اور ہر لفظ کا مطلب لاطینی اور جرمن دونوں زبانوں میں درج کیا، اس لغت کا نام کنز اللغات اشرفیہ ہے، ۱۶۸۰ء میں وائنا دار السلطنت اٹلی سے چھپ کر شائع ہوا۔

اس کے بعد علامہ فرائیگ نے چار جلدوں میں اور کازی مرسکی نے فرنچ میں اور باڈ چر اور لین نے انگریزی میں چار لغت تیار کیے، جو ۱۸۳۷ء سے ۱۸۸۱ء تک چھپ کر شائع ہوئے، ان میں پہلا لغت یورپ میں زیادہ مشہور اور متداول ہے۔

ان سات لغتوں میں چھ لغت عربی کے عام لغتوں کی طرح ہیں، جن میں کوئی خاص تحقیق یا جامعیت نہیں پائی جاتی، لیکن ساتواں لغت علامہ لین کا اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ اس مصنف نے نہایت کوشش سے عربی کے تمام قاموس جمع کیے اور انگریزی میں ایک جامع لغت تیار کیا۔

لیکن جس بے نظیر لغت نے عربی کو ہمیشہ کے لئے اپنا مرہون منت بنالیا، وہ مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر دوزی کا قاموس ہے، یعنی اضافہ لغت عربی پر، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے کتب خانہ میں یہ لغت میری نظر سے گذرا۔ دو ضخیم جلدوں میں وہ تمام الفاظ اور مصطلحات جمع کیے ہیں، جو عربی کی کسی لغت میں نہیں ملتے، کامل پچاس برس کی محنت اور تلاش سے یہ بے نظیر لغت تیار ہوا، تاریخ وادب اور علوم وفنون کی سیکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کرکے نہایت کوشش سے ان کا سراغ لگایا، اور تحقیق وتنقید کے بعد جو مفہوم ثابت ہوا، اسے لفظ بہ لفظ درج کیا، پہلی جلد کی ابتداء میں ان کتابوں کی فہرست دی ہے جن سے اس لغت کی ترتیب میں مدد لی گئی، اس کے دیکھنے سے

اس محقق کی تلاش و تحقیق کا سرسری اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون کون سی نایاب کتابیں جمع کیں اور کس طرح ان سے مبہم اور مشکوک الفاظ کا پتہ لگایا۔

مسلمانوں نے جب اسپین فتح کر کے ایک متمدن سلطنت کی بنا ڈالی تو آٹھ سو برس کے اثر نے اسپین کی ملی زبان میں عربی کے سیکڑوں لفظ داخل کر دیے، یہ الفاظ آج بھی اسپینی زبان میں موجود ہیں، مگر اختلاف لب و لہجہ نے ان کی صورت اس طرح بدل دی ہے کہ ان کا سراغ لگانا آسان نہیں ہے، پروفیسر دوزی نے مدت کی محنت سے ایک لغت تیار کیا ہے، جس میں عربی کے وہ تمام الفاظ جمع کیے ہیں اور دکھلایا ہے کہ ان لفظوں نے موجودہ صورت کیوں کر اختیار کی اور عربی میں ان کی اصلی صورت کیا تھی۔

افسوس ہے کہ یہ دونوں بے نظیر لغت فرنچ میں ہیں اور ہم براہ راست ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

ادب عربی کے منتخبات ان کتابوں کے علاوہ ایک اور جز قابل ذکر ہے، یورپ نے عربی علم و ادب کے نہایت مفید منتخبات ترتیب دیے ہیں اور ان منتخبات میں ادب کی بعض ان کتابوں کا انتخاب ہے، جو اس وقت تک چھپ کر شائع نہیں ہوئیں، اور یورپ کے خاص خاص کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ان میں سے بعض منتخبات میں عربی کی قدیم شاعری کے نمونے دیے ہیں، بعض میں ضرب الامثال اور عرب کی اصطلاحات جمع کی ہیں، اس قسم کی چودہ کتابوں کے نام اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں، جن میں سے دو کتابیں بیروت میں اور باقی لندن، برلن اور پیرس وغیرہ میں چھپی ہیں۔

لغت دارجہ کی صرف و نحو آج کل جو عربی عام طور پر نجد کے علاوہ تمام عرب میں مستعمل ہے اس کو لغت دارجہ کہتے ہیں، یورپ نے دارجہ کے بھی صرف و نحو لکھے ہیں اور نہایت اہتمام سے لکھے ہیں۔

سب سے پہلے کانس نامی مستشرق نے ۱۸۷۵ء میں دارجہ کی صرف و نحو لکھی اور اسپین میں چھپ کر شائع ہوئی، پھر دوبے نے لکھ کر وانا سے شائع کی، اسی طرح ۱۸۹۰ء تک بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں صرف ایک کتاب مصر کے ایک مسلمان عالم کی تصنیف ہے، جو غالباً یورپ ہی کی تحریک سے لکھی گئی۔

لغت دارجہ کے مجموعۂ امثال صرف و نحو کے علاوہ لغت دارجہ کی ان ضرب المثلوں کو

بھی جو عام زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں، یورپ کے بعض عالموں نے نہایت کوشش سے جمع کیا ہے، اور عرب کے مختلف حصوں کے مجموعے الگ الگ ترتیب دیے ہیں، مثلاً علامہ لینڈ برگ نے خاص شام کی ضرب المثلیں جمع کی ہیں، باوجونے صرف مکہ معظمہ کے امثال ترتیب دیے ہیں، ان مجموعوں کے علاوہ سوسین نامی ایک مصنف نے ایک جامع "مجموعۂ امثال" ترتیب دیا ہے، جس میں عام طور پر دارجہ کے تمام امثال اور حکیمانہ مقولے جمع کیے ہیں۔

امثال کے علاوہ جو قصے اور چھوٹی چھوٹی حکایتیں عرب کے مختلف خطوں میں مشہور ہیں، اور جن سے ان کے اخلاق و عادات اور طرز معاشرت کا پتہ چل سکتا ہے، جرمنی کے چند مستشرقوں نے ان کو بھی نہایت تلاش سے جمع کیا ہے، اس قسم کی تین کتابیں زیادہ مشہور ہیں۔

۱۔ سوسین کا مجموعۂ حکایات، جس میں موصل اور ماردین کی حکایتیں جمع کی ہیں، یہ رسالہ مضمون کی صورت میں جرمنی کے ایک اخبار میں شائع ہوا تھا۔

۲۔ سی ٹابیک کا مجموعہ، جو ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے چھپ کر شائع ہوا۔

۳۔ لینڈ برگ کا مجموعہ، جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔

مستشرقین کے متعلق دو متضاد رائیں

تلخیص و تبصرہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی (مرحوم)

اس سیاسی دور میں جب کہ ہر کام اور ہر عمل کی تہ میں کوئی نہ کوئی غرض پنہاں ہوتی ہے، مشرقیات اور اسلامیات کے متعلق مستشرقین کی تحقیقات کے قبول کرنے کا سوال نہات اہم ہے، اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے مستشرقین نے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی، انھوں نے ساری ساری عمریں اسلامیات کی تحقیق میں صرف کردیں، اور بڑی جانکاہ محنت اور جانی و مالی قربانی برداشت کر کے مسلمانوں کے علوم وفنون اور ان کی گذشتہ عظمت کو دنیا کے سامنے پیش کیا، ان کی نادر اور نایاب کتابوں کا پتہ چلایا اور بڑی مشقت اور بڑے اخراجات برداشت کر کے انھیں حاصل کیا اور نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ شایع کیا، ان پر حواشے لکھے، ان کی شرحیں کیں، مختلف زبانوں میں ان کے تراجم شایع کئے، اسلامی موضوع پر نہایت بلند پایہ کتابیں تالیف کیں، اور اسلامی علوم و فنون کی ہر شاخ پر نہایت وسیع لٹریچر فراہم کردیا، جو مسلمانوں سے بھی ممکن نہ تھا۔

ان کی ان اسلامی خدمات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اور ان کی محنت و جانفشانی کی داد نہ دینا ظلم اور احسان فراموشی ہے، لیکن اسی کے ساتھ جہاں تک مذہب اسلام کے متعلق ان کے افکار و خیالات اور تحقیقات کا تعلق ہے، خالص اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے قبول کرنے کا سوال نہایت اہم ہے، اس لئے کہ اسلامی مسائل کے متعلق اپنی تحقیقات میں انھوں نے اب تک نیک نیتی کا کوئی ثبوت نہیں دیا ہے، یا تو وہ مشرقی روایات، مشرقی مذاق اور اسلامی ذوق ونظر سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے اسلامیات کے سمجھنے اور اس کے پیش کرنے میں نہایت فاش غلطیاں کرتے ہیں یا عمداً وہ اسلام کو نہایت مسخ شدہ صورت میں پیش کرتے ہیں بہر حال جو صورت بھی ہو ان کی یہ غلطیاں علم و فن کی خدمت اور تحقیق و ریسرچ کے پردہ میں ہوتی ہیں، یہ زمانہ ریسرچ اور تحقیق کا ہے، اس لئے

ان سے خود مسلمانوں اور غیر قوموں میں اسلام کے متعلق سخت گمراہیاں پھیلتی ہیں بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کو یونانی فلسفہ، عجمی دہریت اور ہندی خرافات، کسی سے اتنا نقصان نہیں پہونچا جتنا ان محققین کی زہر آلود تحریروں سے پہونچتا ہے، جس کے مظاہر آئے دن آج کل کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں نظر آتے ہیں، اس لئے مذہب اسلام کے متعلق ان کی تحقیقات پر اعتماد کرنا سخت غلطی ہے۔

ہندوستان کی طرح مصر میں بھی مستشرقین کے بارے میں دو متضاد رائیں ہیں، ایک جماعت ان کی علمی شہرت سے مرعوب ہو کر ان کی ہر جنبش قلم کو بلاچوں وچرا مان لیتی ہے، اور دوسری جو ان کی زہر چکانیوں سے واقف ہے وہ ان کی تحریروں کو ناقدانہ نظر سے دیکھتی ہے، حال میں مصر کے دو ممتاز اہل قلم ڈاکٹر حسین ہراوی اور ڈاکٹر زکی مبارک نے علی الترتیب مستشرقین کی مخالفت اور موافقت میں اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں، ذیل میں ان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے، تاکہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ اصحاب اور اہل علم بھی اس مسئلہ کی اہمیت سے واقف ہوں حسین ہراوی لکھتے ہیں کہ

مستشرقین سے فائدہ سے زیادہ، نقصان پہونچتا ہے

جب ہم یوروپین زبانوں کی کسی ایسی تالیف پر نظر ڈالتے ہیں جس میں مشرق یا اسلام کے اجتماعی یا عمرانی موضوع پر مباحث ہوں تو ہم کو بہت سی خلاف عقل وقیاس باتیں نظر آتی ہیں، خصوصاً ان کتابوں میں جو مذہب اسلام پر ہیں، ان میں نہ صرف خلاف حقیقت اور خلاف عقل وقیاس باتیں ہوتی ہیں، بلکہ ان میں اسلام کی ایسی عجیب وغریب اور بھیانک تصویر پیش کی جاتی ہے جسے کوئی مسلمان برداشت نہیں کرسکتا ہے، مشرقی آدمی اس کی یہ تاویل کرلیتا ہے کہ یہ غلطی مشرق کے حالات اور یہاں کے عادات و خصائل سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور مسلمان اسلام کی بھیانک تصویر دیکھ کر پیچ وتاب کھا کر رہ جاتا ہے۔

میں نے یہ رائے ان یوروپین تصنیفات کو پڑھ کر قائم کی ہے جن سے بیک نظر ظاہر ہو جاتا ہے کہ لکھنے والے کو عموماً مشرق اور خصوصاً اسلام کی حقیقت سے مطلق واقفیت نہیں ہے، مثلاً: مارشل اپنی کتاب ''شادی'' میں لکھتا ہے کہ مصر میں اسلامی پردہ کا یہ اثر ہے کہ وہاں چودہ سال کی عمر کے بعد ماں بھی اپنی لڑکی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی، یا اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر ہے کہ ریفی مصری لڑکی اپنے چہرہ کے علاوہ باقی جسم کے تمام حصوں کو مردوں کے سامنے عریاں کرسکتی ہے، یا کتاب ''شادی اور وراثت کی نسبت'' میں ہے کہ اسلام نے پردہ اور تعدد ازدواج کے حکم سے تمدن پر ایک کاری ضرب لگائی ہے، یا اسی کتاب میں ایک اور مقام پر ہے کہ نعوذ باللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

محض ایک زن پرست آدمی تھے، ان خیالات اور علمی ریسرچ سے لکھنے والے کی نسبت صاف ظاہر ہے کہ وہ حق وانصاف کو پامال کر کے محض اسلام کو بدنام کرنا چاہتا ہے۔

یوروپین مصنفات کی یہ خوبی ہے کہ اس ماخذوں کے حوالے بھی دے دیۓ جاتے ہیں، جب میں اصل ماخذ کی طرف رجوع کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کا ماخذ محض مستشرقین کے دماغ ہیں۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ یوروپین زبانوں میں عام خاص تاریخوں اور مختلف قوموں اور ان کے علمی کارناموں پر نہایت عمدہ کتابیں ہیں، میں نے کتابیں دیکھی ہیں، ان میں دیکھنے والے کو ایک خاص بات نہایت نمایاں نظر آتی ہے جب تک وہ قدیم وجدید تاریخ مثلاً مصر قدیم اور اس کے آثار اور عراق اور اس کی گذشتہ عظمت وغیرہ پر لکھتے ہیں اس وقت تک نہایت محققانہ لکھتے ہیں، لیکن جب اسلامی مباحث یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا قلم بہک جاتا ہے، اور وہ نہایت لغو، مہمل، ذلیل، رکیک بلکہ جھوٹ باتیں تک لکھ جاتے ہیں، مثلاً ان کا قلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تصویر پیش کرتا ہے کہ نعوذ باللہ وہ جنگی مذہب کے بانی تھے اور ان کو انسانی فضائل سے کوئی علاقہ نہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ خرافات بک جاتے ہیں۔

مشہور پروفیسر مارگولیتھ جو یورپ میں اسلامیات کے امام فن مانے جاتے ہیں، اور آکسفورڈ میں اسلامیات کا درس دیتے ہیں، اپنی کتاب "تاریخ العالم" میں یہ نادر تحقیق پیش کرتے ہیں کہ محمد عبداللہ کے بیٹے ہیں اور عبداللہ عرب میں اس لڑکے کہا جاتا تھا، جس کا باپ لامعلوم ہو، بہت ممکن ہے کہ محمدؐ کے باپ کا نام عبداللہ بھی اسی وجہ سے پڑا ہو، اگر کوئی معمولی مستشرق اس قسم کی بیہودہ بات کہتا تو قابل درگذر تھا، لیکن یہ اس شخص کی تحقیق ہے جو یورپ میں عربی کا سب سے بڑا ماہر ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کو لیجئے، جہاں تک عام تاریخ اسلام کا تعلق ہے، اس میں تمام چھوٹے بڑے مسائل پر نہایت تاریخی استقصاء کے ساتھ بحث ہے، لیکن اسی محققانہ کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہایت دل شکن اور تکلیف دہ باتیں درج ہیں ، اس کی کیا تاویل کی جاسکتی ہے۔

"لجنۃ العمل الغربی" کی تقریروں کے مجموعے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کمیٹی سیاسی استعمار کا ایک دام ہے، جس کا کام مستشرقین کے ذریعہ سے مشرق میں استعمار کی جڑیں مضبوط کرنا ہے، چنانچہ یہ کمیٹی مشرق میں اسلام کے مقابلہ کے گر بتاتی ہے، اور مستشرقین ان پوشیدہ تقریروں کو جن میں اسلام کے مقابلہ کی صورتیں بتائی جاتی ہیں، غیر ملکوں میں اپنی حکومتوں کے پاس بھیجتے ہیں،

چونکہ اسلام استعمار کے خلاف ایک زبردست تعلیم ہے، اس لئے اسلام کو کمزور کرنے کے لئے یہ چال چلی جاتی ہے کہ شمالی افریقہ اور دوسرے اسلامی ملکوں میں جہاں کی مادری زبان عربی ہے، عربی کی اہمیت گھٹا کر وہاں کے باشندوں کو مقامی زبانوں کے زندہ کرنے کے دام میں پھنسایا جاتا ہے، تاکہ وہ ان کی طرف متوجہ ہوکر عربی زبان بھول جائیں اور قرآن کے سمجھنے والے باقی نہ رہیں، اس وقت ان کے خیالات اور رجحانات کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ (جیسا کہ آج کل ہندوستان میں ہورہا ہے اور اس کے مذموم نتائج بھی نکل رہے ہیں)۔

یہ تقریر جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، یوروپین مصنفات کی طرح اسلام کے متعلق خرافات کا ایک زہر چکاں مجموعہ تھی، مجھے یورپ کے قیام کے زمانہ میں یوروپین اشخاص سے اسلام پر گفتگو کرنے سے معلوم ہوا کہ ابتداء سے ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہوتی ہے جس میں شروع ہی سے اسلام سے نفرت اور مسلمانوں کی تحقیر سکھائی جاتی ہے، تاکہ نہ وہ اسلام کی طرف مائل ہوسکیں اور نہ مسلمانوں سے مل سکیں۔

مشرق والوں کو مستشرقین سے کسی خیر خواہی اور ہمدردی کی توقع رکھنا عبث ہے، کہ وہ سانچے ہی مشرق کے مفاد کے خلاف ہیں جن میں مستشرقین ڈھالے جاتے ہیں، یورپ کی یونیورسٹیوں میں خاص اغراض ومقاصد کے ماتحت طلبہ کو مشرقی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے، ان میں جو طلبہ پڑھتے ہیں، انھیں مشرق سے نہ کسی قسم کا تعلق ہوتا ہے اور نہ مشرقی زبانوں سے کوئی محبت اور انسیت ہوتی ہے، بلکہ وہ اجنبی طلبہ ہوتے ہیں، جنھیں استعماری مشین چلانے کے لئے ان ہی اصولوں پر ڈھالا جاتا ہے جس سے وہ استعماری مشین کا پرزہ بن سکیں اور اس کا خاص اہتمام رکھا جاتا ہے کہ ان کی قومی عصبیت ضایع نہ ہونے پائے، تاکہ وہ مشرق میں جاکر مشرق یا اسلام کی طرف مائل نہ ہوسکیں، ایسی صورت میں ان سے جن میں بعض آگے چل کر مستشرقین کے زمرہ میں آجاتے ہیں، یا ان کے اساتذہ سے جو بڑے بڑے مستشرقین ہوتے ہیں، مشرق یا اسلام کے ساتھ انصاف کی توقع رکھنا بے کار ہے، مستشرقین خواہ یونیورسٹی کے احاطہ میں استاذ کے لباس میں ہوں یا باہر مصنف کی شکل میں، اپنے اصل مقصد کو کسی حالت میں نظر انداز نہیں کرسکتے۔

مستشرقین نے اسلام کے خلاف زہر پھیلانے کے لئے یہ عجیب فریب دہ طریقہ نکالا ہے کہ جب تک وہ اسلامی تاریخ پر بحث کریں گے اس وقت تک خالص مورخ رہیں گے، لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، مذہب اسلام یا قرآن کی طرف متوجہ ہوں گے تو ہمیشہ مخالفانہ

لکھیں گے کہ دوسرے اس کو پڑھ کر اسلام سے خوفزدہ ہوں، اسلامی مباحث پر لکھنے میں وہ علمی دیانت اور تحقیقی اصول کو بھول جاتے ہیں، ان کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ اپنے ذہن میں ایک نظریہ یا ایک خیال فرض کرتے ہیں، اس کے بعد اس کے اسباب تلاش کرتے ہیں، اگر قرآن میں کوئی ایسی شے مل گئی جو ان کے خیال میں ان کے مفید مطلب ہے، یا اسے کھینچ تان کر اپنے مقصد کے مطابق بنا سکتے ہیں تو فوراً اسے لے لیتے ہیں، اور اگر قرآن ان کے مقصد کے معارض پڑتا ہے تو اسے نظرانداز کرکے کہہ دیتے ہیں کہ قرآن میں ہے ہی نہیں، یہ تنہا میرا سوئے ظن نہیں ہے بلکہ اس کے ثبوت میں واقعات موجود ہیں، اس موقع پر مشتے نمونہ از خروارے دو واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

مثلاً انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے چیف ایڈیٹر موسیو وینسک جو یورپ میں اسلامیات کے بڑے متبحر عالم مانے جاتے ہیں، اور جن کی رائے اسلامی مباحث پر فیصلہ کا حکم رکھتی ہے، حضرت ابراہیمؑ اور کعبہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''اپرنگر پہلا وہ شخص ہے جس کا ذہن سب سے پہلے ادھر منتقل ہوا کہ قرآن میں ابراہیم کی شخصیت بانی کعبہ کی حیثیت حاصل کرنے سے پہلے کئی دوروں سے گذرچکی ہے، اسپرنگر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے اور آئندہ اس موضوع پر لکھنے والے مستشرق کے لئے ایک معمولی سی بنیاد ڈال دی، اس کے بعد ستوہرگو وینہ نے اتنا سہارا پاکر ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کردی اور یہ دعویٰ کردیا کہ قرآن کی ان سورتوں میں جو پہلے نازل ہوئیں ہیں یا مکی سورتوں میں (مثلاً: ذاریات آیت ۲۴، حجر آیت ۵۰، صافات آیت ۸۱، انعام آیت ۷۴ اور مریم آیت ۴۲) میں حضرت ابراہیمؑ کی حیثیت محض ایک رسول کی ہے جو دوسرے انبیاء و رسل کی طرح اپنی قوم کو ڈرانے کے لئے مبعوث ہوئے تھے، ان سورتوں میں اسمٰعیلؑ کے ساتھ ابراہیمؑ کے کسی تعلق کا بھی ذکر نہیں ہے، اسی ضمن میں ہمارا مستشرق باتوں باتوں میں اشارۃً عرب میں رسول کی بعثت سے بھی انکار کرجاتا ہے اور ثبوت میں (سجدہ آیت ۲، سبا آیت ۴۳ اور یٰسین آیت ۵) پیش کرکے کہتا ہے کہ آیات میں اس کا کہیں تذکرہ نہیں ہے کہ ابراہیمؑ کعبہ کے معمار یا پہلے مسلمان تھے۔

لیکن مدنی سورتوں میں یہ حالت بدل جاتی ہے اور ابراہیم حنیف مسلم اور ملت ابراہیمی کے بانی ہوجاتے ہیں جنھوں نے اسماعیلؑ کے ساتھ خانہ کعبہ کو بنایا، جیسا کہ (بقرہ آیت ۱۸۸ الخ اور آل عمران آیت ۱۸۰ الخ) سے ظاہر ہوتا ہے۔''

ان مفروضہ مقدمات کے بعد پھر یہ نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے کہ ''اس اختلاف کا راز یہ معلوم

ہوتا ہے کہ محمدؐ نے ابتداءً مکہ میں یہودیوں پر اعتماد کیا تھا، لیکن انھوں نے تھوڑے ہی دنوں کے بعد محمدؐ کے خیالات کو دشمنی پر محمول کیا، اس سے محمدؐ کو کسی دوسرے مددگار کی ضرورت پیش آئی، اس وقت ان کی ذکاوت اور عقل سلیم نے ابوالعرب ابراہیمؑ کی ایک نئی شان کی جانب توجہ دلائی جس کے وسیلہ سے ان کو اس زمانہ کی یہودیت سے گلوخلاصی حاصل کر کے ابراہیمؑ کی یہودیت سے جو اسلام کا منشأ اور مولد ہے، رشتہ جوڑنا آسان ہوگیا اور جب مکہ والوں نے ان کے پیغمبرانہ خیالات کو قبول کرنا شروع کر دیا، اس وقت ابراہیمؑ اس مقدس شہر کے مقدس گھر کے بانی ہوگئے۔"

وینسک کے ان خیالات کو پڑھ کر دھوکا ہو جاتا ہے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے، اور اس نے اس تحقیق میں استقصاء کے ساتھ قرآن کی ایک ایک آیت کو پڑھ کر یہ رائے قائم کی ہے۔

لیکن اس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، اس نے اس دعویٰ میں انتہائی خیانت اور بددیانتی سے کام لیا ہے، اور اس کذب صریح سے اس کا مقصد صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تکذیب ہے، اور اس زعم میں یہ آیات قرآنی اس کا ثبوت ہیں۔

وہ نہایت بے باکی کے ساتھ دعویٰ کرتا ہے کہ مکی سورتوں میں ابراہیمؑ کا ذکر معمار کعبہ کی حیثیت سے اور اسماعیلؑ کے ساتھ ان کے کسی تعلق کا ذکر نہیں ہے اور مدنی سورتوں سے ملت ابراہیمؑ کا ذکر شروع ہوتا ہے، لیکن یہ تینوں دعوے سراسر جھوٹ ہیں۔

سورۂ ابراہیم خود مکی ہے، جس میں نہایت واضح طور پر کعبہ اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے تعلق کا تذکرہ موجود ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ وَارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ تَعۡلَمُ مَا نُخۡفِیۡ وَمَا نُعۡلِنُ وَمَا یَخۡفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَہَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ	اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد بے کھیتی والی وادی میں تیرے معزز گھر کے پاس بسائی ہے تاکہ وہ نمازیں پڑھیں، پس تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کردے اور ان کو پھلوں سے رزق دے، تاکہ یہ تیرا شکر ادا کریں، اے ہمارے رب! جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اس کو تو جانتا ہے اور اللہ پر کوئی چیز چھپی نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں، خدا کا شکر ہے

اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاءِ (ابراہیم:۶)

جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق دئے، میرا رب دعا کا سننے والا ہے۔

اسی طریقہ سے سورۂ انعام اور سورۂ نحل میں جو مکی ہیں، ملت ابراہیمی کا تذکرہ ہے،

سورۂ انعام میں ہے:

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰانِيْ رَبِّيْٓ اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (انعام:۲)

(اے پیغمبر!) لوگوں سے کہہ دو کہ میرے رب نے مجھ کو سیدھا راستہ دکھادیا ہے اور وہی ٹھیک دین ہے جو ابراہیم کا دین ہے، جو ایک خدا کے ہو کر رہے تھے اور مشرکین میں نہ تھے۔

اور سورۂ نحل میں ہے:

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (نحل:۱۲۳)

پھر ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ ملت ابراہیمؑ کی پیروی کرو، جو ایک خدا کے ہو رہے تھے، اور مشرکین میں نہ تھے۔

ان صریح آیات کے بعد وینسک کے دعویٰ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مستشرقین اسلامی موضوع پر لکھنے میں علمی دیانت سے کام نہیں لیتے، اور جہاں مذہبی ماخذ ان کے مقصد کے خلاف پڑتے فوراً اس سے انکار کر جاتے ہیں، جیسا کہ اوپر کی مثال سے واضح ہے، تنہا صرف ایک ہی واقعہ میں یہ حالت نہیں ہے، بلکہ وہ عموماً خیانت اور بددیانتی سے کام لیتے ہیں۔

یہ بھی عجیب نادانی کی بات ہے کہ مستشرقین اسلام یعنی ملت ابراہیمی کو جس یہودیت سے ماخوذ بتاتے ہیں، وہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل کے بہت بعد کے ایک شخص یہوداہ کی جانب منسوب ہے، جن کا زمانہ حضرت ابراہیمؑ سے سینکڑوں برس بعد ہے، ایسی حالت میں ایک چیز اپنے صدیوں بعد کی پیدا شدہ چیز سے کسی طرح ماخوذ ہو سکتی ہے، تعجب ہے کہ اس قسم کے خرافات اور واضح غلط بیانیوں کے بعد لوگ مستشرقین کی تحقیقات کو وحی سمجھتے ہیں، ان کی باتوں پر تو ایک لحہ کے لئے اعتماد نہ کرنا چاہئے۔

اوپر کا بیان ڈاکٹر حسن ہروائی کے خیالات کا خلاصہ ہے۔ ڈاکٹر زکی مبارک جن کی رائے میں مستشرقین سے فائدہ زیادہ پہونچتا ہے، اپنی رائے کی تائید میں یہ دلائل پیش کرتے ہیں:

مستشرقین سے نقصان سے زیادہ فائدہ پہونچتا ہے مستشرقین کی جماعت ایک فاضل اور باکمال جماعت ہے، ان کے ساتھ ہمیں تعلق قائم رکھنا چاہئے اور ان سے تعاون کرنا چاہئے، جو لوگ ان سے علمی اور ادبی تعلقات قائم نہ رکھنے کی دعوت دیتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ مستشرقین مستعمرین کی فوج کا طلیعہ ہیں، لیکن بالفرض اگر یہ صحیح بھی مان لیا جائے تو استعمار فی نفسہ کون سا حرم ہے، اور وہ اگر کوئی مضر اور قابل نفرت شے ہے تو اس کے انسداد کا یہ طریقہ تو نہیں کہ ہم مستعمرین کے محض دشمن بن جائیں اور ان سے ہر طرح کے روابط و تعلقات منقطع کرلیں، بلکہ ہمیں اس کی مضرتوں کے روکنے کے مناسب وسائل اختیار کرنے چاہئیں اور استعمار کے تدارک کے لئے مستعمریں کے علوم وفنون اور ان کے ان اسرار کا پتہ لگانا چاہئے جن کے ذریعہ وہ ہم پر وار کرتے ہیں، اور استعمار کا دام بچھاتے ہیں، میرے نزدیک جو شخص اس کی زحمت گوارا نہیں کرتا اور انھیں نا قابل التفات سمجھ کر نظر انداز کردیتا ہے وہ اپنا اور اپنی قوم دونوں کا دشمن ہے اس لئے کہ ان کے لٹریچر اور خیالات سے ناواقفیت اور ان کے اغراض ومقاصد کے انسداد سے غفلت وبے پروائی کرنا ان کے مقاصد کو پورا کرنا اور انھیں غفلت میں دام ڈالنے کی جرأت دلانا ہے۔

یہ بھی علی الاطلاق صحیح نہیں ہے کہ سارے کے سارے مستشرقین دام استعمار کا حلقہ ہیں، اور وہ ساری عمر اسی کار خیر میں صرف کردیتے ہیں، مستشرقیت کی ابتداء اس لئے ہوئی تا کہ یوروپین نوجوانوں کو ایسے کاموں کی ترغیب دلائی جائے جس کے وسیلہ سے وہ نوآبادیات میں زندگی بسر کرسکیں، اور اس غرض کے لئے یورپ کے بڑے بڑے ملکوں میں عربی وفارسی وغیرہ بڑی بڑی زندہ مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لئے خاص درسگاہیں قائم کی گئیں، جن کے تعلیم پائے ہوئے اکثر سفارتوں، تراجم کے دفتروں اور بعض درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے ہیں، ان کی بڑی تعداد ایسے شعبوں میں نکل جاتی ہے جو معاش کے لئے مفید ہوں، اور بہت تھوڑی تعداد مشرقی علوم و آداب کے درس ومطالعہ کے لئے اپنی زندگی وقف کرتی ہے، اس شرذمہ قلیل میں آئندہ چل کر بڑے بڑے علماء پیدا ہوتے ہیں، جو ایک عمر کی مشقت اور جدوجہد کے بعد صحیح معنوں میں عالم کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں، ان کے علمی مذاق کی وجہ سے استعمار کی رگ اگر ہوتی بھی ہے تو دب جاتی ہے، اور وہ مشرق کے شرف وعظمت کے بڑے نقیب اور ان کی تہذیب ومعاشرت بلکہ ان کے مذاہب کے بڑے حامی ومددگار بن جاتے ہیں۔

ان کے اس خالص اور بے آمیز مشرقی میلان کا ثبوت بعض مستشرقین کا خالص نظری

مسائل کی جانب انہماک ہے، جس میں کہیں سے استعماری اغراض کی آمیزش نہیں ہوتی، مثلاً بہت سے مستشرقین بصریوں اور کوفیوں کے صرفی ونحوی مذاہب کے فروق کے درس ومطالعہ میں مشغول ہو جاتے ہیں، اور مصادر کے جمع کرنے اور ان کے نصوص وشواہد اور علمائے فن کے فیصلوں کے طبع واشاعت میں برسہا برس گذار دیتے ہیں، بعض مختلف قبائل کی بولیوں اور ان کے لہجوں کے اختلاف کی تحقیق میں برسوں صرف کر دیتے ہیں اور اس قبیل کے بہت سے خالص علمی اور بے غرضانہ خدمات انجام دیتے ہیں، ان خدمات کو کون منصف مزاج استعماری اغراض کے ماتحت شمار کر سکتا ہے۔

سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ مستشرقین غلطیاں کرتے ہیں، یہ اعتراض صحیح ہے، لیکن یہ غلطیاں عموماً کسی متن کی شرح میں ہوتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی خاص رموز اور باریکیاں اور ادائیں ہیں جن کو اہل زبان کے سوا دوسرا نہیں پا سکتا، ان ہی باریکیوں اور اداؤں کی ناواقفیت کی وجہ سے مستشرقین اشعار کے سمجھنے میں نہایت مضحک غلطیاں کرتے ہیں، اس موقع پر اس کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں، مثلاً مشہور مستشرق مسٹر مارگولیتھ نے ابوالفتح ابن العمید کے اشعار ذیل:

یقول لی الواشون کیف تحبها	فقلت لهم بین المقصر والغالی
ولولا حذاری منهم لصدقتهم	وقلت هوی لم یهوه قط امثالی
وکم من شفیق قال مالک واجما	فقلت ألی مالی وتسأل مالی

کے فہم میں نہایت فاش غلطی کی ہے، اوپر کے دونوں شعر اور تیسرے شعر کے پہلے مصرع کے معنی بالکل صاف ہیں، البتہ دوسرے مصرع کے معنی نہیں نکلتے، اس کے سمجھنے میں مسٹر مارگولیتھ گڑ بڑا گئے اور اپنی فہم کے مطابق یہ اصلاح کر دی فقلت انا مالی وان تسألی مالی، حالانکہ ان کی یہ تصحیح پہلی غلطی سے زیادہ مضحک ہے، اگر وہ ابن خلکان کو جس میں یہ مصرع صحیح لکھا ہوا ہے دیکھ لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ مصرع اس طرح ہے فقلت تریٰ مالی وتسألی عن حالی۔

دوسری غلطی مستشرقین کی ایک پوری جماعت سے جو موسیو ڈوزی کے ساتھ نفح الطیب کی تصحیح میں شریک تھی سرزد ہوئی ہے، انھوں نے ابوالولید کے ان اشعار

الیک اباحفص وما عن ملالة	ثنیت عنانی والحبیب حبیب
مقالا یطیر الحمیر عن جنباته	ومن تحته قلب علیک یذوب

کو جو نفح الطیب میں ہیں، کسی دوسری کتاب میں مقالا کے لفظ کو سطالا پڑھ کر لکھ دیا کہ ان اشعار کے معنی صحیح نہیں نکلتے، اور معلوم ہوتا ہے کہ درمیان سے کوئی شعر حذف ہو گیا ہے، حالانکہ مقالا ہی صحیح ہے، اور اسی سے صحیح معنی نکلتے ہیں، اس غلطی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ مقالا کی ترکیب نحوی کو نہ سمجھ سکے، اگر انھیں معلوم ہوتا کہ مقالا پہلے شعر کے لفظ الیک کا مفعول بہ ہے تو یہ غلطی نہ ہوتی۔

پہلی غلطی معجم الادباء میں ہے، مارگولیتھ نے نہایت اہتمام کے ساتھ شایع کیا ہے، اور دوسری غلطی نفح الطیب میں ہے، ممکن ہے تلاش کرنے سے دس پانچ اور زیادہ فاحش غلطیاں نکل آئیں، لیکن یہ خفیف غلطیاں اس عظیم الشان خدمت کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھتی ہیں جو مارگولیتھ اور مسیو ڈوزی نے معجم الادباء میں نفح الطیب جیسی اہم کتابوں میں نہایت صحت اور اہتمام کے ساتھ شایع کر کے عربی زبان کی انجام دی ہے، آخر الذکر کتاب اندلس کے اسلامی عہد کی علمی اور ادبی تاریخ کا سب سے پہلا ماخذ ہے، مصر میں بھی یہ کتاب چھپی ہے، لیکن نہایت مسخ شدہ شکل میں، جس میں فہرست تک کا پتہ نہیں ہے، ایسی حالت میں اس عظیم الشان اسلامی خدمت کے مقابلہ میں ان معمولی اغلاط کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہ جاتی۔

دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ مستشرقین شریعت اسلام کی شرح میں غلطیاں کرتے ہیں، یہ اعتراض البتہ صحیح ہے، بہت سے مستشرقین اسلام کے متعلق ایسے خرافات لکھتے ہیں جو کسی طرح علماء اور محققین کے شایان شان نہیں ہیں، خصوصاً جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر کچھ لکھتے ہیں، لیکن اس میں بھی آپؐ کی زندگی کے خانگی، اجتماعی اور تشریعی پہلوؤں پر ان کے خاص نظریے ہیں جن سے بعض مذہبی پہلوؤں کی خدمت ہوتی ہے۔

میری رائے تو یہاں تک ہے کہ اسلام دشمن مستشرقین نے اپنی اسلام دشمنی کی وجہ سے بھی اس کی بڑی خدمات انجام دی ہیں، مثلاً اس سلسلہ میں انھوں نے قرآن وحدیث اور اس کے متعلقات پر نہایت عمدہ تالیفیں طبع کیں، ان کی فہرست بنائیں، ان کی ایسی بہتر تبویب اور ترتیب کی کہ ہمارے شیوخ ازہر سے بھی ممکن نہ تھی، موسیو ویفسک نے بھی جو ہمارے دوست حسین ہراوی کے تیر ملامت کا سب سے زیادہ نشانہ ہیں حدیث نبویؐ پر اپنی تالیف سے اسلام کی بڑی خدمت انجام دی، بالفرض اگر ہم مناظرانہ طور پر یہ بھی مان لیں کہ اس کتاب کی اشاعت میں حق وصداقت کا جذبہ اور حسن نیت شامل نہ تھا تو بھی اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس سے غیر ارادی طریقہ سے اسلام کی خدمت ہوگئی، آج کل امریکہ اور یورپ میں آثار اسلامیہ کی اشاعت سے زیادہ اسلام کی

کون سی خدمت ہو سکتی ہے، اور یہ خدمت مسلمانوں کا فرض تھا لیکن افسوس انھوں نے اس فرض کو محسوس نہیں کیا، اور اس کو دوسروں پر چھوڑ دیا کہ وہ ان کی میراث میں جو تصرف چاہیں کریں۔

افکار کی زندگی ان پر بحث وتنقید میں ہے، افکار کے لئے یہ قابل افسوس نہیں ہے کہ لوگ اس پر تنقید یا اس کی مخالفت کرتے ہیں، بلکہ افسوس ناک یہ ہے کہ اسے نظرانداز کر دیا جائے، اور مدحا اور ذما اس پر کچھ نہ لکھا جائے، اس لئے اسلام ان کے خیر سے استفادہ کی طرح ان کے شر سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے، میں قیام پیرس کے زمانہ میں بدھ مذہب کے انسانوں اور خرافات کی اشاعت کی کثرت پر رشک کرتا تھا، اور دعا کرتا تھا کہ کاش خدا اسلام کو بھی ایسے خدام عطا کرتا جو ان ممالک میں اس کے فضائل کی اشاعت کرتے۔

مستشرقین نے ہم سے تین صدی پہلے اسلام کے اسلامی اور ادبی درس ومطالعہ کی طرف توجہ کی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مصر بلکہ مشرق کا بڑے سے بڑا محقق ان کی علمی بحث وتحقیقات کو جو ہر شعبہ میں پھیلی ہوئی ہے، نظر انداز نہیں کر سکتا۔

کس قدر شرم اور افسوس کی بات ہے کہ ازہریوں کو، جن کو اسلام کا ملجاو مامن سمجھا جاتا ہے، چند برسوں پہلے اسلامی تاریخ پڑھانے کا ڈھنگ بھی نہ آتا تھا، کس قدر شرم کی بات ہے کہ آج بھی جامعہ مصریہ کے ادبی کالج میں عربی زبان حاصل کرنے والے طالب علموں کی تعداد سار بن یونیورسٹی کے عربی طلبہ سے کم ہے، کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ پیرس کی السنہ مشرقیہ کی درسگاہ میں عربی کے اتنے اور ایسے ایسے مطبوعہ ماخذ ہیں کہ مصری دارالکتب میں ان کا نام بھی نہیں۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ان کی علمی فضیلت کی وجہ سے ہمارے ذہن ودماغ میں ان کے اثرات زیادہ پائدار ہوتے ہیں، اپنی قوم کو میرا مشورہ ہے کہ وہ ان مستشرقین کے نقش قدم پر ضرور چلیں، لیکن اسی کے ساتھ ہم کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ مستشرقین انسان ہیں، فرشتہ نہیں ہیں، ان کے بھی اغراض ومقاصد ہیں اور وہ بھی انسانوں کی طرح غلطیاں کرتے ہیں، اور چونکہ ان کے پاس خیالات کے نشر واشاعت کے لئے وسائل زیادہ وسیع ہیں، ان کی یہ غلطیاں پھیل جاتی ہیں اور ان کا نقش زیادہ پائدار ہوتا ہے، میں مستشرقین کی غلطیوں کو ناقابل التفات نہیں سمجھتا، اور بے سوچے بوجھے ان کی پیروی کرنے کی دعوت نہیں دیتا، لیکن میرا یہ عقیدہ ہے کہ ان کی کوششوں سے لغوی اور اسلامی درس میں زندگی پیدا ہوگئی ہے اور دنیا میں کوئی چیز خالص شر اور خالص خیر نہیں ہے، لیکن ان علمائے مستشرقین کے کاموں میں نفع کا پہلو غالب ہے۔

مستشرقین کی خدمات
اور
ان کے حدود

جناب سید وحید الدین صاحب، نئی دہلی

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مغربی عالموں نے علوم اسلامی کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، بہت سے مخطوطات جو دور دراز کتب خانوں میں پوشیدہ تھے، ان کا سراغ لگایا، سائنٹفک طریقہ سے ان کو ایڈٹ کیا اور دنیائے اسلام سے ان کو روشناس کرایا، آج بھی مسلمان علماء نے اس سلسلہ میں جو کچھ کام کیا ہے، کیا باعتبار مقدار اور کیا باعتبار معیار، ان کا مجموعی طور پر بھی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہر عالم جب کسی دوسری تہذیب کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ ان روایات اور تعصبات سے اپنے کو منزہ نہیں کرسکتا جن میں اس کی پرورش ہوئی ہے، اس طرح ہر تہذیب کا علمبردار اپنے ساتھ اپنی تہذیب کا بوجھ اٹھائے رکھتا ہے، اور اپنی ہی روایات کی روشنی میں دوسری تہذیب کو جانچنے اور اس پر حکم لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ مستشرقین کا اسلام کے ساتھ معاملہ اپنی خاص نوعیت رکھتا ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مستشرقین عام طور پر یا تو یہودی النسل رہے ہیں یا پھر عیسائیت سے وابستہ رہے ہیں، صلیبی جنگوں نے ایک معاندانہ فضا پیدا کردی تھی، جس کا اثر اب تک باقی ہے، اسلام اور عیسائیت کے تعلقات اس طرح شروع ہی سے ایسے ماحول میں نشو ونما پاتے رہے ہیں جو اسلام کی صحیح تفہیم کے لئے بالکل ناسازگار تھا، خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کذب وافتراء کا نشانہ بن گئی۔

یہاں یہ بات بھی واضح ہوجانا چاہئے کہ اسلامی ثقافت کے دوسرے پہلو بھی ہیں، جن کا

براہ راست مذہب سے تعلق نہیں، جیسے فن تعمیر، شعروشاعری، مصوری (خاص طور پر خطاطی) وغیرہ اور سائنسی علوم جیسے ریاضی، ہیئت، بصریات، تاریخ وغیرہ، ان علوم کے بارے میں مستشرقین کا رویہ بڑی حد تک مذہبی تعصبات سے آلودہ نہیں ہوا ہے، جرمن مستشرق زخاؤ نے البیرونی کی کتاب الہند کو ایڈٹ کیا، البیرونی کی اہمیت کا احساس اسی زمانہ سے دن بدن بڑھتا گیا، اسی طرح ابن خلدون کا کارنامہ بہت بڑی حد تک مستشرقین ہی کی کاوشوں سے ہمارے سامنے آیا اور دنیا کو معلوم ہوا کہ تاریخ کے عمرانی شعور کا سرچشمہ اسلامی فکر ونظر میں ملتا ہے، اصل مشکل اس وقت آپڑتی ہے جب ہم دینیاتی مسائل، قرآن حکیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا جائزہ لیتے ہیں، یہاں پہلے تو اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہئے کہ مذہبی معاملات میں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے متعلق ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ لوگ بغیر فضل الٰہی کے ان سے اتفاق کرسکیں، لیکن ہم یہ ضرور توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ قیاس آرائیوں اور امکانات کو اپنے حدود میں رکھیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ مستشرقین نے اکثر ایسا نہیں کیا ہے بلکہ جہاں کوئی امکان سلبی نوعیت کا رہا اس کو انھوں نے دوسرے امکانات پر غلبہ دے دیا۔

مستشرقین کے اس رویے کی ایک افسوسناک مثال بنی قریظہ کے واقعہ سے دی جاسکتی ہے جہاں اس واقعہ کے بیان میں تخیل کو زیادہ جگہ دی گئی ہے، یہاں میرا اس واقعہ کی نوعیت یا اصلیت سے بالکل سروکار نہیں ہے، یہ تو مورخین کا کام ہے کہ وہ اس کی صحیح طور پر جانچ کریں، یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں رسول اللہؐ کے صحابی سعد بن معاذؓ کے حکم بنائے جانے کا ذکر ہے، وہاں بول (Buhl) جیسے مستشرقین نے اس گمان کا اظہار کیا ہے کہ سعدؓ کا فیصلہ رسول اللہؐ کے ایماء پر ہوا ہوگا۔ مورخ تاریخ میں امکانات کا لحاظ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن ایسا امکان جس کا نشانہ ایسی شخصیت ہو جس کے تقدس کے سہارے کروڑوں مسلمان اپنی روحانی نجات کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، انتہائی افسوس ناک ہے، ایک سے زیادہ مستشرق نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ پہلے تو رسول اللہ کو یہودیوں سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں اور جب وہ پوری نہیں ہوئیں تو آپ نے قبلہ کا رخ بدل دیا۔

بعض دیانت دار مغربی عالموں نے مستشرقین کے ''حدود'' کا خود ہی اعتراف کیا ہے، اور برنارڈ لیوس نے اپنے ایک مضمون ''اسلام'' کی ابتدا اس طرح کی ہے۔

''یہ کہا گیا ہے کہ عربوں کی تاریخ یورپ میں خاص طور پر ایسے مورخین نے لکھی، جو عربی سے نابلد تھے یا ایسے عربی دانوں نے لکھی جو تاریخ سے نابلد تھے۔''

یہ بھی چھپی ہوئی بات نہیں ہے کہ ایسے علوم وفنون جن سے کوئی فنی صلاحیت کے بغیر عہدہ برآ نہیں ہوسکتا، ان فاضلوں کے ہاتھ میں رہے جو متعلقہ علم وفن سے بالکل ناواقف تھے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں نے فلسفیانہ فکر میں جو خدمت انجام دی ہے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ ارسطو کے صرف نقال اور ناقل رہے ہیں، چونکہ مغربی فلسفہ کی تاریخ میں عیسائی علم کلام کو عرصہ تک کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اس لئے مسلمانوں کے تفکر اور ان کے علم کلام کے سلسلہ میں ان کی خدمات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا، اور اب یہ آہستہ آہستہ معلوم ہو رہا ہے کہ نہ صرف عیسائی علم کلام مسلمانوں کے تفکر کے بغیر سمجھا جا سکتا ہے، بلکہ بعض بنیادی تصورات ایسے بھی ہیں جو مسلمان فلاسفہ نے پیش کئے جن کا اثر فلسفیانہ تفکر پر کافی رہا۔ ابن رشد کے علاوہ ابن طفیل نے جو تعلیم کا خاکہ اپنے فلسفیانہ رومانس حیّ بن یقظان میں پیش کیا ہے، وہ فلسفہ تعلیم کے مباحث میں اب قابل توجہ بن گیا ہے، اور یہ سوال کہ خدا کا تصور کہاں تک وہبی ہے، اور کہاں تک اکتسابی، ایسا سوال ہے، جس کی صدائے بازگشت ہم کو ڈیکارٹ اور لائبنیز کے فلسفہ میں ملتی ہے، یہی حال تصوف کا ہے، ابتدا میں تو مستشرقین تصوف کے ماخذ دوسرے مذاہب میں ڈھونڈتے رہے، کسی نے فنا کے تصور کو بدھ مذہب کے نروان سے جوڑنے کی کوشش کی اور کسی نے صوفیانہ تصور توحید کو ویدانت سے ملانے کی کوشش کی، لیکن اب میسون کی سرکردگی میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو قرآن ہی میں تصوف کی بنیادیں تلاش کرتا ہے اور اس کو خاص اسلامی مظہر قرار دیتا ہے، گوکہ یہ بات بھی واضح ہے کہ تاریخ تصوف میں بہت سی بے راہ روی رہی ہے، اور کیفیات سے مغلوب صوفیہ کی زبان سے ایسے الفاظ بھی صادر ہوئے جن کو شریعت کے مغائر سمجھا گیا، لیکن ان کی تمام باتوں کے باوجود تصوف کا بنیادی مزاج تسلیم ورضا رہا ہے، اور قرآن ہی کے تصور احسان کو ایک بنیادی رکن قرار دیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح کردینا ضروری ہے کہ مستشرقین سب ایک طرح کے نہیں رہے، بلکہ بعض ایسے بھی رہے ہیں جنھوں نے راسخ العقیدہ عیسائی ہونے کے باوجود کھلے دل سے اس حقیقت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ عیسائی روحانیت اور وہ ادب جو عیسائی روحانیت سے متاثر ہے، اسلام کے اثرات کو بیّن طور پر ظاہر کرتا ہے، اس سلسلے میں سب سے نمایاں مقام ہسپانوی مستشرق پروفیسر اسین پلاسیوس (Asinpalacios) کا ہے، جس نے امام غزالیؒ پر سب سے جامع کتاب لکھی، اگرچہ اس نے اپنی کتاب کا نام کچھ ایسا رکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزالیؒ کا جو شعور تھا وہ اسلام سے زیادہ عیسائیت کے زیادہ قریب ہے، اس نے غزالی کے

صوفیانہ شعور کو مسیحی شعور کی مثال سمجھا، لیکن سب سے بڑا نمایاں کام اس نے یہ کیا کہ مغربی ادب اور خاص طور پر دانتے کے شاعرانہ شاہکار طربیہ سرمدی میں اسلامی اثرات کا کھوج لگایا، جس سے مغرب کے ایک خاص طبقہ میں شدید ردعمل پیدا ہوا، اس نے اپنی کتاب St. John Of the Cross and Islam میں اس بات کو پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا کہ عیسائی زہد اور باطنی زندگی کے علمبردار اس حد تک اسلام سے متاثر ہوئے کہ اس حلقہ کی اصطلاحات میں ہسپانوی صوفی ابن عباد کا اثر ملتا ہے، اور یہاں ہم کو خالص صوفیانہ تمثیلات ملتی ہیں، بہرصورت ان کی تصانیف اور ان کے بنیادی خیالات سے متعلق ہمارا ردعمل کیسا ہی سلبی کیوں نہ ہو، ان کی خدمات اتنی عظیم ہیں کہ جن کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں، اگر کوئی شخص مسلمان یا غیر مسلم، اسلام کے ادب و مزاج کا جائزہ لینا چاہے تو ان کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

اب میں ان تحدیدات کا مختصر ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے مغربی انداز فکر بری طرح متاثر ہے، یہاں کوئی تفصیلی جائزہ تو پیش نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ نہ تو میں مورخ ہوں نہ کوئی اسلامیات کا طالب علم، اس لئے میں ایک مختصر تبصرہ ایک اہم کتاب کے بعض مضامین پر پیش کروں گا جس سے مستشرقین کی خدمات اور ان کی تحدیدات دونوں اچھی طرح سامنے آجائیں گی یہ کتاب مشہور جرمن مستشرق رودی پارٹ (Rudi Paret) کی مرتب کردہ ہے، اس کا نام القرآن ہے، اس میں پارٹ نے ان مضامین کا انتخاب کیا ہے، جو قرآن سے متعلق مغرب میں لکھے گئے، زیادہ تر مضامین جرمن زبان میں ہیں، اور بعض انگریزی اور فرانسیسی میں بھی ہیں، یہاں ہم کو اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ پارٹ کا اور ان کے رفقاء کا اسلام کے متعلق کیا زاویۂ نگاہ ہے، اور کس حد تک یہ مقولہ کہ العلم الحجاب الاکبر ان پر صادق آتا ہے اور ساتھ ہی اس میں ایک ایسے مستشرق کا بھی مضمون ہے جس میں اس نے اپنے مذہبی رفقاء کے خلاف بڑے موثر انداز میں اپنی آواز بلند کی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مغربی تحقیق ابھی تک ان تعصبات سے خود کو آزاد نہیں کرسکی ہے، جو رسولؐ خدا کی شخصیت اور اسلام کی مذہبی بنیادوں کے متعلق ان کو ورثہ میں ملے ہیں اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جن غیر مسلم محققین کا جغرافیائی دائرہ اسلام اور عیسائیت کی کشمکش سے باہر ہے ان کی تصانیف کا مزاج بالکل مختلف ہے، مثلاً جاپانی عالم ازتسو (Izutsu) نے جو کچھ اسلامی تصوف اور دینیاتی تصورات کے متعلق سپرد قلم کیا ہے وہ ان طریقہ ہائے کار سے بالکل ہٹا ہوا ہے جن پر مغربی فکر گامزن رہی ہے، اس امر کا پروفیسر برنارڈ لیوس نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

''مغربی دینیاتی تعصبات کی آخری نشانیاں اب بھی بعض مغربی
فضلاء کے پاس ملتی ہیں جو علمی خول اوڑھے ہوئے حواشی میں ظاہر ہوتی ہیں۔''

پروفیسر پارٹ کی مرتب کردہ کتاب میں جو مضامین جمع کئے گئے ہیں وہ اس کا بین ثبوت ہیں کہ کیوں قرآن ہمیشہ مغربی فاضل کے لئے ایک کتاب مختوم کی حیثیت رکھتا رہا ہے۔ پارٹ کا لکھا ہوا آربری کے قرآن کے ترجمہ پر تبصرہ قابل توجہ ہے، آربری مسلم روایت کا احترام کرتے ہوئے اس کو ترجمہ کا نام نہیں دیتے بلکہ وہ اسے ایک تعبیر قرار دیتے ہیں، اور مغربی علماء کی قرآن کو نئے سرے سے ترتیب دینے کی کوششوں کو بہت ناپسند کرتے ہیں، آربری کے نزدیک گو کہ وحی کا نزول بیک وقت نہیں ہوا لیکن ان چیدہ چیدہ پیاماتِ الٰہی کو بہ حیثیت کل کے دیکھنا ہوگا، جب آربری نے قرآن کے انگریزی ترجمہ کو ''تعبیر'' کا نام دیا تو پارٹ نے اس کو مسلمان دوستوں کی خوشنودی کے حصول کا وسیلہ قرار دیا، یہ جرمن فاضل یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ خود ترجمہ کی کوشش ایک مشکوک عمل ہے، خود قرآنی متن کے متعلق نہایت ہی معاندانہ مشاہدات سے گریز نہیں کرتا، قرآن کا کوئی مترجم اس کو نظر انداز نہیں کرسکتا کہ قرآن اس معنی میں ''کتاب'' نہیں ہے، جس معنی میں کتابیں ہمارے کتب خانوں کی زینت بنتی ہیں، قرآن نہ صرف ایسی ''کتاب'' ہے جو پڑھی جاتی ہو بلکہ وہ قابل تلاوت وقرأت بھی ہے، اور یہ چیز ترجمہ میں نہیں پیدا ہوسکتی، اسی کتاب میں بول کا بھی ایک مضمون قرآنی مماثلتوں اور مقابلتوں (Similarities and Comparisions) پر ہے، جو بہت قابل توجہ ہے۔ وہ اپنی توجہ خاص طور پر سورۂ نور کی آیات پر مرکوز کرتے ہیں، وہ یقینی طور پر یہ کہنے سے قاصر ہیں کہ کیا واقعی یہ آیات روحانی معنویت اور عمق کو ظاہر کرتی ہیں یا نہیں، ان کو بس اتنا یقین ہے کہ رسول اللہؐ نے عیسائی راہبوں کی صحرائی خلوت گاہوں میں جو چراغ روشن دیکھے تھے، انھوں نے ان پر اتنا گہرا اثر چھوڑا کہ قرآن میں بطور تشبیہ کے ان کا استعمال کیا گیا، وہ یہ تو مانتا ہے کہ یہاں جو مثال پیش کی گئی ہے، وہ قابل توجہ اور انوکھی ہے لیکن کسی نہ کسی طرح سے اس کی اہمیت گھٹانے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

اس کتاب کا مرتب ایک ممتاز جرمن عالم ضرور ہے، اور اس کا قرآن کا جرمن ترجمہ مستشرقین کے نزدیک بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، وہ تاریخی طرز تحقیق کا بڑا علم بردار ہے، حالانکہ اس طریقۂ کار پر حال میں مغربی فضلاء نے بڑی سخت تنقید کی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کسی سوسائٹی اور نظام حیات کے اقدار کو نظر انداز کرکے ہم اس تہذیب کے مزاج کو

سمجھ نہیں سکتے اور صرف تاریخی کھوج سے ہم صداقت کا پتہ نہیں لگا سکتے، اب دیکھنا یہ ہے کہ برسوں کی تحقیق اور کاوش کے بعد پارٹ کس نتیجہ پر پہنچتا ہے، اس کے نزدیک اسلامیات سے متعلق مغربی علماء کی تحقیق نے جو نتائج پیش کئے ہیں وہ بنیادی طور پر صحیح اور معروضی ہیں اور اب اگر کسی تبدیلی کی توقع کی جاسکتی ہے تو اس کی صرف ضمنی حیثیت ہوگی، اب ایسے سنسنی خیز نتائج پیش ہونے کی مستقبل میں توقع نہیں کی جاسکتی جن سے پچھلے نتائج کا بطلان ہو سکے، ہاں پارٹ کی تحقیق نے ایک سنسنی خیز نتیجہ تو ضرور پیش کیا ہے، اس کے انکشاف کے مطابق قرآن نہ صرف حضرت عیسیٰ کے اٹھائے جانے کا قائل ہے بلکہ اس کا بھی کہ ان کی مقدس ماں بھی آسمان پر اٹھالی گئیں اور ساتھ ہی پارٹ کے کہنے کے مطابق رسول اللہ کو یہ بھی یقین تھا کہ ''ایام اواخر'' میں حضرت مریم کا ظہور ہوگا، بعد میں اسی خیال کی تائید میں ایک دوسرے محقق ہینگ (Henning) کا ایک پورا مقالہ دیا گیا ہے، یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ خیال کہ حضرت مریم آسمان پر اٹھالی گئیں، کیتھولک کلیسا کا ایک عقیدہ بن گیا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عجیب سے مفروضہ کی کیا بنیادیں فراہم کی گئی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پارٹ اور ہینگ دونوں ''دوستانہ مراسلت'' کے ذریعہ ایک دوسرے سے فیضیاب ہوئے، ان کے دعوے کی بنیاد قرآن حکیم کی یہ آیات ہیں:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵۔۱۷)

اس آیت سے ہینگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم دونوں کو زندہ تصور کیا گیا، اور یہ بھی تصور کیا گیا ہے کہ دونوں عالم سماوی میں زندہ موجود ہیں اور اسی لئے پیغمبر اسلامؐ حضرت مریم کی اس عالم سماوی میں جسمانی منتقلی کے قائل تھے۔ اس عقیدے میں ہینگ کو مشرقی کلیسا کے عقیدے کی جھلک نظر آتی ہے، ان کو یہ بات قابل لحاظ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت مریم کا ذکر حضرت مسیح کے ساتھ ساتھ کیا گیا اور یہ صرف اس لئے ہوا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نہ صرف حضرت مسیح بلکہ حضرت مریم کی بھی عالم سماوی میں جسمانی منتقلی کو تسلیم کرتے ہیں، ہمارے فاضل محقق رقم طراز ہیں ''شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلے حضرت مسیح کو ابن مریم کہا گیا یا شاید حضرت مسیح کے تسلسل حیات کا خیال ان کے ذہن میں حضرت مریم کے تسلسل حیات کے تصور کا محرک بنا، ان

دو امکانات میں وہ دوسرے امکان کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کا فیصلہ کن ثبوت وہ اس میں دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے مشرقی کلیسا سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس سارے نظریہ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ کس طرح عیسائی اثر قرآنی تصورات میں عمل پیرا رہا۔ حالانکہ سیدھی سادی توجیہ تو یہ ہے کہ یہاں قرآن کے پیش نظر نہ حضرت مسیح کی اور نہ حضرت مریم کی مخصوص حیثیت ہے بلکہ اس کا اصرار تو صرف قدرت الٰہی پر ہے جو کسی ارضی مخلوق کے متعلق کوئی استثنا روا نہیں رکھتی۔ خواہ اس کا مقام کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ جب قرآن حضرت مسیح اور ان کی ماں کا ذکر کرتا ہے تو ان کا ذکر تمام ارضی مخلوقات کے ساتھ کرتا ہے، یہاں اس کا تعلق ان کے تقدس سے کچھ نہیں ہے طرفہ تماشا یہ ہے کہ اس آیت کو جس میں عیسائی تصور مسیح کے خلاف سختی سے آواز اٹھائی گئی ہے، توڑ مروڑ کر مسیحی دینیاتی تصورات میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، بہر حال پیغمبر اسلامؐ سے ایسے عقیدے کو منسوب کرنا جو ان کے ماننے والوں کے لئے بالکل اجنبیت رکھتا ہے سائنسی تحقیق کے مطالبات کے بالکل منافی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خود پروفیسر پارٹ یعنی اس کتاب کے فاضل مرتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے متعلق کیا کہتے ہیں، ان کے مقالہ کی بحث اس سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت قرآن کی روشنی میں کس طرح نمودار ہوتی ہے اور ہم رسول اللہؐ کی زندگی کے متعلق قرآن سے کیا مواد حاصل کر سکتے ہیں، پارٹ کے کہنے کے مطابق سب سے پہلے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ بہت ہی حساس مذہبی آدمی تھے، کیوں کہ انھوں نے اپنی تمام فتوحات کا اپنے آپ کو ذمہ دار قرار نہیں دیا، بلکہ انکسار محض سے ان کو تائید الٰہی سے منسوب کیا۔ یہاں تک کہ مکہ کی فتح بھی جسے "فتح" کہا گیا ہے، فتح کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب "فیصلہ" ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کامیابی کا سہرا رسول اللہؐ اپنی یا اپنی جماعت کے سر نہیں لیتے بلکہ خدا کی عظمت اور قدرت کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن ایک پیغمبر تو پیغمبر ہر مسلمان آج بھی جب وہ کچھ کامیابی حاصل کرتا ہے اور اس کی توقعات پوری ہوتی ہیں خواہ اس کی سطح کچھ بھی کیوں نہ ہو، مادی یا روحانی، خدا کا شکر "الحمد للہ" کے ساتھ بجالاتا ہے، اور اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے فضل الٰہی میں اپنی کامیابی ڈھونڈتا ہے، یہاں انکساری کا کوئی سوال نہیں بلکہ اس چیز کو وہ حقیقت جانتا ہے، اور یہی اس کا ایمان ہے۔ اس کی انکساری اس کے ایمان ہی کا ایک جزو ہے، رسول اللہؐ کے ضمن میں انکساری کا بیان مذہبی اقدار کے شعور کی طرف سے بے حسی کی علامت ہے۔

پارٹ اپنے بہت سے رفقاء کے ساتھ جو طریقہ کار اختیار کرتا ہے، اس میں وہ تاریخی طریقہ کار کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تعبیر بھی شامل کرتا ہے، وہ ان واقعات میں جو قرآن میں پچھلے پیغمبروں کے متعلق بیان کیے گئے ہیں، رسول اللہ کے تجربہ کا عکس دیکھتا ہے، دوسرے الفاظ میں وہ ابتدائی تاریخ میں صورتِ حاضرہ کو پاتا ہے یعنی اگر قرآن میں پچھلے پیغمبروں کے متعلق سوسائٹی کے اونچے طبقے (ملأ) کی مخاصمت کا ذکر ہے تو وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ رسول اللہ بھی اس قسم کی مخاصمت سے دوچار رہے ہوں گے اور اس بات کی تائید ان کے سوانح نگاروں سے ہوتی ہے، اس سے ہمارا فاضل مصنف ایک بہت دلچسپ انکشاف کا سہرا اپنے سر لیتا ہے، یعنی جہاں حضرت شعیبؑ کی مخالفت ہوئی تو مخالفوں نے کہا ''شعیب ہم کچھ نہیں سمجھتے جو تم کہہ رہے ہو، تمہارا تعلق ہم میں کے کمزور لوگوں سے ہے، اگر ہم کو تمہارے قبیلے کا خیال نہ ہوتا تو ہم تم پر پتھر پھینکتے کیونکہ تم ہمارے مقابلہ میں طاقتور نہیں ہو۔ قَالُوا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا وَّلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ (۱۱-۹۱)

اب پروفیسر پارٹ کے خیال میں یہاں پتھر پھینکنے سے مطلب سنگساری نہیں ہے جیسا کہ انجیل کے قصوں میں وارد ہوا ہے، بلکہ دھمکی ہے۔ جو رسول اللہ کو دی گئی ہوگی کہ اگر وہ اپنی دعوت کو یونہی چلاتے رہے تو ان پر پتھر پھینکے جائیں گے۔ یہ واقعہ کہ کوئی دھمکی انھیں دی گئی ہوگی کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں معلوم ہوتا، سوائے ان قصوں کے جو دوسرے پیغمبروں کے متعلق بیان کیے گئے ہیں، ہم کو پروفیسر پارٹ کی خیال آرائی سے کچھ بحث نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ پتھر رسول اللہ کی ذات پر آج بھی پھینکے جاتے ہیں۔ لیکن وہ عرب کے قدیم صحرا کے گلی کوچوں سے نہیں بلکہ بیسویں صدی کے یورپ کی دانشگاہوں کے مستند مراکز سے، اور رسول اللہ کی مذہبیت پارٹ کی دلچسپی کا اصل موضوع نہیں، جتنا یہ بتانا کہ وہ ایک آدمی تھے اور ان میں وہ تمام کمزوریاں موجود تھیں جو ایک آدمی میں ہوتی ہیں۔ پیغمبر بھی ایسے واقعات سے دوچار ہوئے کہ ان پر ناکامی و محرومی کا غلبہ ہوا، حزن و ملال بھی ان پر چھا گیا، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ کیا کسی غیر یقینی حالت نے ان کو اپنے راستے سے برگشتہ کیا، انھوں نے کبھی خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، لیکن وہ ہم جیسے انسان ہونے کے باوجود بھی ہم سے الگ تھے، ایسے انسان جن کی مثال کی تکرار نہیں ہو سکتی اور اس سے زیادہ گہرے معنوں میں جس معنیٰ میں کسی فرد کی بھی تکرار نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے سارے فضل و ناموری کے باوجود کسی فرد میں وہ سپردگی اور محبت پیدا نہیں کر سکتے جو انھوں نے نہ صرف اپنے معاصرین میں

پیدا کی، بلکہ آج بھی بے شمار لوگوں کے دلوں پر ان کی حکومت ایسی ہے کہ چودہ سو سال کے بعد بھی ان کے لئے وہ جان کی بازی لگانے کے لئے تیار ہیں اور انھوں نے وہ مقام حاصل کر لیا ہے، جس کو نہ کسی تلوار اور نہ کسی کا قلم مٹا سکتا ہے اور جس کے نام کے طفیل ہر دور میں والہانہ شاعری اور وجد آفریں تصوف کے بہترین نمونے دیکھنے میں آئے۔

لیکن پارٹ کی مرتب کی ہوئی اسی کتاب میں ایک مضمون نوک کا بھی ہے جس نے بڑی سختی سے ان تمام کوششوں کی مذمت کی ہے جو رسول اللہؐ کے کردار اور شخصیت کو مسخ کرنے کے سلسلے میں کی جاتی ہیں، اس مغربی فاضل کے کہنے کے مطابق مستشرقین جزئیات میں اس طرح پھنس گئے ہیں اور قرآن و اسلام کی خصوصیت کا سراغ تاریخ میں تلاش کرنے میں اس قدر سرگرداں ہو گئے ہیں کہ رسول اللہ کی تخلیقی شخصیت تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ اس کے یہ الفاظ قابل غور ہیں ''کبھی بھی عقلی علوم کے ذریعہ اس شخصیت کے اسرار کو بے نقاب کرنا ممکن نہ ہو سکے گا اور کبھی بھی ہم اپنی جانچ اور تحقیق کے ذریعہ یہ پتہ چلانے کے قابل نہ ہو سکیں گے کہ وہ کیا واردات تھے، جنھوں نے ان کی روح کو متاثر کیا، یہاں تک کہ انھوں نے اپنے ضمیر کی صبر آزما آزمائشوں سے گذر کر اپنے کو خدا کی طرف سے منتخب کردہ ایک نذیر اور رسول قرار دیا۔'' اس کے مطابق اگر ہم اس حقیقت کو مان لیں تو یہ سوال کہ رسول اللہؐ کے پیش نظر کیا نمونے اور تاریخ کے کون سے ماخذ تھے، جن سے انھوں نے استفادہ کیا، غیر اہم سوال بن جاتا ہے، یعنی وہ سوالات جو تاریخ کے میکانکی تصورات کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔

پھر یہی مصنف لکھتا ہے کہ ''عیسائی مناظر اس بات پر مصر رہے ہیں کہ مدینہ کا زمانہ باطنی انحطاط کا زمانہ تھا اور مدینہ میں وہ ابتدائی ولولہ باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن اس قسم کا تصور یہ حقیقت نظر انداز کر دیتا ہے کہ سچا مذہب پورے انسان پر حاوی ہوتا ہے اور اس کی تمام قوتوں کو متحرک کرتا ہے، یہ سوال کہ کیا رسول اللہؐ نے مکہ میں بھی سیاسی عمل میں کچھ حصہ لیا ہے، لایعنی ہے۔ کیونکہ ان کے لئے مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کا امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل یہ ہے کہ مدینہ میں ان کو وہ سازگار ماحول ملا جہاں وہ اپنی مکہ کی دعوت کو عملی شکل دے سکیں اور جو بھی تصویر ہم رسول اللہ کی کھینچیں وہ نامکمل رہے گی۔ اگر ہم ان کی شخصیت کے جادو کو نظر انداز کر دیں۔ یہ ان کی شخصیت ہی کی قوت تھی کہ انھوں نے (حضرت) ابوبکرؓ اور (حضرت) عمرؓ کو اپنی طرف کھینچا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ان کو اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے، قرآن حکیم تو تفسیروں اور تشریحوں کے ذریعہ امت کے

سامنے پیش ہوا ہے اور تعبیر و توجیہ کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ لیکن یہ رسول اللہ کا ہی اسوہ ہے جو راہبر اور راہنما کی حیثیت سے ان کے نام لیواؤں کے سامنے آیا ہے، جب کبھی بھی اجنبی اثرات کا غلبہ مسلمانوں کے لئے ایک خطرہ بنا تو سنت کی تجدید ان کا نعرہ بنی اور اب بھی مسلمانوں کے تقویٰ اور زہد میں ہم اس تجربۂ الٰہی کی جھلک دیکھتے ہیں، جس نے تیرہ سو (چودہ سو برس) برس پہلے عرب کے دور دراز صحراء میں محمد بن عبداللہ کو مجبور کیا کہ وہ دنیا کے سامنے آئے اور خدا اور اس کے فیصلہ کا پیام دنیا کو سنائے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستشرقین کی جماعت ایسی جماعت نہیں ہے، جس کے تمام افراد پر ہم یکسانیت کے ساتھ کوئی حکم لگا سکیں۔ خوشی کی بات ہے کہ مغرب کے عالموں کو بھی یہ احساس ہو گیا ہے کہ کسی دین پر مذہبی شعور سے بیگانہ ہو کر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

بحث وتحقیق میں مستشرقین
کی
بے راہ روی اور تضاد بیانی

ترجمہ

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ بحث وتحقیق میں علمی نہج وطریقہ اختیار کرنے سے یکساں نتائج برآمد ہوتے ہیں، ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ بحث وتحقیق کرنے والے اپنے مطالعہ وتحقیق میں مثبت ومنفی، مدح وقدح اور حق وباطل دونوں ہی رخوں اور پہلوؤں کو اختیار کرلیں، مگر اس کے برخلاف مستشرقین کی بحث وتحقیق میں عموماً شدید اختلاف وتعارض بلکہ کبھی کبھی تو سخت تناقض بھی ہوتا ہے۔

اگر واقعۃً ان کی تحقیقات علمی اور معروضی اصول ونہج پر مبنی ہوتیں تو ہرگز یہ اختلاف وتعارض نہ ہوتا، بعض مسلمان مصنفین نے اس تضاد وتعارض کی نشاندہی کرکے بتایا ہے کہ یہ محض مستشرقین کی جہالت وحیرانی ہی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ اس کی تہہ میں ان کے یہ اغراض بھی کارفرما ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں اور خاص طور پر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو جاہل ثابت کرنا اور ان کی تردید کرنا چاہتے ہیں۔

مستشرقین کا یہ تعارض وتضاد کبھی تو خود اپنی ہی تحقیق کے خلاف ہوتا ہے جیسے وہ کبھی ایک موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کوئی چیز ثابت کرتے ہیں، مگر دوسری جگہ اس کی نفی وتردید کردیتے ہیں یا کسی مبحث کے سلسلہ میں ایک موقع پر جو رائے ظاہر کرتے ہیں، اسی بحث میں دوسرے موقع پر اس سے مختلف کوئی اور خیال پیش کردیتے ہیں مثلاً کبھی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت (ناخواندہ ہونا) ثابت کرتے ہیں اور کبھی اس کی نفی وتردید کردیتے ہیں، کبھی یہ تسلیم

کرتے ہیں کہ قرآن مجید وحی الٰہی ہے، پھر خود ہی اپنے اس خیال کو منہدم کر کے کہتے ہیں، کہ وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن و دماغ کی اختراع ہے۔

مستشرقین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی کی دو نوعیتیں ہیں (۱) خود اپنی ہی رائے و تحقیق سے انحراف و اختلاف (۲) دوسرے مستشرقین سے ان کا اختلاف۔

پہلی نوعیت اس میں شبہ نہیں کہ ایک انصاف پسند محقق کے سامنے کبھی کبھی مختلف نقطہ ہائے نظر ہوتے ہیں، ایسی صورت میں وہ علمی و منطقی اصولِ ترجیح سے کام لے کر کسی ایک نقطہ نظر کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے، علمائے محققین کسی خاص روایت و حدیث یا ثبوت و سند کی بنا پر پہلے کوئی رائے قائم کرتے ہیں، مگر جب اس سے زیادہ قوی اور مرجح کوئی صورت ان کے سامنے آجاتی ہے تو وہ پہلی رائے کو ترک کر دیتے ہیں، اجتہادی امور و مسائل میں یہ طریقہ ہمارے علما کے یہاں بہت معروف ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض بعض علما سے ایک ہی مسئلہ میں متعدد آرا و اقوال منقول ہوتے ہیں اور ہر ہر قول کی کوئی نہ کوئی دلیل و حجت ضرور ہوتی ہے، مگر آخر میں وہ زیادہ صحیح اور مرجح قول کو اختیار کر لیتے ہیں، اس کے مقابلہ میں مستشرقین کے یہاں جو تعارض اور تضاد پایا جاتا ہے، اسے نہ بحث و تحقیق سے کوئی واسطہ ہوتا ہے اور نہ معروضیت و معقولیت سے کوئی تعلق، یہ سب کے سب یا اکثر اپنی پچھلی غلطیوں اور اوہام سے رجوع کرنے کے باوجود ان کی تلافی پر قادر نہیں ہوتے۔

جرمن مستشرق نولدیکی کو مسلمان محققین اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے دشمنوں میں شمار کرتے ہیں چنانچہ اس کی کتاب تاریخ القرآن میں قرآن مجید اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر رکیک حملے کئے گئے ہیں، یہ دوسرے مستشرقین کا قابل اعتماد ماخذ ہے، حالانکہ یہ کتاب اس نے جوانی میں لکھی تھی، اس میں جن غلطیوں کا وہ مرتکب ہوا ہے ان کے بارہ میں معذرت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> "شباب کی بے پروائی اور غلطی کے اثرات اسی وقت محو ہو سکتے ہیں جب گذشتہ تحریر پر مکمل نظر ثانی کی جائے یا نئے سرے سے ایسی کتابیں لکھی جائیں جو پرانی کتاب کے اثرات زائل کر دیں، کیونکہ پہلے جن مسائل کو میں صحیح سمجھتا تھا، بعد کی تحقیق سے وہ غیر صحیح ثابت ہوئے۔" (۱)

سیرت نبویؐ کے علاوہ دوسرے موضوعات و مباحثِ قرآن، حدیث اور عقائد وغیرہ میں بھی مستشرقین کے یہاں اس قدر تعارض اور تناقض ہے، جو حد شمار سے باہر ہے، اس کی دو مثالیں

(۱) بحوالہ مجلۃ المجمع العلمی العربی، دمشق، جلد ۲۱، ص ۲۵۲

ملاحظہ ہوں گولڈ زیہر کی کتاب مذاہب التفسیر الاسلامی کے صفحات ۱۲۔۳۰۔۳۱۔۳۲۔۴۷۔۴۸۔ ۵۹ اور ۹۶ پر خاص طور سے اس کی تحقیقی بے راہ روی نظر آتی ہے، اس کتاب کے مترجم ڈاکٹر عبدالحلیم نجار نے اس کی نشاندہی کی ہے اور ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی نے کتاب السنۃ ومکانتھا میں مستشرقین کے ساتھ ان عرب علما و محققین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی کو بھی نمایاں کیا ہے، جو مستشرقین ہی کا انداز اور طریقہ بحث اختیار کیے ہوئے ہیں۔

خاص سیرت نبویؐ کے موضوع پر مارگولیتھ نے ایک کتاب لکھی ہے اس میں اس نے نہایت نادر و نامانوس اور عجیب و غریب باتیں بھی لکھی ہیں اور یہ کذب و باطل کا مجموعہ بھی ہے، اس کا ایک نہایت مضحکہ خیز خیال یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مصر کا سفر کیا تھا، کیونکہ اس کے بارہ میں آپؐ نے جو کچھ بیان دیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ کو مصر کے بارہ میں مکمل واقفیت تھی۔

مگر یہی مصنف دوسرے مواقع پر تحریر کرتا ہے کہ آپ نے محض ملک شام کا سفر اپنے چچا کے ساتھ اپنی بیوی کا مال تجارت لے کر کیا تھا۔

فاضل مستشرق نولدیکی اس کی تردید میں لکھتے ہیں کہ "محمدؐ" کو یہ معلوم نہ تھا کہ مصر میں بارش بہت کم ہوتی ہے، اگر انھوں نے وہاں کا واقعی سفر کیا ہوتا تو وہ اس بات کو ضرور جانتے کیونکہ یہ عام بات تو کسی بھی واقفیت رکھنے والے سے مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔ (۱)

یہی مارگولیتھ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام و نسب کے بارہ میں بھی شک وشبہ ظاہر کرتے ہیں اور ایک جگہ تو اسے ایک تاریخی معمار قرار دیتے ہیں اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ آپ علیؓ بن ابی طالب کے چچا کے لڑکے تھے۔

رینان کی رائے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تعصب و عناد پر مبنی ہے، یہ ایک موقع پر آپؐ کو دھوکہ، فریب اور مکر وغیرہ کا حامل قرار دیتے ہیں اور دوسرے موقع پر آپؐ کی سچائی اور مصالحت کا اعتراف کرتے ہیں، ان کی اسی تضاد بیانی کی وجہ سے ایک بڑے محقق بیکافیہ نے ان کے بارہ میں کہا ہے کہ "یہ شخص واقعات و مسائل کو توڑ مروڑ کران کی ہیئت اور صورت ہی کو الٹ پلٹ دیتا ہے، کیونکہ صلیبی جنگوں کی وجہ سے اس کے اندر خاص کد و عداوت رچ بس گئی تھی۔"

دوسرے مورخین کا بیان ہے کہ فرانسیسی استشراق اور مستشرقین کو بگاڑنے میں اس کی اسی قسم کی رایوں کا دخل ہے (۲)، گستاف لوبون نے بھی رینان کے خطبوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی

(۱) اسلام اور یورپ ص ۹۲ (۲) اسلام اور عربی ثقافت ص ۱۲۶

تردید کی ہے اور اس کے تناقض کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ ایک طرف وہ عربوں کے عجز و درماندگی کو ثابت کرنا چاہتا ہے اور دوسری طرف اس کے قریب ہی جو کچھ لکھتا ہے اس سے اس کی تردید ہوتی ہے، کبھی وہ عرب مورخین پر ایک الزام عائد کرتا ہے اور کبھی اس کی تردید کرتا ہے، مثلاً وہ عرب مورخین پر الزام عائد کرتا ہے کہ وہ تصنیف و تالیف، نقد و بحث اور تجزیہ و تحلیل میں عاجز و قاصر ہوتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ وہ کتب سیر کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ان کی دقت و صحت کا اعتراف بھی کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ سیرت نبویؐ کی عربی تصنیفات جیسے سیرت ابن ہشام کا پایہ تاریخی حیثیت سے انجیل سے بڑھ کر ہے۔

رباط یونیورسٹی کے استاذ فلسفہ ڈاکٹر حکمت ہاشم نے رینان کے آراء کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لے کر ان کی تردید کی ہے۔

کولونیل باڈلے نے محمدؐ کی لائف پر کتاب الرسول تصنیف کی ہے، دوسرے مشرقی موضوعات پر بھی اس کی کتابیں ہیں، سیرت پر اپنی کتاب کا یہ نام اس نے اس لئے رکھا ہے کہ ہر اذان میں آپؐ کو اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس سے کسی کو دھوکہ نہ ہو کہ وہ بھی اسلام پر اسی طرح ایمان رکھتا ہے، جس طرح مسلمان رکھتے ہیں، کیونکہ اس کی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمام مذاہب کو یکساں سمجھتا ہے، اور یہ خیال کرتا ہے کہ اذان اور دوسرے شعائر و مراسم ہی ایک دین سے دوسرے دین کے اختلاف کا باعث ہیں، البتہ وہ رسول اللہ کی فضیلت و عظمت کا معترف ہے، اور اسلام اور دوسرے مذاہب کے ان منکرین کی تردید میں نیک نیت بھی ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقد ہیں۔

عقاد نے اس کتاب کی فکری گمراہی، بے راہ روی اور تضاد بیانی وغیرہ کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، حالانکہ اس کی چوتھی فصل میں وحی کے متعلق نہایت گمراہ کن اور اس قدر متضاد باتیں لکھی گئی ہیں، جن کی ابتدا و انتہا کا پتہ نہیں، اس میں آپؐ کے عقیدہ کے متعلق یہ شک و اعتراض عائد کیا ہے کہ بعثت سے پہلے آپ کی بیوی اور خود آپؐ بھی بت پرست تھے اور اللہ کے ساتھ اس کے شرکا کی پرستش کرتے تھے، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ آپ نے نسطوری راہب اور دوسرے لوگوں کا اثر قبول کیا تھا، اور آپؐ پر ایک اعصابی کیفیت طاری ہوتی تھی جو آپؐ کے افکار پر اثر انداز ہوتی تھی مگر اس کے بعد وہ اس کی تردید بھی کرتا ہے کہ یہ مرگی اور اعصابی بیماری نہ تھی۔

وحی کے معاملہ میں اس نے اس تناقض و تردد کا اظہار کیا ہے کہ وہ مرگی یا ملیریا کا نتیجہ ہو یا

روحانی سفر کا فیض ہو، وحی کی کیفیت سے لے کر سورہ علق کی ابتدائی آیات کے نزول تک جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی اسی قسم کا تردد و تذبذب پایا جاتا ہے، آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، یا امی اور ناخواندہ تھے اس کی بحث میں بھی تردد، اشتباہ اور تعارض پایا جاتا ہے۔

دوسری قسم اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں معاند مستشرقین ہوں یا نرم پسند اور معتدل مستشرقین دونوں گروہوں کی اکثر تحقیقات شکوک و شبہات اور کذب و افترا پر مشتمل ہوتی ہیں، باقی جو تحقیقات معقولیت و انصاف پسندی پر مبنی ہوتی ہیں، ان میں بھی کجی، بے راہ روی اور تعارض نمایاں ہوتا ہے۔

مستشرقین نے جن موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے وہ مستحکم اختلافات اور قوی اعتراضات کا باعث بنے ہوئے ہیں، مختلف پہلوؤں سے مثبت اور علمی اسلوب و نہج پر جن مسائل کی باقاعدہ تحقیق و تنقیح ہو چکی ہے، انھیں بھی غرض پسند مستشرق اپنی کجی اور گمراہی سے ڈھا دینا چاہتے ہیں۔

ان کی ایک جماعت ضعیف بنیادوں پر کسی گندم رائے یا مطعون قول پر متفق ہو جاتی ہے اور اسے صحیح باور کر کے تعلیم یافتہ لوگوں میں اس کی نشر و اشاعت کرتی ہے، لیکن اصلی عربی ماخذ پر مبنی دوسری تحقیق اس کو دلیل و برہان سے غلط ثابت کر دیتی ہے۔

دراصل اختلاف رائے اور چیز ہے اور تحقیقی کجی، گمراہی اور بے راہ روی اور چیز ہے، اختلاف رائے کی صورت میں اس کا امکان ہوتا ہے کہ بحث و تحقیق کرنے والا کسی مرجح رائے یا یقینی نتیجہ تک پہنچ جائے اور شک و تردد کے بندھن سے آزاد ہو کر خود اپنے تئیں صحیح فکر اور متوقع نتیجہ کی تلاش و تفتیش کر لے۔ لیکن تحقیقی گمراہی اور بے راہ روی میں نہ کوئی دلیل و سند ہوتی ہے اور نہ اس سے فہم سلیم کا پتہ چلتا ہے جو کسی طالب حقیقت انسان کے اندر ہوتی ہے، تعارض کی اصل و بنیاد ہو تو اس میں تطبیق کی گنجائش ہوتی ہے مثلاً یہ ممکن ہے کہ بعض محدثین کسی وجہ سے ایک روایت کو ضعیف قرار دیتے ہوں اور دوسرے اسے صحیح مانتے ہوں کیونکہ ان کے نزدیک دلائل سے اس کا ضعیف ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ دونوں گروہوں کے نزدیک نقد کے کچھ اصول اور قاعدے ہیں، ایسی صورت میں ظاہری تعارض کے رفع ہو جانے کا امکان ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسراء و معراج روحانی ہوئی تھی، مگر دوسرے محققین کا استنباط یہ ہے کہ معراج روحانی کے ساتھ جسمانی بھی تھی ثبوت میں دونوں نصوص و دلائل پیش کرتے ہیں ایسے

موقع پر غالب گمان یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تعارض رفع ہو جائے۔

رہی تحقیقی بے راہ روی اور تضاد بیانی تو اس میں علمی ذمہ داری اور دیانتدارانہ بحث و تحقیق نہیں ہوتی اس لئے جدال و خصومت کی نوبت آجاتی ہے، جس کا نتیجہ کینہ و کدورت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، اس میں نہ کوئی ممتاز حجت و دلیل ہوتی ہے جو دوسری حجت و دلیل پر غالب آجائے اور نہ روشن فکری موقف ہوتا ہے، جو دوسرے دقیق اور مبہم موقف کو واضح کردے، بلکہ پراگندہ رائیں اور متضاد و مختلف اقوال ہوتے ہیں جو کسی حقیقت پر مبنی نہیں ہوتے۔

یہاں پہنچ کر بحث و تحقیق کرنے والے کے ذہن میں اس طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں، کہ آخر دلیل کیا ہے؟ اس رائے کی علمی قدر و قیمت کیا ہے اور اختلاف و نزاع کے موقع پر تطبیق کی کیا صورت ہوگی اور اس کی قریب و بعید، مقصود و غیر مقصود، مدلولات کیا ہیں؟ مگر مستشرقین کے تعارض، تضاد اور بے راہ روی کے دائرہ میں یہ سب باتیں نہیں ہوتیں۔

یہاں ہم نے ایک پہلو کی وضاحت کی ہے، اس سے اختلاف رائے اور تحقیقی بے راہ روی و تضاد بیانی نیز معروضی و علمی مناقشہ اور جدال و تعصب پر مبنی مناقشہ کے فرق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مزید تفصیل کا موقع نہیں ہے اس لئے اب مستشرقین کے باہمی تضاد اور بے راہ روی کی بعض صورتیں بیان کی جاتی ہیں۔

اسلامی تاریخ کے بارہ میں بے راہ روی ایک مستشرق بکر اسلامی تاریخ اور اس کے مولفین کی نسبت لکھتا ہے کہ اسلامی فتوحات کے بارہ میں عربوں کی کتابیں جھوٹ کا انبار اور غلطیوں سے پُر ہیں، تاریخ کے مسائل اور واقعات کے زمانے کی ترتیب میں وہ خاص طور پر غلط بیانی سے کام لیتے ہیں دوسرے مستشرقین جیبن نے بھی یہ کہہ کر اس کی تائید کی ہے کہ تاریخ میں مہارت و کمال کا ایشیائی قوموں میں فقدان ہے کیونکہ وہ نقد و فلسفہ کے اصول و قوانین سے ناواقف ہیں۔

تعصب، عداوت اور کینہ سے بھرے ہوئے ان جانبدارانہ اقوال کے مقابلہ میں سیدیللو اور براون کہتے ہیں کہ عربوں سے عمدہ اور بہتر تاریخ آج تک غیر عربوں نے نہیں لکھی، (۱) نللینو نے بھی تاریخ نگاری میں عربوں کی دقت نظر اور باریک بینی کی شہادت دی ہے وہ لکھتا ہے کہ انھوں نے تاریخ کے مختلف اصول اور طریقے وضع کئے ان کا ایک طریقہ تو یہی ہے کہ وہ سال بسال سنین کا ذکر کرتے ہیں، دوسرے بقدر استطاعت سیاق کے اعتبار سے حوادث و واقعات کی روایت کی

(۱) بحوالہ مجلۃ المجمع العلمی العربی، دمشق، ج ۱۱ ص ۲۶۸ ۱۹۳۱ء

جانب اعتناء کرتے ہیں۔(۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے عوامل، آپ کی نفسیات، بعثت سے قبل کے میلانات اور علالت و وفات کے اسباب کے بارہ میں بھی اسی قسم کی بے سروپا باتیں کہی گئی ہیں، جنھیں ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے تفصیل سے قلمبند کیا ہے، (۲) ہم دو ہی باتوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

بعثت سے قبل کے میلانات ڈوزی کا بیان ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مزاج سوداوی تھا۔ آپ برابر خاموش رہتے تھے، تنہا طویل سیر و سیاحت سے آپ کو رغبت تھی، مکہ کی وحشتناک گھاٹیوں کے اندر غور و فکر میں غرق رہتے تھے، (۳) پادری لامانس نے تمام حقائق کو بالائے طاق رکھ دیا ہے، وہ اس کی تردید میں لکھتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلوت گزیں اور معتکف ہونے کا کوئی ثبوت ہی نہیں ملتا۔ (۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری اور موت کے اسباب لامانس نے اپنی اسلام دشمنی کے جذبات کو تسکین دینے کے لئے جو کچھ لکھا ہے اسے معقولیت، حقیقت اور تاریخ سے کوئی تعلق نہیں، وہ کہتا ہے "محمد کی شہوانیت حد سے بڑھی ہوئی تھی، ان کا جسم مرغوب اور لذیذ غذاؤں کی وجہ سے موٹا ہو گیا تھا، اعضاء بے حس و حرکت ہو گئے تھے، اور سکتہ کی بیماری کی وجہ سے آپ خوفناک اور ڈراونے معلوم ہوتے تھے۔"

اس کے بالکل ہی برخلاف دوسرا مستشرق بینیہ سفلہ لکھتا ہے کہ بعض دفعہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جسم پر بھوک کی وجہ سے شدید ضعف کے اثرات نمایاں رہتے تھے، لگاتار دو روز تک ہذیانی بخار میں مبتلا رہنے کی وجہ سے آپ کی وفات ہوئی۔

تیسرے مستشرق کلیمان ہیار نے ان دونوں کی تردید کی ہے، ان کا بیان ہے کہ محمدؐ کے پھیپھڑے میں سوزش اور جلن کے عوارض ظاہر ہوئے، اس بنا پر آپؐ کے قوی نہایت تیزی سے کمزور ہو گئے، (۵) پادری باردو کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک یہودی عورت نے زہر کھلا دیا تھا، اس کی وجہ سے آپ کی وفات ہوگئی۔ (۶)

ڈاکٹر عبدالحلیم ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "اوپر جو کچھ گذرا ہے اسے ملاحظہ

(۱) اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۴۳ (۲) یورپ اور اسلام ص ۸۸ تا ۹۳ (۳) اندلس کے مسلمان ص ۱ تا ۱۸ (۴) ملاحظہ ہو اس کی کتاب "کیا محمد سچے تھے" ص ۱ (۵) ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب تاریخ العرب، ج ۱، ص ۱۸۱ (۶) علامات محمد ماھی و ما قیمتھا، ص ۱۷۱

کرنے کے بعد کیا ہم مستشرقین کے آراء پر اعتماد کر سکتے ہیں، حالانکہ ہم نے ان کے بے شمار اختلافات میں سے نہایت تھوڑے سے اختلافات ہی بیان کیے ہیں، ان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خود ایک مستشرق ہی دوسرے مستشرق کی بنیاد ڈھا دیتا اور اس کے خیالات کی تردید کرتا ہے۔

سیرت نبویؐ سے متعلق بعض مسائل میں مستشرقین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی

لفظ محمد اور محمدیت کے مختلف معانی بیان کیے گئے ہیں، بوڈلے کہتا ہے "لفظ محمد (Nammet) اصنام کے معنی میں مستعمل ہے اور اسی سے کلمہ (Mahomerie) مشتق ہے اور کلمہ (Mumerv) مصدر کے طور پر مجنون کے لئے اور بتوں کی پرستش کے لئے محمدیت (Mametry) آتا ہے، (۱) جون سلڈن نے اس بیان پر نقد و تعقب کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ اس تعریف و تشریح کے نتیجہ میں محمد اور محمدیت مبغوض اور ناپسندیدہ نام ہو گئے ہیں جب کہ ساری دنیا جانتی ہے کہ ترک یعنی مسلمانوں کے دین میں بتوں کی پرستش حرام ہے، بوڈلے نے محمدیت کی جو تعریف کی ہے اس کی تردید کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے اتباع نے اپنے قائد کا مکمل احترام و توقیر کرنے کے باوجود کبھی محمدی یا محمدیت کی اصطلاح استعمال نہیں کی ہے بلکہ وہ اس نام سے ہمیشہ احتراز کرتے رہے ہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جس دین کی اساس و بنیاد رکھی اس کو اختیار کرنے والوں کی تعبیر ہمیشہ لفظ مسلم سے کی جاتی ہے، جس کے معنی اپنے آپ کو مشیت الٰہی کے حوالہ کرنے والے کے ہیں، پھر وہ آپ کے زہد کا تذکرہ کرتا ہے اور آپ کے دوسرے بشری اوصاف و کمالات نیز آپ کی قائدانہ اور پیغمبرانہ خصوصیات کو گناتا ہے اور آخر میں آپ کی زندگی میں ہونے والی آپ کی کامیابی کو بیان کر کے کہتا ہے کہ یہ غیر ذمہ دارانہ بیانات آپ کی شان سے کس قدر بعید ہیں۔

(۱) علامات محمد ص ۱۷۱

مستشرقین کے اعتراضات کی نشر واشاعت کس طرح ہوتی ہے

اور

ان کی نوعیت، اغراض اور خاص محور

ترجمہ

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

مستشرقین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنے اعتراضات میں ملمع کاری کر کے انھیں بہت دلفریب اور خوشنما بنا دیا ہے، اور دنیائے اسلام کے افکار وعقائد اور نظام تعلیم و تربیت پر اثر انداز ہونے کے لئے عربی زبان میں ان کے ترجمے بھی کئے ہیں۔ جو اسلامی مکتبوں (بک ڈپو) میں فروخت ہو رہے ہیں۔ بعض ممتاز اہل عرب اور مسلمان بھی ان کے خوشہ چیں ہیں، اور وہ ان سے استفادہ کے لئے مغربی ملکوں کا سفر کرتے ہیں۔ اور انھیں بھی اسلامی ملکوں میں آنے کی دعوت دیتے ہیں، اس قسم کے لوگ دراصل اسلامی افکار کی بنیادیں متزلزل کرنے میں مستشرقین کے شریک ومعاون ہوتے ہیں۔

دنیا کی موجودہ اقتصادی پالیسی اور حکومتوں کا وفاق بھی مستشرقین کے شکوک وشبہات کو پروان چڑھا رہا ہے، چنانچہ ان کے افکار ونظریات کی اشاعت کے لئے کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے۔ پہلے ان کے خیالات مقامی زبانوں میں شائع ہوتے ہیں، پھر عربی اور دوسری زبانوں میں ان کے ترجمے ہوتے ہیں۔

مستشرقین کے طعن وتشنیع اور افترا پردازی سے اسلام، اسلامی تہذیب اور بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کا کوئی گوشہ محفوظ نہیں ہے۔ وہ مکمل تیاری اور منظم منصوبے کے بعد جب اسلام کے خلاف بہتان تراشی کر کے شبہات وارد کرتے ہیں تو ان کی حوصلہ

افزائی کے لئے عیسائی مبلغین اور استعمار پسند طاقتیں ان کو دنیا بھر میں پھیلانے اور عام کرنے کی اسکیمیں تیار کرتی ہیں اور کانفرنسیں منعقد کرتی ہیں۔ اسلام کو ہدف طعن بنانے والے بعض مستشرقین سرکاری عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ اس طرح انھیں مادی استعمار کی تعمیر واستحکام اور اسلامی افکار کو مغربی سانچہ میں ڈھالنے کا زیادہ موقع ملتا ہے، ان دونوں چیزوں کی تکمیل کے لئے وہ عربوں اور مسلمانوں میں سے اپنے ان معاونین کا انتخاب کرتے ہیں جو فکری اور علمی حیثیت سے ممتاز ہوتے ہیں، اور جو ان کے مادی وفکری موقف کو درست ثابت کرتے ہیں۔ یہ صورتِ حال انڈونیشیا میں ہالینڈ کے غلبہ، عربی ملکوں میں برطانوی اور فرانسیسی استعمار اور خصوصاً مصر پر نپولین اور الجزائر و مغرب پر فرانس کے حملہ کے زمانہ میں پیش آچکی ہے، مستشرقین کے اعتراضات والزامات کے نشوونما پانے اور ان کے نشر واشاعت کے خاص اسباب وذرائع یہ ہیں۔

(الف) گرجا اور عیسائی مشنریاں مونسیور کولی نے ''دین حق کی بحث وتحقیق'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، اس میں اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر بالکل مسخ کر کے پیش کی گئی ہے، مصنف نے عصبیت اور صریح جانبداری سے کام لے کر اسباب بیان کئے بغیر جارحانہ اور تحکمانہ انداز میں اعتراضات عائد کئے ہیں، وہ لکھتا ہے ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اخلاق و شرافت کو خیر باد کہہ کر اپنے پیروؤں کے ہاتھ میں تلوار رکھی، بدکاری اور لوٹ مار کی ان کو کھلی چھوٹ دی، اور جنگ میں ہلاک ہونے والوں کو اس کی بشارت سنائی کہ انھیں دائمی لذت وراحت نصیب ہوگی۔'' ایسی صریح کذب بیانی اور یاوہ گوئی کے بعد مستشرقین صحیح دینی وتاریخی حقائق سے کس طرح واقف ہوسکتے ہیں۔

اڈیسون نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دو بہتان تراشے ہیں۔ اول یہ کہ آپؐ انجیل سے واقف تھے، اور اسی سے اخذ واستفادہ کرتے تھے، دوم یہ کہ آپ کی انجیل سے واقفیت ناقص تھی اور آپ نصرانیت کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے۔ مگر اسی ناواقفیت اور نصرانیت کی بگڑی ہوئی صورت پر آپؐ نے اپنے اس دین کی بنیاد رکھی جسے عربوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ عیسائی مبلغین نے یہ اور اسی قسم کے دوسرے غلط اور بیجا الزامات مستشرقین کے ذہنوں میں نقش کردئے ہیں جس کے نتیجہ میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ پر ایسے رکیک اور ناروا اعتراضات کئے ہیں جن سے ان کی سیرتیں اور شخصیتیں بالکل مسخ ہوگئی ہیں۔

عیسائی مشنریوں کے منصوبے بہت منظم، وسیع اور گوناگوں ہیں۔ وہ مشرق میں ان کی

اشاعت کے لئے مبلغین بھیجتی ہیں۔ امریکہ نے اس میدان میں سبقت کی اور بیروت، قاہرہ، استنبول اور دمشق وغیرہ میں اپنے قدم جمائے یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور اسی انداز پر اب تک مغربی افکار و اعمال کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ ہاملٹن گب اور چار مستشرقین کے مباحثہ میں اس کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور ۱۹۳۰ء میں شائع ہونے والی کتاب ''اسلام کا نظریہ'' میں بھی اس کا ذکر ہے۔

(ب) مادی استعمار مستشرقین کی فکری و اعتقادی کاوشوں پر استعمار پسند پورا اعتماد اور بھروسہ کرتے ہیں، اور ان میں مزید ایسے شکوک و اعتراضات کا اضافہ کرتے ہیں جن کا اسلام اور ذاتِ نبویؐ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ان کو اطمینان ہے کہ مسیحیت مشرق میں مغربی استعمار کی بنیاد ہوگی۔ اسی بنا پر وہ مشنریوں کے مشن کو ہموار اور وسیع کرنے کے لئے ان کی ہر ممکن امداد و اعانت کرتے ہیں، ان کے لئے مال و اسباب مہیا کرتے ہیں اور انھیں اقتدار و اختیار بھی عطا کرتے ہیں دراصل شروع میں مستشرقین عیسائی مبلغین اور راہبوں کے کندھوں پر سوار ہوتے ہیں، پھر وہ استعماریت سے اپنا تعلق قائم کرتے ہیں۔ اس طرح نتیجہ کے اعتبار سے مستشرقین کی تگ و دو کا مقصد بھی فکری استعمار ہے۔ وہ اسے مستحکم کرنے کے لئے دو طریقے اختیار کرتے ہیں۔ (۱) اسلام کی تاریخی اور عظیم الشان شخصیتوں کو مجروح اور کمتر قرار دیتے ہیں، جن میں سرفہرست خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے اور (۲) اس کے مقابلہ میں استعمار پسندوں کی شخصیتوں کو اہم اور برگزیدہ ثابت کرتے ہیں، اسی لئے استعماریت کے دور میں عالم عرب اور دنیائے اسلام کو استعمار پسندوں کے حالات اور کارناموں سے جس قدر روشناس ہوئی اس قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کی زندگی، سیرت اور کارناموں سے نہیں ہوئی۔ جو لوگ استعمار پسندی کے اس دور کو دیکھ چکے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مستشرقین اپنے ان دونوں مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے یا تو کلیسا کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں یا پھر استعمار اور توسیع پسندوں کے اشتراک سے ریشہ دوانیاں کرتے ہیں، ان کو حق کی تلاش و جستجو سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ شبہات وارد کرنے اور پروپیگنڈہ کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، اور عیسائی مشنریوں اور مشرق میں ان کے نمائندہ مبلغین کے لئے ساز و سامان مہیا کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے علوم، افکار، عقائد، اشخاص اور زبان و تہذیب کی اچھی طرح مذمت اور تنقیص کی جا سکے۔

(ج) تجارتی کمپنیاں استعمار پسندوں نے عربوں اور مسلمانوں کے بیش قیمت علمی سرمایہ میں سے بہت کچھ چیزیں سرقہ کی ہیں، اس پر تجارتی اداروں اور کمپنیوں کا قبضہ ہے۔ اہل

عرب کو اپنے علوم و آداب کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ تھا، اس لئے انھیں نہایت سستے اور معمولی داموں پر اسے حاصل کر کے مستشرقین کی تحقیق و تحشیہ کے بعد شائع کیا گیا، اور اشاعت کے لئے ایسی چیزیں منتخب کی گئیں جو غیر اہم اور فکری حیثیت سے زیادہ بلند پایہ نہ تھیں، تاکہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی توجہ معمولی چیزوں کی طرف مرکوز ہو کر رہ جائے۔ پھر ان اداروں نے اسلامی تہذیب اور کلچر کی کتابوں کی تجارت اپنے لئے مخصوص کر لی جس کا منافع مستشرقین پر خرچ کیا جاتا تھا تا کہ وہ ترتیب و تحشیہ اور طباعت و اشاعت کا کام پوری دلچسپی اور سرگرمی سے انجام دے کر ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل کر سکیں۔

تجارتی کمپنیوں کے پیش نظر دو طرح کے اغراض تھے (۱) اسلام کو مغربی اور اسلامی دنیا میں مسخ کر کے پیش کرنا اور اس کی شخصیتوں کو مجروح اور داغدار بنانا، اپنی اس ناپاک مہم کو فروغ دینے کے لئے وہ مستشرقین کو اسلام کے خلاف طرح طرح کے شبہات و الزامات کی کرید کرنے پر آمادہ کرتی تھیں (۲) اسلامی علوم کی کتابوں کا حق طباعت اپنے لئے مخصوص کر کے ناجائز کمائی کرنا۔

(د) معاشی و شخصی

مستشرقین کو تقویت اس طرح بھی ملی کہ بعض لوگوں کے لئے رزق کے دوسرے وسائل و ذرائع مسدود ہو گئے تو انھوں نے ان کا ساتھ دینا شروع کیا، کچھ ایسے بھی ان کے ہم نوا ہوئے جنھوں نے محسوس کیا کہ ان کی فکری و عملی صلاحیت دوسرے فضلا اور ماہرین علوم کے برابر نہیں ہے، اسی طرح بعض حضرات مسیحی سوسائٹی میں اپنی براہ راست ذمہ داریوں سے آزاد ہونے کے لئے بھی ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے، غرض ان لوگوں کا مقصد اپنی کوتاہی اور فکری عجز و نقص پر پردہ ڈالنا اور حصول معاش تھا، کیوں کہ رزق و معیشت کے دوسرے وسائل و ذرائع کے مقابلہ میں یہ زیادہ آسان صورت تھی اور اس میں کم تگ و دو بھی کرنی پڑتی تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ جذبہ بھی ان بے شمار الزامات و شبہات کا سرچشمہ ہے، جو اسلام پر عموماً اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خصوصاً عائد کئے گئے ہیں، اوپر بیان کئے گئے اسباب کی جن اسلامی تصنیفات میں نشاندہی کی گئی ہے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

المستشرقون، المستشرقون والدراسات الاسلامیہ، التبشیر والاستعمار، دفاع عن الاسلام، یہ تمام کتابیں ان کتابوں کی تردید میں لکھی گئی ہیں جو مستشرقین کے شکوک و شبہات اور آراء و افکار پر مشتمل ہیں۔ جیسے وجهة الاسلام اور الغارة علی العالم الاسلامی، محب الدین خطیب نے اخبار المؤید میں ان کا عربی ترجمہ کیا تھا، ان

سے عیسائی مشنریوں اور استعمار پسندوں کے منصوبوں اور عزائم کا پتہ چلتا ہے۔

رہی بر تو کولات (پروٹوکول) صیہون (یہودی یادداشت) تو یہ ۱۸۰۵ء میں شائع ہوئی مگر اس کی شہرت گذشتہ صدی کے آخر میں ہوئی۔ محمد خلیفہ تونسی نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا، اس سے اخلاق وانسانیت کو رسوا و برباد کرنے، آسمانی عقائد کو ضعف واضمحلال سے ہمکنار کرنے اور نفرت وحسد کی آگ بھڑکانے میں یہودیوں کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے، اور دنیا پر غلبہ وتسلط حاصل کرنے کے ان کے ناپاک عزائم اور ارادے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے خلاف الزام اور شبہات عائد کرنے اور بغض وعداوت پھیلانے میں یہودی مستشرقین کی ریشہ دوانیاں زیادہ خطرناک ہیں، وہ اپنے مذہبی احکام کے مجموعہ تالمود کو خدا کی وحی سے بھی زیادہ مقدس اور برتر مانتے ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو تورات سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ دوسرے یہودی مستشرقین بھی اسی قسم کی بے سروپا باتیں کہتے ہیں۔ قرآن واحادیث نبوی کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسلامی عقائد واحکام کا استخفاف کرتے ہیں۔

(۵) علمی وتہذیبی بعض ذاتی وطبعی اسباب وذرائع سے بھی مستشرقین کے خیالات کی نشر واشاعت ہوئی، کیونکہ کچھ فارغ البال لوگ اس لئے مشرقی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں کہ ان کو سیر وسیاحت سے طبعی دلچسپی ہوتی ہے، اور وہ دنیا کی قدیم تاریخ وتہذیب سے واقف ہونے کا شوق رکھتے ہیں۔

اعتدال پسند گروہ کی مفید خدمات یہ تسلیم کرنا چاہئے اعتدال پسند مستشرقین کے ایک گروہ نے سیرت نبویؐ کے قدیم واولین ماخذ کی ترتیب واشاعت کا کام بھی انجام دیا ہے، اس سلسلہ میں ابن ہشام کی سیرت، واقدی کی کتاب المغازی، ابن اثیر کی الکامل اور طبری کی تاریخ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ مستشرقین نے ان پر حواشی وتعلیقات لکھ کر اور ان کی متعدد فہرستیں مرتب کر کے دوسروں کو مزید کاوش سے بے نیاز کر دیا ہے۔ انھوں نے اکثر کتابوں کے ملکی زبانوں میں ترجمے بھی کر دیے ہیں تاکہ بحث وتحقیق کرنے والوں کو ان سے مدد مل سکے اور وہ ان کی جانب رجوع کر سکیں۔

بہر حال اس گروہ نے تاریخی سرمایہ اور خاص طور پر سیرت نبویؐ سے متعلق کتابوں کی نشر واشاعت میں سعی بلیغ کی ہے اور محنت ودیدہ ریزی کے علاوہ اپنا خطیر سرمایہ بھی لگا دیا ہے۔ کئی کئی افراد مل کر ایک کتاب کو متعدد جلدوں میں مرتب کرتے ہیں، اکثر محققین علمائے اسلام ان

کی ان کاوشوں کے مداح اور شکر گذار ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر نجار نے مذاهب التفسیر الاسلامی اور شیخ احمد شاکر نے مفتاح کنوز السنة کے مقدموں میں اس کا اعتراف کیا ہے اور محمد کرد علی نے بھی ان کی کوششوں کے نتائج کو سراہا ہے۔

اس جماعت کی کاوشوں سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ جب سیرت نبویؐ کے اولین ماخذ مکمل صورت میں چھپے اور ان کے محققانہ نسخے دوسرے مستشرقین کے ہاتھوں میں پہنچے تو سیرت نبویؐ کا مطالعہ و تحقیق اچھے اور بہتر انداز میں کیا جانے لگا اور اس کے مفید نتائج بھی سامنے آئے۔

یہ گروہ ایسا ہے جو بحث و مطالعہ کا صحیح رخ متعین کر کے اصل تاریخی حقائق تک پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن عام اور بڑی جماعت کی عصبیت و جانبداری کا وہی حال ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مستشرقین کے اعتراضات و الزامات استعمار پسندوں اور عیسائی مشنریوں اور مبلغین کے مضبوط باہمی تعاون کے نتیجہ میں وجود میں آئے اور پروان چڑھے ہیں، ان کا مشترکہ پروگرام اور مقصد یہ ہے کہ عربی اور اسلامی تہذیب و تمدن، تاریخ اور خاص کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اور سیرت مبارکہ کو مغربی افکار کے سانچہ میں ڈھال لیا جائے۔

شکوک والزامات کی نوعیت

گو مستشرقین کے تمام شبہات و اعتراضات کی نوعیت متعین اور ایک ہے۔ تاہم آسانی کے لئے انھیں حسب ذیل صورتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

فکری

انھیں مندرجہ ذیل وجوہ سے فکری کہا جا سکتا ہے۔

(الف) یہ انسانی فکر و کاوش کا نتیجہ ہیں اور ان کی بنیاد ذہنی وسائل پر ہے۔

(ب) ان میں انسانی نفسیات کے خواص کی بحث و کرید اور ان کے طول و عرض کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ ان پر عائد ہونے والے اشکالات کا ازالہ کیا جائے۔

(ج) یہ اسلامی فکر کو متزلزل کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سیرت و شخصیت کو مسخ کرتے اور بگاڑتے ہیں جو منصب نبوت پر فائز اور قیادت و سیادت کے لحاظ سے بہترین نمونہ تھی۔

(د) رسولؐ کے بارہ میں عربی و غیر عربی افکار میں تردد اور شکوک پیدا کرتے اور ان کی جانب سے لوگوں کو متنفر اور بیزار کرتے ہیں۔

(ہ) ایک طرف حق کی تائید و حمایت کرنے والے جذبات و افکار کو مضمحل اور پست کرتے ہیں اور دوسری جانب ناپاک اور خود غرضی پر مبنی افکار کے ذریعہ شبہات کے دائرہ کو وسعت و قوت بخشتے ہیں۔

(و) اس اعتبار سے بھی ان کو فکری کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی اصل اور تمام تر بنیاد فکر پر ہے، اور اس فکر اور ذہنی مفہوم کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت و جہاد کے ذریعہ آبیاری کی ہے، اس بنا پر آپ کی ذات، شخصیت، سیرت اور سنت کے بارہ میں جو بھی طعن و تشنیع کیا جائے گا وہ اسلامی فکر ہی کے بارہ میں سمجھا جائے گا۔

دینی یہ شبہات ان حیثیتوں سے دینی دائرہ میں آتے ہیں۔

(الف) ان کا خاص تعلق احادیث نبویؐ سے ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل، تقریر وارشاد کا مجموعہ اور اسلام کا دوسرا اہم ماخذ و مصدر ہے۔

(ب) احادیث کے بارے میں یہ وہم اور غلط فہمی پیدا کرتے ہیں کہ ان میں بیان کئے گئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افکار واعمال آسمانی کتابوں یا انسانی سرچشموں سے ماخوذ و مستنبط ہیں۔

(ج) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ایسی غلط اور مادی تفسیر و تعبیر کرتے ہیں جس سے شجاعت، ذہانت، عبقریت اور آزادی فکر کو اس کی جانب منسوب کیا جا سکے مگر وہ وہبی وربانی کمالات سے تمام تر عاری ہو۔

(د) کبھی اسلام میں تضاد اور کبھی اس میں تطبیق دے کر لوگوں کے دلوں میں شک و تذبذب پیدا کرتے اور رسالت پر عقیدہ و ایمان کو متزلزل کرتے ہیں، جب کہ اسلام کا جیتا اور جاگتا نمونہ خود نبی اکرمؐ ہی کی زندگی اور ذات ہے۔

(ہ) وحی و نبوت پر مستشرقین کے طعن و تشنیع کا خاص سبب یہ ہے کہ یہ رسول کے اوصاف و کمالات میں سب سے نمایاں اور اہم وصف ہے، اگر اسی کو مشکوک اور مشتبہ کر دیا جائے تو دوسرے تمام اوصاف و کمالات خود بخود بے حقیقت ہو جائیں گے۔

(و) اعتراضات کا تعلق دین کے سب سے مہتم بالشان مسائل سے ہے، کیونکہ یہ آپ کے عقیدہ و فکر یا طرز زندگی اور جہاد وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں اور ان میں شبہ واقع ہونے کے بعد خود مسلمان بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔

تاریخی ان اعتراضات کی نوعیت تاریخی بھی ہے کیونکہ

(الف) یہ ان تاریخی واقعات سے پیوستہ ہیں جن کا تعلق اسلام سے قبل و بعد کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے ہے، بلکہ تاریخ کی ابتدا و انتہا سے بھی۔

(ب) یہ تاریخ کو اس کے اصلی موضوع سے ہٹا دیتے ہیں اور ان سے تاریخ کے علمی و واقعاتی

کے بجائے ذاتی رجحان ومطالعہ کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔

(ج) یہ الزامات چند مفروضوں اور تاریخی شکوک کے اردگرد گردش کرتے ہیں، حالانکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے وفات تک کی پوری زندگی نہایت واضح اور روشن ہے۔

(د) ان شبہات نے بعض تاریخی حقائق کو بھی افتراپردازی اور گمراہی میں مخلوط کر دیا ہے، اس بنا پر حقائق وغیر حقائق، تحلیل واعتراض اور تاریخ وافسانہ میں حد فاصل قائم کرنا اور امتیاز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے

(ہ) تاریخ کا مقصد اللہ کی جانب انسانیت کی رہنمائی ہے، جیسا کہ آرنلڈ ٹوئین نے اپنی مشہور کتاب ''نظریۂ تاریخ'' میں لکھا ہے، اس لئے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تاریخ مطعون کر دی جائے، تو رہنمائی کی کون سی راہ باز ہو سکتی ہے؟

(و) ول ڈیورانٹ نے ''تمدن کی کہانی'' میں لکھا ہے کہ ''تاریخ انسانی تمدن کے کمال وزوال اور جائزہ ومطالعہ کا نام ہے۔'' اس بنا پر اگر اسلامی تمدن ہی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار ہو گیا، اور اسے دفن کر دیا گیا تو تمدن کی اس سے بڑھ کر اور کیا تحقیر ہو گی۔

مستشرقین کے اعتراض والزام کی ایک نوعیت یہ بھی ہے کہ

(الف) مسلمانوں کی اعتقادی، فکری اور اخلاقی زندگی کو ڈھانے اور اکھاڑنے میں اس کا بڑا حصہ ہے، یہ ایسے بہادروں اور لیڈروں کی زندگی کو محبوب بنا کر ان کے سامنے پیش کرتا ہے، جن کے اصول وضوابط اور طور وطریق کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

(ب) یہ موجودہ دنیائے اسلام کا اس کے ماضی سے فکری، شعوری اور تاریخی رشتہ کاٹ کر اسے بہت حقیر وگھٹیا بنا کر پیش کرتا ہے، حالانکہ مستشرقین کو معلوم ہے کہ جدید اسلامی فکر اس اسلامی فکر کا ثمرہ اور نتیجہ ہے، جس کی بنیاد قرآن اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے رکھی ہے۔

(ج) یہ انسانی زندگی کے اس روحانی پہلو کو مسمار کر دیتا ہے، جس کا سب سے اعلیٰ اور مکمل نمونہ مسلمانوں کے رہنما اور پیغمبر کی زندگی میں تھا، اور اسے تاریخ کے خوبصورت فریم اور چوکھٹے میں منجمد کر دیتا ہے۔

(د) وہ جہاد اور احکام اسلامی کو ناقابل عمل اور مشکل بتاتا ہے، اس بنا پر فکری وعملی زندگی کی تجدید اور نشاۃ ثانیہ کا نعرہ بلند کر کے مسلمانوں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔

(ہ) وہ ایسے رہنماؤں اور قائدوں کو نمایاں اور ممتاز قرار دیتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے قائدانہ اوصاف اختیار کرنے کے بجائے فکری، اعتقادی اور اجتماعی حیثیت سے مغربی قائدین کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

(و) انور جندی نے ان گوناگوں خطرناک شبہات کی خصوصیات کی نشاندہی کی ہے، لکھتے ہیں کہ مغرب کا سب سے خطرناک ارادہ اور منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا دل و دماغ توحید، اخلاق، روحانیت اور ایمان سے عاری ہو کر اس تیز و تند ہوا کے سامنے آجائے جو تعلیم، صفحات، ادب، فلم اور لباس وغیرہ کے راستہ سے زہر بکھیر رہی ہے۔ ان چیزوں کے مسموم اثرات سے ایسی نسل تیار ہو رہی ہے، جو تخریب اور بربادی کی طرف اس کو ترقی و تمدن کا نام دے کر چلی جارہی ہے، اور اسلامی تاریخ و تہذیب اور اس کے اصول و مبادی کو مسخ کر کے مستشرقین و مبلغین کی پیروی کر رہی ہے اور ان ہی کی طرح اس دور کو حقیر اور کمتر خیال کر رہی ہے، جو تاریخ عالم کی نمایاں اور مفید خدمت انجام دے چکا ہے۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی اس کے ناقص اور فروتر ہونے کا احساس و شعور پیدا کر رہی ہے۔

اسلام پر الزام تراشی کے اغراض و مقاصد

عیسائی مشنریوں اور استعمار پسند کھل کر مسلمانوں پر اثر انداز اور حاوی ہونے کے درپے ہیں، اس کے لئے وہ کانفرنس اور اجتماعی، ادبی اور طبی اجلاس کرتے ہیں، لیکن مستشرقین کے اغراض و مقاصد علم و معرفت کے غلاف میں لپٹے ہوتے ہیں۔ صرف کبھی کبھی ان کی غرض و غایت نمایاں ہوتی ہے، ان کا نشانہ اسلام کے تمام احکام و مسائل اور اس کی شخصیتیں ہوتی ہیں۔ جن میں سرفہرست خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے۔ اسلام کے خلاف طعن و تشنیع اور افترا پردازی کے پیچھے جو جذبات و مقاصد کارفرما ہیں ان کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

ا۔ نصرانی قبائل اور اسلام کے درمیان حائل ہونا

اسلام کو مسخ کرنے اور اس کے محاسن پر پردہ ڈالنے سے ان کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کو باور کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں نظامِ حیات بننے کی صلاحیت نہیں۔ صلیبی جنگوں کے بعد ہی سے یہ بات دہرائی جارہی ہے، قرآن مجید کے ترجمے بھی یہی ثابت کرنے اور اس کے اندر نقص نکالنے کے لئے کئے گئے ہیں۔ اہل یورپ کے اندر عثمانیوں کے یورپ پر چھا جانے کے بعد اسلام کے خلاف کراہیت، نفرت اور ذہنی جنگ کی مستقل فضا پیدا کر دی گئی ہے اور اسلام کے نافذ العمل ہونے کے بارہ میں انھیں شکوک و شبہات میں ڈال دیا گیا ہے۔

۲۔ مسلم ممالک کو نوآبادیات بنانے کی سازش دوسری غرض یہ تھی کہ جہاد کی تاویل و توجیہہ کر کے مسلمانوں کو اس کی جانب سے غافل کر دیا جائے اور انھیں عافیت و آرام پسندی کا درس دیا جائے تا کہ اسلام کی قوت مقابلہ پاش پاش ہو جائے۔ اور جنگ و جہاد کی خوگر قوم کو عبادت و ریاضت میں مشغول کر کے یہ باور کرایا جائے کہ جہاد اکبر یہی ہے، اس سلسلہ میں مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا گیا اور اسلامی سلطنتوں کے حصے بخرے کر دیئے گئے، مسلمانوں کی سوسائٹی سے معاشرت و سیاست کے اسلامی قوانین معطل کر دیئے گئے اور مغرب کا مکمل تسلط قائم کرنے کے لئے اسلام کے قانونی، سیاسی اور تربیتی نظام میں خلل ڈال دیا گیا۔

۳۔ مسلمانوں کو ان کی اصل بنیادوں اور سرچشموں سے دور کر دینا اسلام کے اصول تبدیل کر کے مسلمانوں کو ان کے سرچشموں سے دور کر کے اور ان کی انفرادی، اجتماعی، نفسیاتی اور عقلی خصوصیات ختم کر کے انھیں استعماری فکر و تہذیب کے سامنے سرنگوں کر دیا گیا۔ اس طرح مسیحی تبلیغ و دعوت کو ان کے عقائد و نفوس میں پیوست کرنے کا دروازہ کھل گیا اور بہت سے کمزور عقیدہ کے لوگ الحاد میں مبتلا ہو گئے۔

۴۔ دنیائے اسلام کو کمزور اور پسماندہ بنانے کی اسکیم مستشرقین عالم عرب اور دنیائے اسلام کو پس ماندگی اور بدحالی سے ہمکنار کر کے اس پر اظہار ہمدردی کرتے ہیں اور پھر مسلمانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ ان کی پس ماندگی کا سبب اسلام کی پیروی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا ہے، اس مقصد کے لئے انھوں نے اسلام، اسلامی اصول و قوانین، اس کے تصور عبادت، نظام اور تاریخ کے بارہ میں بے شمار شبہات و الزامات گڑھے ہیں، استعمار پسندوں کا یہ دعوی بالکل کھوکھلا ہے کہ عربوں اور مسلمانوں کے تنزل و انحطاط کی وجہ اسلام ہے، علم و تاریخ کی میزان اور کسوٹی پر پرکھنے کے بعد اس کا کھوٹ بالکل واضح ہو جاتا ہے، اس لئے صحیح تو یہ ہے کہ بنیادی طور پر عربوں اور مسلمانوں کا انحطاط اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہے، اگر اسلام کے درست نظریے اور بنیادی اصول کو وہ اختیار کئے ہوتے تو اس مشکل میں نہ پھنستے۔

ایک طرف تو یہ حال ہے اور دوسری طرف اکثر اہل مغرب مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ اور فکری و مادی قوت کے دوبارہ عود کرنے سے خائف اور لرزہ براندام ہیں، انھیں اندیشہ ہے کہ اسلام اور اس کے امتیازی اصول و تشخصات مغربی دنیا کا استیصال کر دیں گے، اور مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ معمورۂ ارضی کے دور دراز گوشوں تک وسیع ہو جائے گا۔ لارنس براؤن کہتے ہیں ''مغربی

استعمار کے لئے اصلی خطرہ اسلام اور اسلامی نظام کے احیاء میں پوشیدہ ہے، کیونکہ اس کے اندر چھا جانے اور سب کو سرنگوں کر دینے کی صلاحیت موجود ہے۔'' انور جندی لکھتے ہیں'' یہ کہنا بجا ہے کہ اگر ہم اسلام کے اصول و مناہج کو مضبوطی سے اختیار کرلیں اپنی قدر و قیمت کو پہچان لیں اور اپنے امتیاز و تشخص کو برقرار رکھیں تو ہم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا، ہمارا وجود استعماری اور نو آبادیاتی دور میں اور اس کے بعد بھی صرف عمدہ فریم میں بند رہا اور موثر اور موزوں نہ بن سکا۔

۵۔ سنت نبوی کو عضو معطل کر دینا مستشرقین کی یہ کوشش بھی ہے اور وہ اسے لوگوں کی نظر میں صحیح ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و توجیہات اور آپ کی قیادت و رہنمائی دور جاہلیت کی برائیوں اور خرابیوں کی اصلاح کے لئے تو موزوں اور مناسب تھی۔ لیکن اب یہ مرحلہ ختم ہو چکا ہے، دور حاضر کی اخلاقی و اجتماعی قیادت اور اعتقادی اصلاح کے لئے اسلام کو گھسیٹنا درست نہیں، کیونکہ دونوں زمانے میں بڑا فرق ہے، وہ احادیث کے خلاف افترا پردازی کر کے مسلمانوں اور عربوں کو بھی ان کی جانب سے بدگمان کر دیتے ہیں، جونیبل احادیث کو ہدف بنا کر تناقض کے متعلق لکھتا ہے'' زمانہ کے ساتھ ساتھ رسول اللہ کی مرویات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا، مسلمانوں کا ہر فرقہ اپنی تائید کے لئے احادیث گڑھتا رہا، اس طرح ہر شخص کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی رائے کو کسی نہ کسی حدیث کے موافق ثابت کر دے، یہی وجہ ہے کہ موضوع و متناقض حدیثوں کی کثرت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ہی سنت کے بارہ میں سخت متضاد حدیثیں پائی جاتی ہیں۔''

احمد شاکر مرحوم نے اس اعتراض کا بہت طویل جواب دیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ وضاعین و کذابین کی وضع و افترا سے انکار نہیں، یہ بھی تسلیم ہے کہ سچے راویوں کی بعض حدیثوں میں غلطیاں موجود ہیں، خود علمائے فن اور محدثین نے ان کی حقیقت واضح کر دی ہے، لیکن مقالہ نگار نے احادیث کی جو یہ تصویر پیش کی ہے کہ حلال و حرام اور طہارت و نظافت کے تمام مسائل ہی موضوع حدیثوں پر مبنی ہیں، اس سے تو اس کا سارا ذخیرہ ہی باطل اور مردود قرار پاتا ہے، اور اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کچھ فرمایا اور نہ کچھ کیا۔''

احادیث پر ان کی بہتان تراشی کے نمونے یہ بھی ہیں کہ بعض حدیثیں انجیل کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں، آپؐ نے آباء و اجداد کے طور طریقے بدل کر کچھ نئے طور طریقے جاری کر دئے، اسی طرح انھوں نے آپؐ کی نبوت میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے آپؐ کے ان اقوال کو بہت

نمایاں کیا ہے، جن میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے تاکہ انھیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنائیں، لیکن ہمارے علمائے محققین نے مدلل طور پر ان افترا پردازیوں کا جواب دیا ہے اور عملی انداز میں مستشرقین کے باطل خیالات کی تردید کی ہے۔

شبہات و اعتراضات کا محور و مرکز مستشرقین کے سارے الزام کا محور دو ہے (۱) محمدؐ نبی اور رسول نہیں تھے بلکہ محض ایک انسان تھے (۲) اسلام انسانی نتیجۂ فکر اور ذہنی اختراع ہے وحی الٰہی نہیں ہے۔

اس معاملہ میں سب مستشرقین برابر اور یکساں ہیں، خواہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اجتماعی مصلح، منفرد عبقری، بے مثال بہادر اور انسانیت کا قائد و رہنما سمجھتے ہوں یا آپ کو گھناؤنی عادتوں، مکر و فریب، پرخوری، ہوس رانی، شہوت، بزدلی، سنگ دلی، سفاکی اور خوں ریزی سے متہم کرتے ہوں اور یہ کہتے ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گذشتہ آسمانی کتابوں کی پیروی کرتے تھے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو ایجابی یا سلبی نظر سے دیکھنے والے مستشرقین بھی برابر ہیں، نیز جو آپ کی شخصیت کو اعتدال و انصاف کی میزان میں تولتے ہیں اور جو بھونڈی اور مذموم اغراض کی میزان میں تولتے ہیں سب ہی برابر ہیں، کیونکہ یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جزیرۂ عرب کے ایک فرد تھے اور جس طرح دوسرے اور آخری گروہ سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مسلمانوں کی طرح آپ پر ایمان لائے گا۔ آپ کو نبی و رسول تسلیم کرے گا اور اسلامی فکر کا حامل ہوگا، اسی طرح پہلے گروہ سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی، البتہ مستشرقین کی ایک تیسری جماعت بھی ہے، جس کی حق گوئی، اعتراف حقیقت اور انصاف پسندی نے اسے اسلام قبول کرنے اور اسے قولاً و عملاً اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے اکثر تمام فکری دائروں میں اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دینے لگے۔

مستشرقین کے بعض اعتراضات کے شروع میں نبوت کے دفاع کا ذکر ہوتا ہے، پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور آپؐ کی بعثت سے پہلے اور بعد کی زندگی کو زیر بحث لاکر اسی پہلے محور کے گرد پہنچ جاتے ہیں، ابتدا میں تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر بات کو تسلیم کرلیں گے اور آپ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر بحث کرکے اس کی گوناگوں خوبیاں اور کمالات واضح کریں گے، مگر اس کے بعد بھی وہ اس امر کا اقرار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور آپ پر بھی اسی طرح وحی نازل ہوتی تھی جس طرح گذشتہ انبیا، حضرت ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ

علیہم السلام پر اتری تھی۔ جن کی نبوت کے یہ لوگ بھی قائل ہیں، بیشک اسی کا نام عصبیت اور جانبداری ہے۔

ان کا دوسرا محور یہ ہے کہ اسلام کسی مصلح یا عبقری شخص کے ذہن کی پیداوار ہے، حالانکہ نامور مستشرقین اور قانون کے ماہرین شاخت وغیرہ کو اعتراف ہے کہ قانونی حیثیت سے اسلام کو رومن لا پر فوقیت حاصل ہے، اور وہ اکثر جدید قوانین سے بھی افضل و برتر ہے۔ اسی طرح دین و مذہب کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ اسلام کا عقیدہ توحید واقعیت وحقیقت کے اعتبار سے کسی بھی دوسرے آسمانی عقیدہ وتصور سے ممتاز ہے۔ اسلامی عبادات کے بعض اعمال گو بعض لوگوں کی نظر میں جاہلیت کی یادگار ہیں، اور وہ انھیں قدیم مشرقی مذاہب سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ مانتے ہیں کہ ان کا خاص مقصد انفرادی واجتماعی اصلاح ہے۔ رہے اخلاق ومعاملات تو بعض لوگ انہی کو اصل اور تمام اسلام قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے اندر انسانیت کی بنیادی قدرو قیمت کی ضمانت ہے، جیسے آزادی، عظمت وکرامت، احساس ذمہ داری اور زندگی کی مخالفت وغیرہ، ان حیثیتوں سے اسلام دوسرے مذاہب میں منفرد ہے، اسی طرح اسلام کے اقتصادی، سیاسی، خاندانی اور اجتماعی نظام، قانون قضا اور نظم مملکت سے بھی اس کا بہت روشن پہلو سامنے آتا ہے، اور اسلام اپنے اسی تمدن وشایستگی کی وجہ سے گذشتہ زمانہ میں زمین پر حکمرانی کرتا رہا ہے اور اب بھی اس میں زندگی اور نمو کی صلاحیت رکھنے والی ایسی قدریں ہیں، جن کی بدولت وہ از سر نو زمین پر حکومت وفرمانروائی کرے گا۔

یہی وہ محور ومرکز ہیں جہاں سے پھر الزامات کا رخ سیرت نبویؐ کی جانب ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ہم مستشرقین کے ان دونوں گروہوں کو برابر سمجھتے ہیں، جو اسلام کے اوصاف و محامد بیان کرتے ہیں یا اس کے معائب ومثالب کی کرید کرتے ہیں اور اس پر نکما، آزادی اور کھلی چھوٹ دینے، غلامی کی داغ بیل ڈالنے، عورتوں کے حقوق غصب کرنے، رحم وشفقت سے عاری ہونے اور اسی نوعیت کے بہت سارے اسلام کے اصول وقوانین سے میل ومطابقت نہ رکھنے والے الزامات عائد کرتے ہیں۔

اب ہم ان کے سیرت نبویؐ پر بعض اعتراضات کا جائزہ لیں گے۔

آپؐ پر بحیثیت آدمی کے اعتراضات

مستشرقین کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف نوعیت کی تہمتیں لگائی گئی ہیں، سب سے پہلے آدمی کی حیثیت سے آپؐ پر جو

اعتراضات کئے گئے ہیں ان کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(الف) پرخوری کا الزام لامانس کہتا ہے "آپ بڑے پرخور تھے، آپ کا جسم لذیذ اور مرغوب کھانوں کی وجہ سے بھاری اور موٹا ہوگیا تھا۔" مگر کھانے کے بارہ میں آپ کے جو عام اور مشہور آداب بیان کئے گئے ہیں اور جو مورخین کے نزدیک بھی ثابت وتسلیم شدہ ہیں، یہ قول ان کے بالکل برعکس ہے۔ آپ کی حالت تو یہ تھی کہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے مگر کبھی جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی، پانی اور روٹی ہی اکثر آپ کی غذا ہوتی تھی، انھیں آپ اسودین[1] کہتے تھے، حافظ ابن قیم جوزی فرماتے ہیں "کھانے میں آپ کا معمول اور عادت مبارکہ یہی تھی کہ موجود کو مسترد نہ کرتے اور غیر موجود کے لئے زحمت نہ دیتے، جو میسر ہوتا اسے تناول فرماتے، ورنہ صبر کرتے، بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے، مہینوں گذر جاتے اور آپ کے گھر میں آگ بھی نہ جلتی۔ ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے مقدام بن معدی کرب کی یہ روایت نقل کی ہے، اور اسے حسن بتایا ہے، اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی کے لئے پیٹ بھرنے سے زیادہ خراب کوئی اور برتن بھرنا نہیں ہے، اس کے لئے چند لقمے کافی ہیں، جو اس کی پیٹھ کو سیدھی رکھیں، اگر کوئی شخص اپنے نفس سے مغلوب ہوجائے تو ایک تہائی پیٹ میں کھانا کھائے، ایک تہائی میں پانی پئے اور ایک تہائی پیٹ خالی رہنے دے، امام بخاری کی صحیح میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ وہ کچھ لوگوں کے پاس سے گذرے جن کے سامنے بھونی بکری تھی، لوگوں نے ان سے کھانے کی فرمائش کی مگر انھوں نے انکار کردیا، اور کہا کہ رسول اللہؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور کبھی انھوں نے شکم سیر ہوکر جو کی روٹی بھی نہیں کھائی، وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد آل محمدؐ نے کبھی مسلسل تین رات گیہوں نہیں کھایا، یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی۔

اس سے قطع نظر معترض نے رسول اللہؐ کے ماہ رمضان میں روزہ رکھنے کا کوئی ذکر نہیں کیا، حالانکہ آپؐ رمضان کے علاوہ دوسرے مہینوں میں بھی روزے رکھتے تھے اور پیر اور جمعرات کو تو عموماً روزے سے ہوتے تھے، کبھی کبھی روزے رکھنے پر آتے تو لوگوں کو خیال ہوتا کہ آپؐ افطار نہ کریں گے، اسی طرح رمضان میں صوم وصال کا اہتمام فرماتے تھے یعنی دو یا کئی کئی دنوں تک مسلسل روزے رکھتے اور شب میں بھی کھانا پینا ترک کردیتے تاکہ رات و دن کے بیشتر اوقات عبادت

(۱) اسودین سے۔ پانی اور کھجور مراد ہے۔

میں گذاریں، مگر صحابۂ کرام کو اس سے منع کرتے، انھوں نے عرض کیا آپؐ تو ایسا کرتے ہیں، فرمایا میں تمہاری طرح نہیں ہوں، میرا خداوند مجھے کھلاتا پلاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آپؐ کو علوم و معارف کی غذا عطا کی جاتی ہے اور آپؐ کے دل پر مناجات کی لذتوں کا فیضان ہوتا ہے، امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت انسؓ سے اس روایت کی تخریج کی ہے کہ رسول اللہؐ مہینہ کے بعض حصوں میں افطار سے ہوتے تو معلوم ہوتا کہ آپؐ روزہ ہی نہ رکھیں گے اور روزہ رکھنے لگتے تو خیال ہوتا تھا کہ اب آپؐ افطار سے نہ ہوں گے، اسی طرح شعبان میں بھی اکثر روزے سے رہتے تھے اس کے بعد پرخوری کا الزام کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔

(ب) بزدلی اور لڑائیوں میں گھبراہٹ اور بے صبری کا الزام قدیم وجدید کسی مورخ نے بھی آپؐ پر یہ الزام عائد نہیں کیا ہے مگر مستشرق پادری لامانس نے مورخین و ارباب سیر کے اجماع عام کے برخلاف آپؐ کو اس الزام سے متہم کرکے تمام عربوں کو بھی اسی لپیٹ میں لے لیا ہے، وہ کہتا ہے۔ ''لوگ عربوں کو شجاعت سے متصف مانتے ہیں اور اسی کو دوراول کی اسلامی فتوحات میں ان کی کامیابی کی وجہ قرار دیتے ہیں، لیکن مجھے اس انتہائی مبالغہ آمیز رائے کو ماننے میں سخت تردد ہے۔'' ڈاکٹر عبدالحلیم رسول اللہؐ کی شجاعت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''آپؐ لڑائیوں میں خود فوج کی قیادت کرتے اور کسی جنگ میں بھی آپؐ پراگندہ خاطر نہ ہوئے، یہاں تک کہ احد کی لڑائی میں جب مسلمان عظیم ابتلا سے دوچار ہوئے اور غزوۂ خندق میں جب دشمنوں کا لشکر جرار امنڈ پڑا تھا اور حنین کے روز جب مینھ کی طرح نیزوں اور تیروں کی بارش ہورہی تھی تب بھی آپؐ خائف اور مرعوب نہیں ہوئے۔

ان شواہد کے بعد بھی لامانس نے یہ افسانہ تراشا ہے کہ آپؐ میں شجاعت، دلیری اور بہادری نہ تھی ۔امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت انسؓ کی سند سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے زیادہ بہادر اور سب سے بڑھ کر سخی تھے۔ اہل مدینہ گھبرا اٹھتے مگر آپؐ پر خوف طاری نہ ہوتا اور سب سے پہلے گھوڑے پر سوار ہوجاتے، وہ جبیر بن مطعم سے روایت کرتے ہیں کہ حنین سے واپسی کے وقت آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''تم لوگ مجھے جھوٹا، بخیل اور بزدل نہ پاؤ گے، آپ بزدلی سے پناہ مانگتے، امام بخاریؒ عمرو بن میمون ازدی اور حضرت انسؓ سے یہ مسند روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ فرماتے تھے کہ'' اے اللہ میں عجز و درماندگی، کاہلی وسستی، دہشت و بزدلی اور بڑھاپے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔'' داعیان حق کا یہی

حال ہوتا ہے وہ جو پیغام پہنچاتے ہیں اور جسے نافذ و جاری کرتے ہیں، اس کی شدید مخالفت کی جاتی ہے، اس بنا پر ان کا شجاع اور نڈر ہونا ضروری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سب سے زیادہ بہادر تھے، اس لئے یہ الزام کسی طرح بھی درست نہیں ہوسکتا۔

(ج) خواب ومنام کی کثرت کا الزام یہ بہتان قرآن وحدیث کی صراحت اور تاریخی حقائق کے خلاف ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام اوصاف و عادات سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوتی، اس بنا پر لامانس کا یہ کہنا کہ ''آپؐ بہت زیادہ سوتے تھے'' یا تو اس کی واقعی جہالت کا نتیجہ ہے یا اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے۔ کیونکہ عربوں میں نقد وانتقاد کی قوت و صلاحیت حد سے بڑھی ہوئی تھی، اگر وہ آپؐ کی زندگی میں کسی ایسی بات کا مشاہدہ کرتے جو قرآن کی اس خبر کے مطابق نہ ہوتی کہ آنحضرتؐ رات کا ایک بڑا حصہ عبادت میں گزارتے تھے، تو وہ آپؐ کی پیروی اور تصدیق نہ کرتے، کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ. (مزمل۔۲۰)

بیشک تیرا خداوند خوب جانتا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھ کے لوگ (کبھی) دوتہائی رات کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات قیام کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ رات میں اس قدر طویل قیام کرتے کہ پائے مبارک میں ورم آجاتا تھا، حضرت مغیرہؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ رات میں نماز کے لئے قیام فرماتے۔ اس کی وجہ سے آپؐ کے پائے مبارک اور پنڈلیوں میں ورم آجاتا تھا، اس بارہ میں جب آپؐ سے کچھ کہا جاتا تو فرماتے کیا میں خدا کا شکرگزار بندہ نہ بنوں۔

حافظ ابن حجر قرطبی کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ استفسار کرنے والوں کا خیال تھا کہ عبادت الہٰی کے لئے مشقت جھیلنے کی وجہ گناہوں کا خوف اور رحمت ومغفرت کی طلب ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مغفرت ثابت شدہ امر ہے۔ اس لئے آپ کو عبادت کی کوئی احتیاج نہیں تھی، آپؐ نے ان لوگوں کو بتایا کہ عبادت کا ایک سبب انعام ومغفرت کی شکرگذاری اور اس نعمت میں غیر مستحقین کو شریک کرنا بھی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو آپؐ نے اتنا لمبا قیام کیا جس کی وجہ سے میرے دل میں ایک برا خیال پیدا ہوا۔ لوگوں نے دریافت کیا، کونسا برا خیال پیدا ہوا، فرمایا میں نے ارادہ کیا کہ بیٹھ

جاؤں اور آپ کو چھوڑ دوں، امام مسلم حضرت حذیفہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہؐ کے ساتھ نماز پڑھی تو آپؐ نے بقرہ، آل عمران اور نساء کی سورتیں ایک ہی رکعت میں پڑھیں۔ اس درمیان میں جب آپ کوئی ایسی آیت تلاوت کرتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو آپ تسبیح پڑھنے لگتے۔ سوال کا تذکرہ ہوتا تو سوال کرتے، تعوذ کا موقع ہوتا تو تعوذ فرماتے، پھر قیام سے کچھ کم دیر تک رکوع میں رہے اور اس سے کم دیر تک قومہ میں رہے اور قیام ہی کے بقدر لمبا سجدہ کیا، حافظ ابن قیم جوزی فرماتے ہیں کہ آپ کبھی بستر پر سوتے، کبھی چمڑے کے فرش پر، کبھی چٹائی پر، کبھی زمین پر، کبھی تخت پر، کبھی ریت پر اور کبھی سیاہ کمبل یا بوریا پر، آپ کا بستر گندمی رنگ کے چمڑے کا تھا، اس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ آپؐ کے پاس ایک ٹاٹ تھا، آپؐ اس پر دو تہہ کر کے سویا کرتے تھے۔ ایک روز چار تہہ کر کے بچھایا گیا تو آپؐ نے ناگواری ظاہر کی اور فرمایا اسے پہلے کی طرح کر دو تاکہ اس کی وجہ سے رات کی نماز میں رکاوٹ نہ پیش آئے۔

ذرا غور کیجئے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل یہ تھا تو مستشرقین کی افترا پردازی کس قدر لغو ہے۔

نبی کی حیثیت سے آپؐ پر الزامات　نبیؐ کی ذات پر بحیثیت آدمی مستشرقین کے اعتراضات کا مختصر جائزہ لینے کے بعد اسی طرح کے چند بے سروپا اور الزام ملاحظہ ہوں، ان کا تعلق آپ کی نبوت و رسالت سے ہے۔

(الف) رسول کے نام پر اعتراض　ڈر منگھم کا بیان ہے کہ نبیؐ کا اصلی نام قثم تھا۔ ولادت کے تھوڑے عرصہ بعد یا بعثت کے بعد اسے بدل کر آپؐ نے اپنا نام محمد رکھ لیا۔ حالانکہ اس کی نوعیت نام سے زیادہ لقب کی ہے۔ اسی طرح آپؐ کی کنیت عرصہ تک ابوالقاسم رہی، لامانس وغیرہ نے بھی رسول کے نام کو ایک معما اور لاینحل مسئلہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہوار اپنی کتاب تاریخ العرب میں یہ تعلیل و توجیہ پیش کرتا ہے کہ محمد کا لفظ اصلاً وصف ہے۔ اس کے ایک خاص معنی ہیں، اسی لئے لوگوں نے اسے ان کا لقب قرار دیا ہے۔ ڈر منگھم کی کتاب کا مترجم اس افترا پردازی کے متعلق لکھتا ہے: ''یہ عجیب و غریب الزام ہے، سب سے پہلے اسپرنگر نے اس کا ذکر کیا، اس کا ماخذ سیرت حلبیہ کی ایک روایت ہے جو امتاع سے اس طرح نقل کی گئی ہے کہ عبدالمطلب کے بیٹے قثم نو برس کی عمر میں آنحضرتؐ کی پیدائش سے تین سال قبل فوت ہو گئے، عبدالمطلب کو اس کا بڑا قلق ہوا، اس لئے جب آنحضورؐ کی ولادت ہوئی تو انھوں نے آپ کا نام قثم رکھا۔ مگر حضرت آمنہ نے کہلایا کہ انھیں

خواب میں بچے کا نام محمد رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، اس بنا پر عبدالمطلب نے پھر ان کا نام محمد رکھ دیا۔"

اس روایت کا وضعی اور جعلی ہونا بالکل واضح ہے اور اگر اس کی علتوں کو نظر انداز کر کے اسے مان بھی لیا جائے تو ادنی غور و فکر کرنے والے کو بھی اس سے صرف یہی معلوم ہوگا کہ عبدالمطلب نے آنحضرتؐ کی ولادت کے چند ہی لمحے بعد حضرت آمنہ کے اشارہ پر آپ کا نام قثم سے تبدیل کر کے محمد رکھ دیا۔ مگر ہرشفلڈ اسپرنگر کی اس رائے نے مستشرقین کے لئے قیاس آرائی اور افترا پردازی کا ایک نیا دروازہ کھول دیا، اور انھوں نے اس سے عجیب و غریب اور نہایت بعید از قیاس نتائج اخذ کر لئے اور اس طرح کی بے سر پیر کی بات اڑا دی کہ آپ کا نام محمد بعثت کے بعد رکھا گیا، اور بعض لوگوں نے تو یہاں تک ستم ڈھایا کہ قرآن میں جہاں محمد و احمد کا ذکر ہے، وہ بعد کا اضافہ ہے۔ مثلاً

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِيْ	اور جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا کہ
اِسْرَائِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ	اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس خدا
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ	کا بھیجا ہوا تصدیق کرتا ہوا آیا ہوں اپنے
وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي	سے پیشتر سے آئی ہوئی تورات کی اور
اسْمُهٗ اَحْمَدُ	ایک پیغمبر کی بشارت سناتا ہوا آیا ہوں جو
(صف-۶)	میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا

لیکن یہ ساری باتیں اسلام کے خلاف ان کے بغض و حسد کا نتیجہ ہیں، ورنہ یوحنا کی انجیل کے باب اصحاح (۱۴) میں فارقلیط کا لفظ آیا ہے، جو محمد ہی کے ہم معنی ہے۔ ان مستشرقین نے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا کہ ان کے اس بے بنیاد الزام کے ماخذ سیرت حلبیہ کے اندر اس کا بھی ذکر ہے کہ آنحضرتؐ سے پہلے تقریباً سولہ اشخاص کا نام محمد تھا۔ علاوہ ازیں عربی زبان میں قثم اس شخص کو کہتے ہیں جس کا بدن گٹھا ہوا ہو یا جسمانی اعتبار سے کامل و جامع ہو، ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میرے پاس ایک فرشتہ آیا اور اس نے کہا تم قثم ہو اور تمہاری خلقت درست ہے، پتہ نہیں مستشرقین اس کے بارہ میں کیا کہیں گے؟ اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ بعثت کے بعد فرشتے نے آپؐ کو قثم کا خطاب عطا کیا تھا۔

(ب) رسول کی امیت بار کہتے ہیں"...... دوسری آیت یہ ہے:

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ	اور اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ
بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖ اِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ	اگر ان کے پاس امانت کا ڈھیر بھی رکھو تو

اِنْ تَأْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (آل عمران-۷۵)	مانگنے پر لوٹا دیں گے اور ان میں وہ بھی ہیں کہ اگر تم ان کی امانت میں ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک اس کو لوٹانے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ، یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان امیوں کے معاملہ میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے، اور یہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔

اس سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ بت پرستوں کے لئے امی یا امیین کا لفظ اہل کتاب یا یہودیوں نے وضع کیا تھا۔ اس رائے کی مزید تائید ہارنٹر کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ عبرانی میں اس کا مقابل لفظ اموت ہاعولام ہے، پھر وہ کہتے ہیں کہ محمد کی لفظ امی سے کیا مراد تھی؟ اس کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنی مشکل ہے، بول کا خیال ہے کہ امی سے وہ شخص مراد ہے جو لکھ پڑھ نہ سکتا ہو، اس کے معنی وثنی (بت پرست) نہیں ہے، مگر اس کے بعد وہ یہ بھی کہتا ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر امی کے معنی کی یہ تعیین دشوار ہے۔ کیونکہ عربی میں ''امۃ''، عبرانی میں ''اما'' اور آرامی میں ''امتیا'' کا لفظ کسی امت یا قوم کی جہالت کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال نہیں ہوتا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ امی کا لفظ حضرت محمدؐ کے لئے اس وجہ سے استعمال ہوا ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے، مگر حقیقت یہ ہے کہ لفظ امی کا ان سب معنوں سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (بقرہ-۷۸)	اور ان میں امی (ان پڑھ) ہیں جو کتاب الٰہی کو صرف اپنی آرزوؤں کا مجموعہ خیال کرتے ہیں حالانکہ وہ صرف انکل کے تیر تکے چلاتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیین سے مراد نوشت و خواند سے ناواقف لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کو منزل من اللہ آسمانی کتابوں سے ناواقفیت تھی۔

مستشرقین کے اقوال کے تعارض و تضاد کو نظر انداز کر کے ان کے اس شبہ کی تردید میں چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

۱- نبی اکرمؐ کی شان میں امی کا لفظ سورہ اعراف کی دو آیتوں میں آیا ہے، یہ مکی سورہ ہے چونکہ اس وقت تک آپ کا یہود سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس بنا پر یہ خیال صحیح نہیں ہو سکتا کہ اسے یہود نے بت پرستوں کے لئے استعمال کیا تھا۔ عبرانی و آرامی میں اس کے مقابل کا ہونا بھی اس کے یہود کی وضع و اصطلاح ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

۲- امی کا لفظ قرآن مجید میں چھ جگہ آیا ہے۔ اعراف کی دو آیتوں (۱۵۷-۱۵۸) میں اور آل عمران کی دو آیتوں (۲۰-۷۵) میں اور ایک ایک جگہ جمعہ (۲) اور بقرہ (۷۸) میں، ان آیتوں کے سیاق سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے مراد نوشت وخواند سے بے بہرہ لوگ ہیں۔ اور یہی عربی زبان میں اس لفظ کے معروف معنی ہیں، لغت کے ائمہ اور عربیت کے ماہرین نے بھی اس کی یہی تشریح کی ہے، طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں "عربوں کے نزدیک امی وہ شخص کہلاتا تھا جو لکھنا نہ جانتا ہو"۔ ابوحیان اندلسی اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں "نوشت وخواند سے ناواقف امی کہلاتا ہے۔" ام کی جانب اس کی نسبت بھی اسی معنی کی نشاندہی کرتی ہے کہ قرأت و کتابت عورتوں کا عمل و شغل نہیں، قرآن نے آپؐ کی امیت کی صراحت اس طرح کی ہے:

وَمَا كُنتَ تَتْلُو مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ. (عنکبوت-۴۸)	اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے، ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک کرتے۔

رسول کی امیت تواتر سے ثابت ہے اور مستشرقین اس کی ذات سے جس نبوت کو سلب کرنا چاہتے ہیں اس کے دلائل میں امیت بھی ہے۔

۳- اوپر نقل کی گئی آیت (ومنھم امیون الخ) سے مقالہ نگار نے دعویٰ کیا ہے کہ اس سے مقصود خدا کی نازل کی ہوئی کتابوں سے عربوں کی عدم معرفت ہے، یہی رائے بعض مفسرین کی بھی ہے(۱)۔ طبری نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کا ایک اثر بھی نقل کیا ہے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیین سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کی تصدیق نہیں کی تھی اور خدا نے اس نام سے انھیں اس

(۱) گو کثرت سے علما نے اسی معنی کو مراد لیا ہے جس کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے، مگر محققین کے نزدیک صحیح قول دوسرا ہے، گو رسول اللہؐ کا نوشت وخواند سے عاری ہونا ثابت ہے، مگر تمام عربوں کا یہ حال نہ تھا۔

لئے موسوم کیا کہ وہ اس کی کتابوں اور رسولوں کے منکر تھے، لیکن اس اثر کی سندیں ضعیف ہیں، اور یہ از روئے نقل بھی ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ ضحاک اگر چہ ثقہ ہیں لیکن ان کی نہ حضرت ابن عباسؓ سے ملاقات ثابت ہے اور نہ کسی اور صحابی سے، اگر یہ اثر صحیح بھی ہو تو مجازاً ہی یہ مفہوم مراد ہو سکتا ہے مگر طبرانی نے اس کی تردید کی ہے، اور یہ تاویل کلام عرب کے معروف استعمال کے خلاف بھی ہے۔

(ج) قرآن خدا کی طرف سے وحی نہیں ہے

پہلے الزام سے زیادہ خطرناک دوسرا الزام یہ ہے کہ قرآن رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے جو آپؐ کے عمل اور کاریگری کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے یہ بات کتنی عجیب ہے کہ ان غرض پسند مستشرقین کی نظر اللہ کے کلام اور رسول کے کلام کے اس فرق پر نہیں جاتی جو اسلوب اور اعجاز وغیرہ کے لحاظ سے دونوں میں ہے، گو کہ رسول کا کلام بھی انسانی بلاغت و بیان کا سب سے عمدہ وارفع نمونہ ہے، قرآن نے جب تمام انسانوں کو عموماً اور عربوں کو خصوصاً یہ چیلنج کیا کہ قرآن جیسا کوئی کلام یا اس کی کسی سورہ جیسی کوئی سورہ پیش کریں تو سب سے پہلے اس چیلنج کا خود محمدؐ ہی کو سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ آپؐ نے تو اپنی زندگی میں حدیث کی کتابت سے بھی منع کر دیا تھا تا کہ قرآن وحدیث ایک دوسرے سے گڈمڈ نہ ہو جائیں۔(۱) یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ کیا کوئی مصنف برسر عام ایسے شاندار کارنامہ کو اپنی جانب منسوب کرنے کی تردید کرے گا اور اس پر خود اپنی اس قدر شدید ملامت کرے گا۔ نیز کیا عربوں کا رسول کے کلام اور خدا کے کلام میں فرق و امتیاز کرنے سے عاجز رہنا ممکن ہو سکتا ہے، جب کہ ان کی زبان دانی اور طلاقت لسانی مشہور ہے، بیان و بلاغت کا کوئی نکتہ شناس اور عربیت کا رمز آشنا قرآن مجید کے خدا کی وحی ہونے کا منکر نہیں ہو سکتا، انور جندی تحریر کرتے ہیں "مستشرقین کی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ وہ آنحضرتؐ کی ذہانت، عبقریت، فہم و فراست کی بنا پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن اس ماحول کے اثر سے آپؐ کے ذہن و دماغ میں ڈھلا جس میں آپؐ کی نشو و نما ہوئی تھی اور جس میں آپؐ نے زندگی بسر کی تھی یا پھر وہ باطنی عقل کے فیضان کا نتیجہ ہے، اس پروپگنڈہ کا مقصد مسلمان کا قرآن سے رشتہ کاٹنا ہے، کیونکہ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ وہ محمدؐ کا کلام ہے۔ تو لامحالہ یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ وہ انسانی فکر و عمل کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد اس کی ساری عظمت اور معنوی بلندی خاک میں مل جائے گی اور مسلمان متفرق اور پراگندہ ہو جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں نظم و نسق اور گوناگوں پہلوؤں سے نہایت واضح اور بین فرق ہے۔ علاوہ ازیں محمدؐ امی تھے۔ وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے

(۱) یہ ممانعت ابتدائی دور کے لئے تھی، بعد میں رسول اللہؐ نے تحریر و کتابت کی اجازت دے دی تھی۔

تھے۔ تنہا یہی ایک ایسی دلیل ہے جن سے ان لوگوں کی مکمل تردید ہو جاتی ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ آپ کو گذشتہ کتابوں سے واقفیت تھی. جب آپؐ کو اپنی قوم کے سواکسی اور قوم کے واقعات و حالات کا علم ہی نہ تھا تو آخر کس ذات نے آپؐ کو اگلے لوگوں کے واقعات اور قصوں سے مطلع کیا تھا۔

(د) رسول اللہ کی اعصابی کیفیتیں اسپرنگر کہتا ہے کہ آپؐ کو اعصابی عوارض لاحق ہو گئے تھے اور یہ انھیں اپنی ماں حضرت آمنہ سے وراثۃً ملے تھے، کیونکہ زمانۂ حمل میں وہ ایسے خواب دیکھتی تھیں جو از قسم خرافات تھے، مگر بھل اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اسپرنگر کی طرح ہمیں خوابوں کا سہارا نہیں لینا چاہئے، شیخ محمد عرفہ لکھتے ہیں ہم کو خوشی ہے کہ خود مستشرقین ہی نے اسپرنگر کے اس خیال کی تردید کردی ہے کہ آنحضرتؐ کو اعصابی کیفیتیں اور حالتیں پیش آتی تھیں، جو انھیں اپنی ماں سے وراثۃً ملی تھیں لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں کہ حضرت آمنہ کے خواب از قسم خرافات تھے، کیونکہ ان کا خواب دیکھنا محال اور ناممکن نہیں، اسی طرح خواب دیکھنے والے کے لئے اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہونا ضروری نہیں ہے۔

مستشرقین اور مسلمانوں میں سے متعدد محققین نے نفسیات اور علم تاریخ کی روشنی میں اس الزام کی تردید کی ہے، انھوں نے انسانی نفسیات کے مطالعہ اور آدمی کی صحت و مرض کا تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ اعصابی بیماریوں میں مبتلا اشخاص سے عظمت و برتری کے کمالات، قابل رشک و فخر کارنامے اور غیر معمولی ذہنی نتائج کا ظہور ناممکن ہے، نیز وحی کے حالات و کیفیات اعصابی امراض (مرگی اور بیہوشی وغیرہ) کی حالتوں اور کیفیتوں سے بالکل مختلف ہیں، ڈاکٹر ہیکل لکھتے ہیں۔

''مستشرقین کی تحقیقات نے ان کی رہنمائی اس امر کی جانب کی ہے کہ آنحضرتؐ کو مرگی کی بیماری تھی، اس لئے آپؐ پر جنونی کیفیتیں طاری ہو جاتی تھیں، اس حالت میں آپ پوشیدہ ہو جاتے، بدن سے پسینہ بہنے لگتا، جسم میں تشنج آجاتا، اعضاء و جوارح سکڑ جاتے اور منھ سے جھاگ گرنے لگتا جب افاقہ ہوتا تو آپؐ مسلمانوں کے سامنے تلاوت کرتے اور کہتے کہ یہ اللہ کی جانب سے مجھ پر وحی ہوئی ہے، حالانکہ یہ سب باتیں مرگی کے دورے کا نتیجہ ہوتی تھیں، مگر محمدؐ پر وحی کے وقت جو کیفیت طاری ہوتی اور آپ پر جو کچھ فیضان ہوتا اس کی یہ تعبیر و توجیہ علمی حیثیت سے نہایت غلط ہے. کیونکہ جس پر مرگی کا دورہ ہوتا ہے وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اسے اس اثنا میں پیش آنے والی باتیں یاد رہ جائیں بلکہ افاقہ کے بعد وہ ان سب باتوں کو بھول چکا ہوتا ہے اور اسے بالکل ہی یاد

نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کیا پیش آیا تھا، کیونکہ فکر و شعور کی حرکت اس حالت میں یکسر معطل ہو جاتی ہے، لیکن وحی کے وقت پیغمبر کا یہ حال نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ہوش و حواس بجا رہتے ہیں، ادراک کی قوت بیدار رہتی ہے اور جو کچھ اسے ملتا ہے، وہ اسے پوری توجہ سے سنتا اور محفوظ کر لیتا ہے اور پھر اسے اپنے ساتھیوں کے سامنے بیان کرتا ہے۔

نزولِ وحی کے وقت روحانی ادراک کو مکمل طور پر بیدار رہتا ہے، تاہم جسم کی اصل کیفیت کا اس وقت زائل ہو جانا بھی ضروری نہیں ہے، بلکہ اکثر تو نزولِ وحی کے وقت آپ عادی طریقے پر بالکل بیداری کی حالت میں ہوتے تھے۔ سورہ فتح کے نازل ہونے کے وقت آپ کی یہی کیفیت تھی، یہ سورہ واقعہ حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کی مکہ سے مدینہ واپسی کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اعصابی بیماریاں انسان کے ہوش و حواس کو معطل کر کے ایسی حالت میں کر دیتی ہیں جس میں شعور، احساس اور ادراک مفقود ہو جاتا ہے لیکن وحی میں یہ صورت پیش نہیں آتی بلکہ دراصل یہ روحانی ارتقا کا نام ہے جو انبیاء ہی کو اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے، اور اس کے ذریعہ اعلیٰ اور یقینی حقائق کو نبیہ کو ان پر القا فرماتا ہے تاکہ وہ انھیں لوگوں تک بھی پہنچا دیں۔

اعتدال پسند مستشرقین کی تصنیفات میں بھی اس شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے، مثلاً محمد رسولؐ (آینا دینہ) حیات محمد (ڈرمنگھم) حیات محمد (آرونگ) تہذیب و تمدن کی کہانی (دل ڈیوران) مشرقی تحقیقات (ڈاگوبہ) وغیرہ۔

سنوک ہرگرنگ کہتا ہے کہ محمد کا وزن تسلیم کرنا چاہئے وہ تاریخ عالم کے ممتاز ترین فرد تھے، دوسرے مصنفین کی کتابوں میں بھی اس پر طویل بحثیں موجود ہیں اور انھوں نے وحی کی کیفیت بیان کرنے میں صحیح حدیثوں اور معتبر کتب سیرت کو ماخذ بنایا ہے۔

معجزات نبوی کا انکار

وحی کا خارق عادت ہونا بالکل واضح ہے، اور جب اس کی مختلف شکلیں احادیث سے ثابت ہیں تو دوسرے خوارق و معجزات بھی اگر صحیح حدیثوں سے ثابت ہوں تو انھیں تسلیم کرنے میں کون سا امر مانع ہو سکتا ہے، مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد یہ تصور اپنے دل سے نکال دینا چاہئے کہ آپؐ کی زندگی کا صرف ایک ہی معجزہ قرآن ہے اور اگر کسی کا آپؐ پر ایمان ہی نہ ہو تو بھلا وہ آپؐ کے کسی معجزہ کو کیا تسلیم کرے گا، خواہ یہ معجزۂ قرآنی ہی کیوں نہ ہو۔

معجزات کی من مانی تاویل اور ان کی اپنی خواہشات کے مطابق توجیہ بڑی ناروا جسارت

ہے، نہ یہ بحث و تحقیق کا صحیح انداز ہے اور نہ کسی معقولیت پسند شخص سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے، معجزات کو مقتضائے عادت کے خلاف ہونے ہی کی بنا پر خوارق کہا جاتا ہے، اور جو چیزیں عادی اور مانوس طریقے کے مطابق ہوں انہی کے امکان و عدم کی بحث علم قیاس کے دائرہ میں آتی ہے، لیکن علم و دانش کا کبھی بھی یہ فیصلہ نہیں رہا ہے کہ مالوف اور عادی چیزیں ہی صرف ممکن الوقوع ہوتی ہیں، اور نامانوس اور غیر عادی چیزوں کا وقوع غیر ممکن اور محال ہے۔ اگر تم معجزات و خوارق کے متعلق علم، قانون اور ضابطہ کا فیصلہ معلوم کرنا چاہو گے تو ان کی زبان حال سے جس کو ہر صاحب علم و نظر سمجھتا ہے، یہی جواب ملے گا کہ معجزات و خوارق کا تعلق فنی و عملی موضوعات سے نہیں ہے، اس لئے وہ ان کے بارہ میں کوئی متعین حکم نہیں لگا سکتے بلکہ خارق عادات چیزوں کے ظہور کے بعد ہی وہ بحث و تجزیہ کا موضوع بن سکتے ہیں۔

براق، اسراء اور معراج

کارادافو (Carradevaw) کہتے ہیں، براق کا لفظ جو برق کے لفظ سے متصل اور جڑا ہوا ہے، افسانوں اور قصوں میں ایک عجیب شکل و صورت کے اس انوکھے اور بے بنیاد جانور کے لئے آیا ہے، جس پر رسول اللہؐ معراج کی شب میں سوار ہوئے تھے۔

احمد محمود شاکر اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسراء و معراج کی حدیثوں میں اس کی صراحت ہے کہ آنحضرت صلعم کو رات میں لے جانے کے لئے ایک چوپایہ لایا گیا تھا، جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا اور اس کا رنگ سفید اور رفتار بہت تیز تھی، محدثین اور علمائے فن کے نزدیک ان حدیثوں کی صحت میں کوئی کلام نہیں بلکہ یہ متواتر اور قطعی الثبوت ہیں، ان کو مفسرین کے اقوال قرار دینا غلط ہے، مقالہ نگار کو تعبیر و بیان کا یہ طریقہ اور ایسے نامناسب الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے تھا، مسلمانوں کے علما کے نزدیک جو چیزیں تواتر سے ثابت ہوں ان کا صحیح اور یقینی ہونا شک و شبہ سے بالاتر ہوتا ہے، ان کی نوعیت اساطیر اور افسانوں جیسی نہیں ہوتی اور حقیقت براق کا تعلق ان غیبی امور سے ہے جن کی آنحضرتؐ نے خبر دی ہے اور جو ماوراء مادہ ہونے کی وجہ سے آدمی کے احساس اور گرفت میں نہیں آسکتے ہیں، اس زمانہ میں فلکیات سے متعلق جو علمی انکشافات ہوئے ان کی حقیقت اس سے پہلے غیر معلوم تھی۔

مقالہ نگار نے اسراء و معراج کو آنحضرتؐ کا خواب کہا ہے، لیکن صحیح و صریح متواتر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالم خواب کا واقعہ نہ تھا، بلکہ روح و جسم کی بیداری کی حالت میں پیش آیا تھا، اس کی اسی خصوصیت و اعجاز کے قریش منکر تھے، انھوں نے اس سلسلہ میں بعض مسلمان اہل قلم کا

حوالہ بھی دیا ہے، جن کا یہ خیال ہے کہ معراج روحانی تھی، ان لوگوں کو حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے وہم ہوا ہے کہ "معراج کی شب آپؐ کا جسم مبارک اپنی جگہ پر موجود تھا۔" مگر یہ بے اصل جھوٹی اور گڑھی ہوئی روایت ہے، اس کی سندیں درست نہیں ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی رخصتی مدینہ میں ہوئی جب کہ اسرا کا واقعہ ہجرت سے پہلے مکہ میں پیش آیا تھا۔(۱)

مستشرقین کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار و عدم تصدیق کی یہ ایک مثال تھی، یہ عجیب بات ہے کہ وہ حضرت موسیٰ اور دوسرے نبیوں کے خوارق و معجزات کو تو تسلیم کرتے ہیں، مگر آنحضرتؐ کے اسی قسم کے معجزات کو مستبعد قرار دیتے ہیں اور انھیں افسانہ اور خرافات شمار کرتے ہیں اعتدال پسند مستشرقین ڈینہ، بوڈلی اور کارلائل وغیرہ کا حال یہ ہے کہ وہ آپؐ کے دوسرے معجزات کو نظر انداز کر کے صرف معجزۂ قرآنی سے آپؐ کی نبوت پر استدلال کرتے ہیں، کیونکہ یہی آپ کا دائمی فکری معجزہ ہے، اسے تعریف و توصیف کے پیرایہ میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ محمدؐ نے اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ ان کی ملائکہ سے بات چیت ہوئی یا عجائب و غرائب کا ان سے صدور ہوا، اور طبعی قوانین کے خلاف خرق عادت چیزیں ظاہر ہوئیں بلکہ یہ فرمایا کہ "میں تم ہی لوگوں جیسا ایک آدمی ہوں۔" ان لوگوں کا مقصد جو بھی ہو مگر اس سے غرض پسند مستشرقین کے لئے انکار نبوت کا مواد فراہم ہوتا ہے، اور معتدل مستشرقین کو بھی آپؐ کی اہمیت کو کم کرنے اور آپؐ کی ذات کو نکتہ چینی کا نشانہ بنانے کا موقع ملتا ہے۔ چونکہ رسول اللہؐ کے معجزات انشقاقِ قمر (چاند کا ٹکڑے ہونا) حنین جذع (درخت کے تنہ سے آواز نکلنا) تکثیر الطعام (تھوڑے کھانے کا زیادہ ہوجانا) نبع الماء (انگشت مبارک سے پانی کے چشمہ کا جاری ہونا) وغیرہ صحیح حدیثوں سے ثابت ہیں بلکہ ان میں سے بعض معجزات کے طرقِ اسناد حد تواتر کو پہنچے ہوئے ہیں، اس لئے مستشرقین کے انھیں نظر انداز کرنے اور نہ کرنے سے نہ تو کسی مسلمان کا ایمان ہی ڈگمگا سکتا ہے اور نہ انسانی عقل ان کے وقوع کو محال خیال کر سکتی ہے، موجودہ تاریخی حقائق نے بھی آپؐ کے بعض معجزات کے ثبوت مہیا کر دیے ہیں

(۱) اس میں شبہ نہیں کہ جمہور کا وہی نقطۂ نظر ہے جس کی فاضل مصنف نے ترجمانی کی ہے، مگر محققین اور علمائے حق کی ایک جماعت کی رائے وہی ہے جو حضرت عائشہؓ کے علاوہ بعض دیگر صحابہؓ سے بھی منقول ہے، سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں اس پر سیر حاصل بحث موجود ہے، آخر میں مصنف سیرت بھی جمہور کے مسلک ہی کو صحیح سمجھنے لگے تھے مگر دوسرے قول کو سراسر بے اصل قرار دینا بھی درست نہیں ہے، علاوہ ازیں معراج جسمانی ہوئی ہو یا روحانی، دونوں صورتوں میں اس کا معجزہ اور خارق عادات ہونا ظاہر ہے۔ (مترجم)

چنانچہ سائنس کے جدید انکشافات کے بعد چاند کے ٹکڑے ہوجانے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔
اینا ڈینہ لکھتے ہیں کہ تمام مذاہب کے علمبرداروں میں صرف پیغمبر اسلامؐ ہی وہ واحد شخص ہیں جن کی رسالت کا ثبوت معجزات کا محتاج نہیں ہے، آپ کی نبوت کی سب سے بڑی دلیل خود قرآن مجید کی بلاغت ہے، قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات میں اس کی جانب یوں اشارہ کیا گیا ہے:

وَمَا مَنَعْنَا اَنْ نُرْسِلَ بِالْاٰیَاتِ اِلَّا اَنْ کَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ (اسراء-۵۹)

اور ہم نے نشانیاں بھیجنی اس لئے موقوف کر دیں کہ اگلے لوگوں نے ان کی تکذیب کی تھی۔

ڈینہ کا مقصد رینان کی تردید ہے، جو حضرت عیسیٰ کی مدح و منقبت کے ثبوت میں ان کے معجزات کو پیش کر کے کہتا ہے کہ اس طرح کے معجزات دوسرے انبیاء سے ظہور میں نہیں آئے، وہ معجزات کو اس لئے محال قرار دیتا ہے کہ وہ تاریخ و علم النفس کے اصول و قواعد کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس کی اس رائے سے عقلی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے بعض مسلمان محققین بھی متاثر نظر آتے ہیں، عقاد کا بیان ہے کہ مخالفین کو دعوت دینے میں نبی کے لئے خوارق مفید نہیں ہوتے کیونکہ وہ لوگ تو معجزہ کو سحر و شعبدہ یا مدہوشی اور دیوانگی کا نتیجہ سمجھتے ہیں، خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اور اس کے ذریعہ سے انبیاء کے لئے چاہے آسمان کا دروازہ ہی کیوں نہ کھل جائے۔ رسالت و نبوت کی اس سے بڑھ کر اور کیا کرامت ہوگی کہ قرآن میں اس کی تو تاکید پر تاکید کی گئی ہے کہ آسمانی رسالت لوگوں کی عقل و ضمیر کی رہنمائی کے لئے ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک بنائی گئی ہے، مگر نبوت پر ہر قسم کے اعتراضات و اوہام کے باوجود اس کی صحت کو خوارق یا اخبار غیب سے مشروط نہیں کیا گیا ہے، فرمایا:

وَیَقُوْلُوْنَ لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ (یونس-۲۰)

اور کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نازل نہیں ہوئی؟ کہہ دو کہ غیب کا علم اللہ ہی کو ہے سو تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

وہ اس مفہوم کی مزید آیتیں نقل کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ علم غیب سے صرف اللہ ہی کو واقفیت ہوتی ہے۔ مگر اس مسئلہ کا معجزات سے کوئی تعلق نہیں، قدیم علمائے اسلام اور جدید کے

فضلاء نے معجزہ کی حقیقت اور تمام انبیاءؑ کے لئے اس کے ثبوت وامکان کے مسئلہ کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے، پس اسلام کی رو سے معجزہ کا ثبوت درست اور مسلم ہے، یہ اس خارق عادت امر کا نام ہے جو انبیاء مرسلین سے ان کی نبوت کی صحت وصداقت ظاہر کرنے کے لئے صادر ہوتا ہے، پس معجزات کے اندر کوئی ایسی بات نہیں ہے جو مادی علوم کے منافی ہو، مگر انسان عقل وادراک کے ناقص ومحدود ہونے کی بنا پر ان اسباب ومقاصد سے واقف نہیں ہوتا جن کے لئے یہ رونما ہوتے ہیں، مسلمانوں کا ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اسباب وعلل اور اصول وقوانین کا صانع ہے۔ اس لئے وہ ان کو تبدیل کر دینے اور انبیاءؑ کے ذریعہ مقتضائے عادت کے خلاف چیزیں ظاہر کر دینے پر بھی قادر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے اہم اور عظیم الشان معجزہ قرآن مجید ہے، یہ ابد تک قائم وباقی رہے گا اور اس اعتبار سے وہ دوسرے انبیاءؑ کے معجزات سے ممتاز ہے، اور اس کے ماضی، حال اور مستقبل کے حقائق سے دائمی مطابق ہونے کی مثال دی جاتی رہے گی۔

شارع کی حیثیت سے نبیؐ پر اعتراضات

مستشرقین نے ان شرعی احکام وقوانین پر بھی اعتراضات کئے ہیں جن کی نبی اکرمؐ نے دعوت دی ہے جیسے اسلامی عبادات، معاملات، جہاد اور شریعت کے حکم واسرار وغیرہ، اختصار کی وجہ سے چند ہی مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ا۔ حج۔ ڈرمنگھم اپنی کتاب حیات محمدؐ میں لکھتا ہے: قریش عہد جاہلیت میں حج کے جو مراسم ومناسک اختیار کئے ہوئے تھے، آنحضرتؐ نے اہل مدینہ کی امید وتوقع کے برخلاف ان ہی کو جاری وباقی رکھا کیونکہ آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ اس کی وجہ سے قریش اسلام کی جانب راغب ہو جائیں گے اور بہ تدریج ان چیزوں کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے جو روحانی بلندی کی موجب اور کتاب مقدس کی تعلیم وہدایت کے مطابق ہیں۔

اس شبہ کی تہہ میں متعدد اور شبہات بھی پنہاں ہیں، چونکہ فاضل مستشرق نے حج کے اعمال ومناسک کو آپ کی جانب منسوب کیا ہے، اس لئے ہمیں اس پر ردوکد کی ضرورت پیش آئی۔ اس کا تحلیل وتجزیہ کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(الف) ڈرمنگھم یہ لکھ کر قارئین کو باور کرانا چاہتا ہے کہ حج کے اعمال ومناسک خود نبیؐ کے وضع کئے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپؐ نے قریش کو اسلام سے قریب کرنے کے لئے ان کی خاطر داری ودلجوئی کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ مگر فاضل مستشرقین کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام کے احکام ومسائل سرے سے کسی نبی یا رسول کی خواہش پر مبنی نہیں ہوتے، ان کی اصل نوعیت تو یہ ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (نجم-۴)	یہ تو وحی (حکم خداوندی) ہے جو (ان کی طرف) بھیجی جاتی ہے۔

جس نبی کی صداقت، امانت اور پیغام حق کو بے کم و کاست پہنچانے کی مسلمہ شہادتیں موجود ہیں وہ بھلا اس قدر پست سطح پر کیسے اتر سکتا ہے کہ سیاسی قیادت کی ہوس کرے اور حق کے اصول و مبادی سے دستبردار ہو جانے اور ان کے بارہ میں بھاؤ تاؤ کرنے کا خیال بھی اپنے دل میں لائے، چاہے یہ ڈرمنگھم ہوں یا کوئی اور مستشرق، جب یہ لوگ یہ اور اسی طرح کے دوسرے دعوے کرتے ہیں تو ان کی دلیلیں کیوں نہیں پیش کرتے، اس کے بغیر کون ان کی باتوں سے مطمئن ہو سکتا ہے۔

(ب) ڈرمنگھم کا مقصد یہ ثابت کرنا بھی ہے کہ حج کے اعمال و مناسک ملت ابراہیمی کی یادگار نہیں ہیں بلکہ ان میں قریش کے حج کی نقل و متابعت کی گئی ہے، لیکن یہ دعویٰ بھی بلا دلیل ہے اور شریعت محمدی سے اس کے برعکس ثبوت ملتا ہے، صحیح مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی وغیرہ میں ایک حدیث منقول ہے، جس کے متن کا خلاصہ امام مسلم کی روایت کے مطابق یہ ہے۔

عن جعفر بن محمد عن ابيه قال دخلنا على جابر بن عبد الله فسأل عن القوم حتى انتهى الى فقلت انا محمد بن على بن حسين فاهوى بيده الى راسى فقلت اخبرني عن حجة رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال بيده فعقد تسعا فلما كان يوم التروية توجهوا الى منى فاهلوا بالحج وركب رسول الله صلى الله عليه وسلم فصلى بها الظهر والعصر والمغرب والعشاء والفجر ثم مكث قليلا حتى	جعفر بن محمد (امام جعفر صادق) اپنے والد محمد بن علی (امام باقر) سے روایت کرتے ہیں کہ ہم چند لوگ جابر بن عبداللہ کے پاس گئے، انھوں نے دریافت کیا کہ آپ لوگ کون ہیں (سب نے اپنا تعارف کرایا) یہاں تک کہ جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ میں محمد بن علی بن حسن ہوں، چنانچہ انھوں نے اپنا دست شفقت میرے سر پر رکھا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے رسول اللہؐ کے حجۃ الوداع کے بارہ میں بتائیے! انھوں نے ہاتھ کی انگلیوں سے نو کی گنتی کا اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: جب یوم الترویہ

طلعت الشمس وامر بقبة من شعر تضرب له بنمرة فسار رسول الله صلی الله علیه وسلم ولاتشک قریش الا انه واقف عند المشعر الحرام کما کانت قریش تصنع فی الجاهلیة فاجاز رسول الله صلی الله علیه وسلم حتی اتی عرفة فوجد القبة قد ضربت له بنمرة فنزل بها حتی اذا زاغت الشمس امر بالقصواء فرحلت له فاتی بطن الوادی فخطب الناس.

(صحیح مسلم بشرح النووی-ج۸ص۱۸۱)

(۸رذی الحجہ) ہواتو سب لوگ منی کے لئے روانہ ہوئے (اور جو عمرہ کر کے احرام ختم کر چکے تھے) انھوں نے حج کا احرام باندھااور رسول اللہ اونٹنی پر سوار ہوکر منی چلے اور وہاں آپ نے ظہر، عصر، مغرب عشا اور فجر کی نماز ادا کی، فجر بعد تھوڑی دیر آپؐ اور ٹھہرے، یہاں تک کہ جب سورج نکل آیا (تو آپؐ عرفات کو روانہ ہوئے) آپؐ نے حکم دیا تھا کہ صوف کا بنا ہوا خیمہ آپ کے لئے نمرہ میں نصب کیا جائے، قریش کو اس میں شک نہ تھا کہ آپ مشعر حرام کے پاس قیام کریں گے کیونکہ وہ زمانہ جاہلیت میں ایسا ہی کرتے تھے، مگر آپؐ (ان کے علی الرغم) مشعر حرام سے آگے بڑھ کر عرفہ پہنچ گئے اور نمرہ میں جو خیمہ آپ کی ہدایت کے مطابق نصب کیا گیا تھا آپؐ اسی میں اتر گئے۔ یہاں تک کہ جب آفتاب ڈھل گیا تو آپؐ نے اپنی اونٹنی قصوا پر کجاوا کسنے کا حکم دیا، جب کجادا کسنے کے بعد وہ لائی گئی تو آپؐ اس پر سوار ہو کر وادی کے درمیان آئے اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیا۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بھی حج کے اندر ایسی جو باتیں داخل کر لی گئی تھیں جن کا ملت ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس حدیث میں ان کو باطل قرار دیا گیا ہے

چنانچہ قریش عہد جاہلیت میں بیت اللہ کے مجاور و متولی ہونے کی بنا پر حدود حرم سے باہر نہیں نکلتے تھے، بلکہ اس کے حدود کے اندر مزدلفہ کے علاقہ میں مشعر حرام کی پہاڑی قزح کے پاس ہی وقوف کرتے تھے اور اسے اپنا خاص امتیاز سمجھتے تھے، ان کو یقین کامل تھا کہ رسول اللہ بھی ان کے اسی خاندانی دستور کے مطابق مشعر حرام ہی کے پاس وقوف کریں گے اور وہاں سے آگے نہیں بڑھیں گے۔لیکن چونکہ ان کا یہ طریقہ غلط اور ملتِ ابراہیمی کے خلاف تھا اس لئے آپؐ نے آگے بڑھ کر عرفہ اور وادی نمرہ میں حدود حرم سے باہر قیام کیا جس کی ہدایت آپؐ کو اس آیت میں دی گئی تھی:

ثُمَّ اَفِیۡضُوۡا مِنۡ حَیۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ (بقرہ-۱۹۹) پھر تم لوگ (قریش) بھی وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلیں۔

یعنی جس طرح تمام لوگ حدود حرم سے باہر عرفہ تک جاتے ہیں وہیں آپؐ اور آپ کے اہل خاندان بھی قیام کریں، اس میں قریش کو کوئی امتیاز اور خصوصیت حاصل نہیں ہے۔

۲-حج کے سلسلہ میں مستشرقین کا دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ اس میں بت پرستی کا شائبہ اور سامی قبائل کی رسموں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

(الف) مستشرقین اپنے پہلے دعویٰ کے ثبوت میں رمی جمرات (کنکریاں مارنے) کو پیش کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ یہ رسم بت پرستی سے ماخوذ اور اسی کی یادگار ہے، اسی لئے قرآن مجید میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے، صرف سیرت کی کتابوں اور حدیثوں ہی میں اس کا ذکر ملتا ہے، اسلام سے قبل جمرات کے پاس خون سے رنگے ہوئے چند پتھر رکھے رہتے تھے اور یہیں قربانی کی جاتی تھی۔

احمد محمد شاکر مرحوم اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: رمی جمرات بت پرستی کی علامت اور یادگار نہیں ہے، بلکہ حج کے شعائر اور دین ابراہیمی کی قدیم یادگاروں میں ہے۔عربوں میں اس کی بعض چیزیں وراثۃً چلی آرہی تھیں، مگر اکثر چیزوں میں انھوں نے تحریف و تغیر کر ڈالا تھا، اسلام نے حج کے تمام شعائر کو خدائے واحد کی خالص عبادت کے لئے مخصوص کر دیا، وہ توحید اور خدا پرستی کا دین ہے، رسول اللہ کی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز رہتی تھی کہ مسلمانوں کے اعمال، اقوال، عقائد اور عبادات میں شرک کا کوئی شائبہ بھی نہ آنے پائے۔

(ب) احرام۔ دوسرے دعویٰ کے سلسلہ میں مستشرقین کا خیال ہے کہ احرام کے لئے غسل کرنا اور خضاب اور خوشبو لگانا بھی ایسی رسم و یادگار ہے جس کا سلسلہ ان عبادتوں اور دعاؤں سے جا ملتا

ہے جو قدیم زمانہ میں شیاطین کو بھگانے اور دور کرنے کے لئے کی جاتی تھیں، اسی طرح احرام کا کپڑا قدیم سامی لوگوں کے یہاں بھی بہت مقدس سمجھا جاتا تھا، کاہنوں اور زاہدوں کی چادریں بھی اسی وجہ سے سفید ہوتی تھیں، نیز بعض دینی رسمیں انجام دینے کے وقت جسم کی جانب توجہ نہ کرنا سامی قبائل کی معروف عادت تھی۔

اس سلسلہ میں بھی وہی جواب مناسب ہے جو اوپر گذر چکا ہے، مزید وضاحت کے لئے یہ بتانا کافی ہوگا کہ اسلام خدا کی شریعت اور قانون کا نام ہے، یہ اپنے تشخص، امتیاز اور جداگانہ خصوصیات کی بنا پر دوسرے تمام شرائع وقوانین سے بالکل مختلف وممتاز ہے۔ اس پر کسی اور مذہب و شریعت کی کوئی چھاپ نہیں ہے، اگر کوئی اسلامی عبادت کسی قدیم عمل کے مشابہ ہے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کا تعلق بھی آسمانی والہامی شریعت سے ہوگا، اسلام کسی الٰہی قانون اور اسلامی عبادات کو برقرار رکھنے میں مزاحمت نہیں کرتا کیونکہ اس طرح کی عبادت فطرت انسانی کے بالکل مطابق ہوتی ہے، غسل، خضاب اور سفید کپڑا پہننا وغیرہ بھی عین فطرت کے مطابق ہیں، اسلام کسی چیز کو اس وقت تک ناگوار اور معیوب نہیں قرار دیتا جب تک کہ وہ توحید خالص کے تصور کے منافی نہ ہو، غرض حج کے اعمال ومناسک کو بت پرستی کی علامت قرار دینا یا سامی قبائل کی یادگار بنانا مستشرقین کا ایسا فرضی دعوی ہے، جس کی تائید کسی قابل اعتماد تاریخی دلیل سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس حج کے تمام اعمال کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کی عبادتوں سے جڑا ہوا ہے، سامی قبائل کی جسم کی جانب سے اہمال وغفلت کی مشہور رسم کو اسلام نے نہ حج کے اندر باقی رکھا ہے اور نہ حج کے باہر، رہے وضو، غسل اور طہارت تو یہ مسلمانوں کی ہمہ وقتی عبادتوں کا خاص جز ہیں۔

(ج) جہاد۔ مستشرقین کے نزدیک جہاد قتل وخوں ریزی اور دوسری قوموں کو زیر اور مغلوب کرنے کا نام ہے، وہ اس کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشاعت میں اس کی سونتی ہوئی تلوار ہی کا حصہ ہے۔ اسلام نے عام مذاہب کے برخلاف دنیا کو اس قدر حیرت انگیز سرعت سے جو بیخ وبن سے اکھاڑ دیا تو اس کا راز بھی اس کے تشدد وطاقت ہی میں پنہاں ہے، اس طرح اسلام اور دوسروں کو موت کے گھاٹ اتار دینے میں وہی تعلق ہے جو ایک جڑ سے نکلنے والے دو درختوں میں ہوتا ہے کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے، اسی لئے تخریب، ہلاکت، وحشت، بربریت، خوں ریزی اور سفاکی ہی اسلام کے برگ وبار ہیں اور جبر، استبداد اور لوگوں کو زبردستی حلقۂ اسلام میں داخل کرنا اس کا شیوہ ہے۔

جہاد کے خلاف مستشرقین کی ان چند ہی ہرزہ سرائیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعوت الی اللہ بہترین حکمت و موعظت کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت، اسلامی حقائق پر لوگوں کا انشراح، متعدد قبائل کا رضا و رغبت سے اسلام قبول کرنا اسلام کا عقیدہ و فکر کی آزادی کا اعلان، کلمہ پیش کر کے اسلام کی تلقین وغیرہ کے واقعات نہ کبھی پیش آئے اور نہ اسلام نے اپنی دعوت و تبلیغ کا کبھی یہ انداز ہی اختیار کیا۔

میکڈونالڈ لکھتا ہے: ''تلوار کے ذریعہ اسلام کی نشر و اشاعت سارے مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔'' جہاد کے مفہوم کی اس تحریف کے بعد اس نے جو نتیجے اخذ کئے ہیں وہ سب بھی نہایت بے بنیاد اور سراسر غلط ہیں، مثلاً پڑوسی قوموں کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے رسول اللہؐ نے جو خطوط لکھے یا ان کے پاس جو وفود اور سفرا بھیجے، اس کا مقصد فاضل مستشرق کے نزدیک کشور کشائی اور ان قوموں کو سرنگوں اور مغلوب کرنا تھا، حالانکہ اگر کوئی انصاف پسند قرآن و اسلام کے مقصد و روح کو واقعی سمجھے اور رسول اللہ کی سنت و سیرت مبارکہ کا مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اسلامی جہاد ایک ایسا دقیق قانون ہے جو نہ تو جلدی اور روا روی میں تیار ہوا ہے اور نہ عدم غور و فکر کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے، بلکہ یہ خدا کی طرف سے وحی کردہ ہے۔ اور اس کا منشا یہ ہے کہ اسلام ساری انسانیت کا دین بن جائے اور اسے تمام مذہبوں پر برتری و بالا دستی حاصل ہو جائے۔ یہ خدا کا وعدہ ہے جو پورا ہوگا۔

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ	اور تم کو اس کا حال ایک وقت کے بعد
(ص-۸۸)	معلوم ہو جائے گا۔

مستشرقین اور عیسائی مبلغین نے اسلامی جہاد کی جو تعبیر کی ہے اس سے اسلامی فتوحات اور جہاد کے اصل اسلامی اغراض و مقاصد کا حلیہ ہی بگڑ گیا ہے، کرین کا بیان ہے کہ فریضۂ جہاد کی بنا پر کسی شخص کو بھی اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور کیا جا سکتا ہے، حالانکہ یہ نہ اسلام کا اصول ہے اور نہ علمائے اسلام نے اس کی کہیں صراحت کی ہے۔ مسلمانوں کے یہاں محض جنگ و قتال ہی جہاد کی صورت نہیں ہے، بلکہ کلمہ کی تلقین و دعوت اور علم کی طلب و اشاعت کا نام بھی جہاد ہے۔ اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ بھی جہاد ہے، نیز نفس اور اس کی خواہشات سے بھی جہاد کیا جاتا ہے، یہ سب صورتیں بھی جہاد کے مفہوم میں داخل ہیں اور بہت مشہور ہیں۔

۴- اسلام صرف وعظ و پند کی دعوت ہے

کہاں تو یہ اعتراض تھا کہ اسلام قتل و

خوں ریزی کا مذہب ہے، اور کہاں اس کے بالکل برعکس یہ کہا جاتا ہے کہ جہاد کا حکم تو صرف نبی کی زندگی ہی تک کے لئے تھا، اور اب اس کا کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا، ان لوگوں کی نظر میں اسلام صرف پند، موعظت، رہبانیت اور درویشی کا نام ہے اور بعض مستشرقین کے نزدیک جہاد کی حیثیت دفاعی ہے، اسلام قتال کی اسی وقت اجازت دیتا ہے جب خود اس کو برباد کرنے کے لئے اس پر حملہ کیا جائے، مستشرقین کے اس پروپگنڈا کا یہ اثر ہوا کہ خود مسلمانوں نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرلیا ہے اور بقول مولانا مودودی اپنی اس طرح صفائی دینا شروع کیا ہے کہ

''حضور! بھلا ہم جنگ وقتال کیا جانیں؟ ہم تو بھکشوؤں اور پادریوں کی طرح پرامن مبلغ لوگ ہیں، چند مذہبی عقائد کی تردید کرنا اور ان کی جگہ کچھ دوسرے عقائد لوگوں سے تسلیم کرالینا، بس یہ ہمارا کام ہے، ہمیں تلوار سے کیا واسطہ؟ البتہ اتنا قصور کبھی کبھار ہم سے ضرور ہوا ہے کہ جب کوئی ہمیں مارنے آیا تو ہم نے بھی جواب میں ہاتھ اٹھادیا، سو اب ہم تو اس سے بھی توبہ کرچکے ہیں، حضور کی طمانیت کے لئے تلوار والے جہاد کو سرکاری طور پر منسوخ کردیا گیا ہے، اب تو جہاد فقط زبان وقلم کی کوشش کا نام ہے۔''

اس پروپگنڈہ سے برطانوی استعمار کو ہندوستان پر اپنا تسلط جمائے رکھنے میں بڑی مدد ملی، اس سلسلہ میں ان کو قادیانیوں سے بھی خوب سہارا ملا جو جہاد بالسیف کو موجودہ زمانہ میں باطل قرار دے کر انگریزوں کے معاون اور پشت پناہ بن گئے تھے۔

مشہور مستشرقین اور ان کی تصنیفات

(جائزہ اور تعارف)

مولانا سلمان شمسی ندوی

مستشرقین نے اپنی مہم کو چلانے اور اپنی تحقیقات کی اشاعت کے لئے ہر ممکن وسیلہ کو اختیار کیا، جن میں سے چند کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) اسلام سے متعلق مختلف موضوعات پر کتابوں کی تالیف، جن میں اسلامی نقطۂ نظر، قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو موضوع بنایا جاتا ہے، جن میں سے اکثر نصوص ومتون کی تحریفات پر مشتمل ہوتی ہیں۔

(۲) رسائل ومجلات کی اشاعت، جس میں اسلام اور بلادِ عربیہ کے مسائل پر بحث ہوتی ہے۔

(۳) عالم اسلام میں مشنریوں کا قیام، جو بظاہر انسانی خدمت اور گرام سدھار کے نام پر کام انجام دیتی ہیں، لیکن ساتھ ہی پُر خطر اور دور رس نتائج لوگوں کے دلوں میں چھوڑ جاتی ہیں ان خدمات کے تحت اسپتال، ڈسپنسریوں، یونین، کالج، یتیم خانوں اور مہمان خانوں کا بہت سے مقامات پر پورا انتظام موجود ہے، اس کے علاوہ مسیحی نوجوانوں کی بہت سی انجمنیں عالم اسلام میں قائم ہو چکی ہیں۔

(۴) یونیورسٹیوں اور علمی سیمناروں میں محاضرات ومقالات کے اجتماعات کا انتظام ہے، اس سلسلہ میں قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اسلامی ملکوں کی یونیورسٹیوں اور سیمناروں میں انھیں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے، چنانچہ قاہرہ، دمشق، رباط، کراچی اور علی گڑھ کے علمی مراکز میں انھیں اظہارِ خیال کا پوری آزادی سے موقع ملتا ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنے افکار وخیالات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔

(۵) انھوں نے اپنے قلم کے زور سے اسلامی ملکوں کی صحافت اور وہاں سے نکلنے والے جرائد و اخبارات کی بڑی تعداد کو خرید لیا ہے، ڈاکٹر مصطفےٰ فرخ اور ڈاکٹر مصطفےٰ خالدی کی مشترکہ کتاب ''التبشیر والاستعمار'' جسے استشراق کے سلسلہ میں بڑے مرجع یا (Sourse) کا درجہ حاصل ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''مسیحی کارکنوں نے مصر کی صحافت سے خاص طور سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا، اس کے ذریعہ انھیں عیسائی نظریات کی اشاعت میں جس قدر مدد ملی، وہ شاید ہی کسی دوسرے ملک میں مل سکی ہو، ان کے بے شمار مضامین مصر سے نکلنے والے رسائل میں شائع ہوتے ہیں، جن میں سے اکثر اجرت کے ساتھ اور بہت کم اعزازی طور پر چھپتے ہیں۔''

(۶) اپنے ذہنی خاکوں کو عملی شکل دینے کے لئے کانفرنسوں کا انعقاد ہوتا ہے، جن میں بظاہر صرف عام عناوین سے بحث کی جاتی ہے، یہ کانفرنسیں ۱۷۸۳ء سے لے کر اب تک مسلسل منعقد ہوتی رہی ہیں۔

(۷) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (Encyclopedia of Islam) کی اشاعت، جو ''دائرۃ المعارف'' کے نام سے مختلف زبانوں میں شائع ہوتی ہے، اور اس کے جدید ایڈیشن برابر شائع ہوتے رہتے ہیں، عربی میں اس کا سب سے پہلا ترجمہ ۱۹۵۶ء میں ہوا، جس کی اب تک ۱۴ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، ان مستشرقین نے اس کتاب میں اسلام کے نام پر زہر گھول کر خرافات و اباطیل کا ذخیرہ جمع کیا ہے، اور افسوس ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے نزدیک اس کتاب کو ماخذ (Sourse) کی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے، اور اس کو کتاب الحوالہ (Reference Books) سمجھا جانے لگا ہے، جو اسلامی ثقافت سے ناواقفیت کی دلیل ہے، یہ مستشرقین کے مقاصد و وسائل کا مختصر سا جائزہ تھا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں مشہور مستشرقین، ان کی اہم تصنیفات اور رسائل کا ذکر بھی کر دیا جائے، جو سامراجی ملکوں میں ان کی زیر نگرانی شائع ہوتے رہے ہیں۔

صحافت ورسائل:

(الف) ۱۸۸۷ء میں فرانسیسیوں نے مستشرقین کی ایک انجمن قائم کی، ان کے ماتحت آسیویہ کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔

(ب) ۱۸۸۳ء میں لندن میں علوم شرقیہ (Orintial Studies) کی ہمت افزائی کی

غرض سے ایک انجمن قائم ہوئی، اس کے زیر نگرانی رسالہ "مجلة الجمعية الاسبوية الملكية" شائع ہوا، اس صدی میں امریکی مستشرقین کے زیر اہتمام نکلنے والے رسائل میں "مجلة الدراسات الشرقية" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، یہ صوبہ OHIO کے شہر Combier سے شائع ہوتا تھا، اور اس کے مختلف ایڈیشن روس، لندن اور دوسرے مقامات سے شائع ہوتے تھے، معلوم نہیں اس وقت اس نام سے شائع ہوتا ہے یا کسی دوسرے نام سے، اس پر سیاسی سامراج کی پوری چھاپ تھی۔

(ہ) اس وقت امریکی مستشرقین کے قلم سے نکلنے والے رسائل میں مشہور یہ ہیں: (The Islamic world affairs) "مجلہ شئون الشرق الاوسط" جو بڑی حد تک سیاست سے متاثر ہے۔

(و) سب سے خطرناک رسائل وہ ہیں جو امریکی مشنریاں نکال رہی ہیں، ان میں "صموئیل زویمر" (S.Zwenier) کے زیر ادارت نکلنے والا رسالہ "العالم الاسلامی" (The Muslim World) خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، یہ رسالہ ۱۹۱۱ء میں پہلی بار نکلا، اور اب بھی (Harl Forse) امریکہ سے شائع ہوتا ہے، حال میں اس کے مدیر اعلیٰ کینٹ کراج (K. Cragg) تھے۔

(ز) اسی سے ملتا جلتا ہوا رسالہ (Le Mede Muslmalmane) ہے، جو ایک فرانسیسی مستشرق کے زیر نگرانی نکلتا ہے۔

مشہور مستشرقین اور ان کی تصنیفات:

اے۔ جے۔ آربرے A.J.Arberry مشہور انگریز مستشرق ہے، اس کی اسلام دشمنی ضرب المثل ہے۔ اسلامک انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین میں ہے، آج کل کیمبرج یونیورسٹی کا پروفیسر ہے، وہ ہمارے معاصر مصری فاضلوں کا استاد رہ چکا ہے، اس کی مشہور ترین کتابیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ الاسلام واليوم — ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔
۲۔ مقدمة لتاريخ التصوف — ۱۹۴۲ء " " "
۳۔ التصوف — ۱۹۵۰ء " " "
۴۔ ترجمة القرآن — ۱۹۵۰ء " " "

الفرڈ جیوم A.Geom ہم عصر انگریز ہے، تعصب اس کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہے، لندن یونیورسٹی میں لیکچرار ہے، اس کی تحریر میں مشنری روح کا غلبہ ہے، اس کی تصنیفات میں معرکۃ الآراء کتاب "الاسلام" ہے، مصری حکومت نے بہت سے نوجوانوں کو مشرقی زبانوں کی

تحقیقات کے لئے اس کے پاس بھیجا ہے۔

بارون کیرازی فو Baron Carra De Roun فرانسیسی مستشرق ہے، اسلامک انسائیکلو پیڈیا کے مرتبین میں اس کا نام اہم ترین ہے۔

ایچ۔اے۔آر۔گب H.A.R.Gibb انگلینڈ کا ہم عصر مستشرق ہے، مصر کی لینگویج اکیڈمی کا ممبر رہا ہے، آج کل امریکہ میں اسلامیات کا پروفیسر ہے، دائرۃ المعارف کے مرتبین میں یہ بھی ہے، اس کی اہم تصنیفات یہ ہیں:

۱۔طریق الاسلام : ۱۹۴۶ء میں پہلی بار شائع ہوئی، اس کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اس کا عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

۲۔الاتجاهات الحديثة في الاسلام: ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی ہے۔

۳۔المذهب المحمدی : یہ بھی ۱۹۴۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی، اور اب تک مختلف ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

۴۔الاسلام والمجتمع الغربی: اس کی کئی جلدیں ہیں، اس کی تالیف میں دوسرے لوگ بھی شریک ہیں۔

۵۔مجموعۂ مضامین۔

گولڈزیہر Gold Zieher علمی بددیانتی اور اسلام دشمنی کے لئے مشہور ہے، دائرۃ المعارف کی ترتیب میں اس کا بھی حصہ رہا ہے، قرآن مجید اور حدیث پر اس کی تصنیفات ہیں، اس کی کتابوں میں ''تاریخ مذاهب التفسير الاسلامی'' کو خاص شہرت حاصل ہوئی، جس کا ترجمہ عربی میں بھی ہوا ہے۔

جان مائی نارڈ Mynard متعصب امریکی ہے، ''رسالة دراسات الشرقيه'' کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں رہ چکا ہے، اس رسالہ کے مضامین اس کی زہرافشانی کے شاہد ہیں۔

ایس۔ایم۔زویمر S.M.Zwemer مشنری مستشرق ہے، اس لئے اسلام کے ساتھ اس کی دشمنی دوہری ہے۔رسالہ ''العالم الاسلامی'' کا بانی اور کتاب ''الاسلام تحد لعقيدة'' کا مصنف ہے، یہ کتاب ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی، یہ کتاب اس کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو مشنریوں کی کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۷ء کولکھنؤ میں پڑھے گئے تھے، اس کی علمی اور تبلیغی سرگرمیوں کی یاد میں امریکیوں نے ایک اوقاف قائم کیا ہے، جس کے تحت لاہوتی مطالعہ اور مبلغین کی جماعت

تیار ہوتی ہے۔

عزیز عطیہ سوریال مصری مسیحی مستشرق ہے، اسکندریہ کی یونیورسٹی میں استاد رہ چکا ہے، اور اب امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں ہے، اسلامی تعلیمات کی تخریب میں اس کا بڑا حصہ ہے، اس کے لئے اس نے بہت سے وسائل اختیار کئے ہیں، صلیبی جنگوں سے متعلق اس کی بہت سی تصنیفات ہیں۔

جی۔ فون گروبارم G.Von Greev Bourm یہودی النسل جرمن ہے، بعد میں امریکہ میں سکونت اختیار کر لی، اور تدریس کا شغل اختیار کیا، شیکاگو یونیورسٹی میں بھی پروفیسر رہے ہیں، اس کی تصنیفات میں اسلامی اقدار پر اعتراضات کی بوچھار ہوتی ہے، لکھنے میں بڑا ماہر ہے، اس کی مشہور کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱۔ اسلام العصور الوسطی ۱۹۴۶ء میں پہلی بار چھپی۔

۲۔ الاعیان المحمدیہ ۱۹۵۱ء میں چھپی۔

۳۔ محاولات فی شرح الاسلام المعاصر ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔

۴۔ دراسات فی تاریخ الثقافة الاسلامية ۱۹۵۴ء " "

۵۔ الاسلام مختلف مقالات کا مجموعہ ہے۔ ۱۹۵۷ء " "

۶۔ الوحدة والتنوع فی الحضارة الاسلامية ۱۹۵۷ء " "

فیلپ حتی P.H. Hitti لبنانی مسیحی مستشرق ہے، پرنسٹن یونیورسٹی میں پہلے اسلامک اسٹڈیز کے استاد تھے، پھر اس کے ہیڈ ہو گئے، آج کل امریکہ کے وزیر خارجہ کے کاؤنسلر ہیں، ان کی شدید کوشش رہتی ہے کہ انسانی تہذیب کی تشکیل میں اسلام کی کوتاہی ثابت کی جائے، مسلمانوں کی طرف کسی مرتبہ و شرف کی نسبت نہ ہونے پائے۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ مطبوعہ ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۲۹ پر الادب العربی کے مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''عربوں میں ادبی زندگی کی علامتیں پہلے نہ تھیں، ان کا ظہور انیسویں صدی کے اخیر میں ہوا ہے، نئی تحریک کے قائدین کی صفِ اول میں لبنان کے وہ نصاری ہیں، جنھوں نے امریکی مبلغین کی کوششوں سے تعلیم کی منزل طے کر کے نئی روشنی اخذ کی۔''

اس کی ساری کوشش یہ رہی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے علم و فضل کو ناقص قرار دیا جائے

ان کی رائے میں یہ کوتاہی اور کمی عصر جدید ہی میں نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کے ہر مرحلہ میں رہی ہے، ان کی یہ رائے ان کی اپنی تصنیفات میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ان کی بعض کتابیں یہ ہیں:

۱۔تاریخ العرب — اصلاً انگریزی میں ہے، عربی میں بعد میں ترجمہ ہوئی کتاب اسلام اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن واستہزاء سے بھری ہوئی ہے۔

۲۔تاریخ سوریا

۳۔اصل الدروز ودیانتهم ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔

اے۔جے۔وینسنک A.J.Wensink پہلے مصر کی لسانی اکیڈمی کا ممبر تھا، طیب حسن ہواری نے اس کو الگ کرایا، اس کے نزدیک قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے، انھوں نے مذہبی اور فلسفیانہ قدیم کتابوں کا مطالعہ کرکے اس کو لکھا ہے، دیکھئے: ''المستشرقون والاسلام'' ص ۷۱، اس کی دوسری مشہور کتاب عقیدۃ الاسلام ہے جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔

لوی ماسینون L.Massegnon فرانسیسی مستشرق ہے، شمالی افریقہ میں فرانس کی وزارت نوآبادیات کا ایڈوائزر تھا، مصر کے مشنریوں کا روح رواں ہے، اس نے دنیائے اسلام کا کئی بار سفر کیا، مصر کی لسانی اکیڈمی اور دمشق کی المجمع العلمی العربی کا ممبر رہا، فلسفہ وتصوف اس کے امتیازی علوم ہیں۔ اس کی مشہور کتابوں میں الحلاج الصوفی الشهيد في الاسلام ہے، یہ کتاب ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی، اس کے علاوہ اس کے مقالات ومحاضرات کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں، دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگاروں میں ہے، اس کی ترتیب میں اس کا بڑا حصہ ہے۔

ڈی۔بی۔ماکڈونالڈ D.B.Macdonald امریکی مستشرق ہے، یہ بھی دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگاروں میں ہے، اس کی مشہور کتابوں میں 'تطور علم الكلام والنظرية الدستورية في الاسلام'' مطبوعہ ۱۹۰۳ء اور'' الموقف الديني والحياة في الاسلام'' مطبوعہ ۱۹۰۸ء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مجید قدوری عراق کے عیسائی ہیں، واشنگٹن یونیورسٹی میں اورینٹل اسٹڈیز کے ہڈ آف ڈپارٹمنٹ اور مجلس علومِ شرقیہ کے سرگرم رکن ہیں، یہ بھی اسلام کے خاص ناقدوں میں ہیں، ان کی شاہکار کتاب ''الحرب والسلام في الاسلام'' ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی، اس کے علاوہ مطبوعہ

مقالات بھی ہیں۔

ڈی۔ایس۔مارگولیس D.S.Margoliouth نسلاً انگریز، اور انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین میں سے ہیں، مصر و دمشق کی اکیڈمیوں کے ممبر رہے ہیں، ان کی مشہور کتابیں درج ذیل ہیں:

۱۔التطورات المبکرۃ فی الاسلام	مطبوعہ	۱۹۱۳ء
۲۔محمدو مصطلح القرآن	"	۱۹۰۵ء
۳۔الجامعۃ الاسلامۃ	"	۱۹۱۲ء

نیکولسن R.A.Nicholson مشہور انگریز مستشرق ہے، دائرۃ المعارف کا مقالہ نگار ہے، مصر کی لسانی اکیڈمی کا بھی ممبر رہا ہے، اسلامی فلسفہ و تصوف اس کا خاص موضوع ہے، اس کے باوجود اس کو اسلام کے روحانی نظام ہونے سے اتفاق نہیں ہے، اور اس کو وہ سطحی مذہب قرار دیتا ہے۔(۱) متصوفو الاسلام: مطبوعہ ۱۹۱۰ء اور (۲) التاریخ الادب العربی: مطبوعہ ۱۹۳۰ء اس کی مشہور کتابیں ہیں۔

ہنری لامنس فرانسیسی مستشرق اور دائرۃ المعارف کا مقالہ نگار ہے، اس کی اسلام دشمنی مشہور ہے، فرانسیسی میں اس کی دو کتابیں ہیں، ''اسلام'' اور ''طائف''۔

اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مستشرقین کی حسب ذیل کتابیں قابلِ ذکر ہیں، ان میں سے بعض کے نام اوپر آ چکے ہیں:

۱۔حیاۃ محمد رسول اللہ ﷺ	(آرنلڈ ٹوئن بی) A.Ton bee
۲۔الاسلام	(ولیم میور) William muir
۳۔ دین الشیعہ	(الفرڈ گیوم) A.Geom
۴۔ تاریخ شارل الکبیر	(ڈونالسن) D.M.Donolson
۵۔ الاسلام	(ترپن) Bishop Turpin
۶۔ الاسلام تحد لعقیدۃ	(ہنری لامنس) H.Lammens
۷۔ دعوۃ المسذنۃ	(زویمر) S.M.Zwemer
۸۔ الاسلام الیوم	(کینٹ کراج) K.Cragg
۹۔ ترجمۃ القرآن	(اے۔جے۔آربرے) A.J.Arbary
۱۰۔ تاریخ مذاھب التفسیر الاسلامی	(گولڈزیہر) Gold Zieher

۱۱۔ تاریخ العرب	Gold Zieher (گولڈزیہر)
۱۲۔ الیہودیۃفی الاسلام	P.Hitti (فلپ حتی)
۱۳۔ عقیدۃالاسلام	Abraham Kash (ابراہیم کاش)
۱۴۔ الحلاج الصوفی الشہیدفی الاسلام	Wensnik (وینسنک)
۱۵۔ الحرب والاسلام	مجیدقدوری
۱۶۔تطورعلم الکلام والفقہ والنظریۃالدستوریۃ فی الاسلام	L.Massegnon (لوی ماسینون)
۱۷۔ الاتجات الحدیثۃفی الاسلام	Mecdo Nald (میکڈونالڈ)
۱۸۔ طریق السلام	A.R.Gibb (اے۔آر۔گب)
۱۹۔ التصوف فی الاسلام	" "
۲۰۔ مصادرتاریخ القرآن	Nicholson (نیکولسن)
۲۱۔ اصول الاسلام فی البیئۃ المسیحیۃ	Arthur Jeffeiry (آرتھر جیفری)
۲۲۔ مقدمۃ القرآن	R. Bell (آر۔بل)
۲۳۔ التطورات المبکرۃ فی الاسلام	" "
۲۴۔ محمدومصطلح الاسلام	D.S.Marglious (مارگولیس)
۲۵۔ الاسلام	" "
۲۶۔ الجامعۃالاسلامیۃ	" "
۲۷۔ قنطرۃالی الاسلام	" "
۲۸۔ اسلام العصورالوسطی	A. Betmon (اربک بتمان)
۲۹۔ الاسلام	جی۔ون۔گروتیارم
۳۰۔ الاعیاد المحمدیۃ	Von Greeboun "
۳۱۔ الوحدۃوالتنوع فی الحضارۃالاسلامیۃ	" " "
۳۲۔ دراسات فی تاریخ الثقافۃالاسلامیۃ	" " "

مستشرقین کا سب سے بڑا کارنامہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ہے، گو یہ بھی بددیانتی سے خالی نہیں، لیکن اسلامیات کے مطالعہ کے لئے ناگزیر ہے، اس کے اہم مقالہ نگاروں کے نام

حسب ذیل ہیں:

۱۔ ابراہم کاش — الیھودیہ فی الاسلام کا مصنف ہے۔

۲۔ (سی۔سی۔ایڈمز) C.C.Adoms امریکن یونیورسٹی میں استاد رہ چکا ہے۔ الاسلام فی التجدید فی مصر کا مصنف ہے۔

۳۔ (اوردار فرمان) E.Ferman تاریخ المسلمین وفتوحاتھم کا مصنف ہے

۴۔ (ایڈون کیلوری) E.Calverry رسالہ ''العالم الاسلامی'' کے اڈیٹر رہ چکے ہیں، انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب میں بھی حصہ لیا، اور قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی میں استاد رہے۔

۵۔ اریک شرور — انھوں نے ''امت محمد'' کے نام سے ۱۹۵۵ میں کتاب لکھی تھی۔

۶۔ ایلڈر — The Muslim World Elder کے ایڈیٹر ہیں۔

۷۔ (الفرڈ کارلٹن) A.Carlton

۸۔ (ال ایز میرج) L. Eisembeeg

۹۔ (ڈبلو۔ایوانو) W. Iwanow

۱۰۔ (بالنجر) H. Balinger

۱۱۔ (اے۔بالگیرو) A. Bagliaro

۱۲۔ (جے۔بارتھ) J. Barth

۱۳۔ (آر۔پیرٹ) R. Peret

۱۴۔ (آر۔بسٹ) R. Besst

۱۵۔ (بشپ) Bishap

۱۶۔ (سی۔سی۔برگ) C.C. Berg

۱۷۔ (ایچ۔ایچ۔برو) H. H. Brau

۱۸۔ (آئی۔ال۔پرنسل) I. L. Previncsal

۱۹۔(آر۔بل) R. Bell

موصوف نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، جن میں اصول الاسلام فی البینة المسیحیة مطبوعہ ۱۹۳۷ء اور مقدمة القرآن مطبوعہ ۱۹۵۴ء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۲۰۔(ام۔پلنسر) M. Plenser

۲۱۔(ایف۔بول) F. Buhl

۲۲۔(وی۔ٹی۔بوشنر) V. T. Bushner

۲۳۔(جے۔پودرسن) J. Paderson

۲۴۔(ایس۔ایچ۔بیکر)

۲۵۔(اے۔ایس۔ترتیون) A. S. Triton

۲۶۔(آر۔چوڈی) R. Chudi

۲۷۔(ٹی۔ایچ۔ٹائی نابال) T. H. Toynaball

۲۸۔(گارڈ فرائی) Gouard Feray

۲۹۔(ڈبلو جورکومن) W. Jorkomon

۳۰۔(جویڈی) Guidi

۳۱۔(بی۔گوئیل) B. Goil

۳۲۔(گی۔ڈوسوڈ) G. Dussaud

۳۳۔(ڈی۔ال۔ڈلاویڈا) D. L. Dellvid

۳۴۔(ڈی۔بور) D. Boer

۳۵۔(ڈیٹریشن) Dielec

۳۶۔(ای۔ڈینٹ) E. Dinet

۳۷۔(آر۔روبرٹ) R. Robert ان کی دو کتابیں زیادہ مشہور ہوئیں۔

(۱) القوانین الاجتماعیة فی القرآن

(۲) القرآن التوراةفی القوانین الاجتماعیة (مطبوعہ ۱۹۲۵ء)

۳۸۔(ریکنڈرف) Recenderf

۳۹۔(کے۔ایف۔زیٹرلین) K. F. Zettersan

۴۰۔ (او۔اسپائیس) O Spies

۴۱۔ (ایم۔اسٹریک) M. Streck ان کی کتاب تاریخ الحروب الصلیبیہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔

۴۲۔ (ایچ۔اسپیر) H. Spyer

۴۳۔ Snouk Horgrcvji

۴۴۔ R. Slart-meut

۴۵۔ (بی۔شریک) B. Schrecch

۴۶۔ (جے۔شیلفر) J. Sheifar

۴۷۔ (ایس۔مرسر) S. Merser

۴۸۔ C. Von Areudonk

۴۹۔ H. Huches

۵۰۔ (کے۔فولرز) K. Vollers

۵۱۔ (ایف۔ووکا) F. Vocca

۵۲۔ (اے۔فیشر) A. Fecher

۵۳۔ (کارل بروکلمان) Karl Brockelman

موصوف اصلاً جرمن ہیں، جرمن زبان میں عربی ادب کی تاریخ لکھی ہے، تاریخ الشعوب الاسلامیہ بھی انھی کی کتاب ہے، روس کی مجلس علمی کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔

۵۴۔ (آر۔اے۔کرن) R. A. Kern

۵۵۔ (کور) A. Cour

۵۶۔ (کوشی ولسن) K. Wilson

۵۷۔ (کریمرز) J. H. Kromers

۵۸۔ (لانگ ورتھ ڈیمس) Lohng warth Dames

۵۹۔ T. Luwichi

۶۰۔ Bernard Lewies

ان کی مشہور کتاب العرب فی التاریخ ہے، یہ کتاب ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی، آج کل

صاحب کتاب لندن میں پروفیسر ہیں۔

۶۱۔ G. Marsais

۶۲۔ T. Menzel

۶۳۔ Morrison

۶۴۔ V. Minorski

۶۵۔(نیلنو) Naleno

۶۶۔ H. S. Nebredg

۶۷۔(ہارٹنر) Hartner

۶۸۔(ہارٹمان) Hartman

ان کی کتاب الاسلام والقومیۃ شائع ہوئی ہے۔

۶۹۔(ایچ۔ڈیون) H Dunne

۷۰۔(ایچ۔ریڈ) H. Reed

موصوف ترکی میں عیسائی مشنری کا کام انجام دے کر بعد میں امریکن یونیورسٹی میں استاد مقرر ہوئے، اور کئی کتابیں لکھیں۔

۷۱۔ M. Houtsma

۷۲۔ J. Horovits

۷۳۔ A. Aongman

۷۴۔ A. J. Hwsman

۷۵۔ B. Aeller

۷۶۔ Huart

۷۷۔(ام۔واٹ) M wat

ان کی کتاب "الجبر والاختیار فی الاسلام" شہرت عام حاصل کر چکی ہے۔

۷۸۔(جے۔والکر) J. Walker

۷۹۔(پی۔وتک) P Witteck

۸۰۔ T. H. Wair

۸۱۔ C. Young

۸۲۔ J. Welhousen

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے علاوہ انھوں نے اس کا اختصار

۱۔موجز دائرۃ المعارف الاسلامیہ Short Encyclopedia of Islam

۲۔دائرۃ المعارف من قسم الدین Encyclopedia of Religion & Ethics

۳۔دائرۃ المعارف العلوم الاجتماعیہ Encyclopedia of Secial Science

۴۔اور دراسۃ التاریخ Study in History

لکھیں ان سب کو اسلامیات کے مطالعہ کے لئے ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔

کتابیات

۱۔التبشر و الاستعمار	(عربی)	ڈاکٹر عمر فرخ ...... ومصطفےٰ خالدی
۲۔المستشرقون و الاسلام	،،	طیب حسن ہواری
۳۔الاسلام غدا	،،	دکتور محمد البہی
۴۔الاسلام علی مفترق الطریق	،،	محمد اسد (لیو پولڈ)
۵۔المشبرون و المستشرقین	،،	ڈاکٹر محمد البہی
۶۔الاستشراق ، ماله و ماعلیه	،،	ڈاکٹر سباعی
۷۔حرکات هدامة	،،	،،
۸۔Oriental Studies		R. K. Siddiqui
۹۔اسلامی ممالک میں مغربیت کی کشمکش		سید ابوالحسن علی ندوی
۱۰۔السنة و مکانتهافی التشریع الاسلامی		ڈاکٹر سباعی
۱۱۔رسائل ومجلّات		

ہالینڈ میں استشراق

تلخیص و ترجمہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم

المستمع الغربی لندن مئی اور جون ۳۲ء کے نمبروں میں پروفیسر انڈنبرگ کے قلم سے ''ہالینڈ میں استشراق'' کے عنوان سے ایک مفید مقالہ نکلا ہے، اس کی تلخیص درج کی جاتی ہے۔

آج یورپ کے قریب قریب تمام بڑے بڑے ملکوں میں عربی اور مشرقی زبانوں سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہے، یونیورسٹیوں میں عربی کی چیر قائم ہیں، اور یہاں کے مستشرقین نے کسی نہ کسی حیثیت سے عربی کی خدمت انجام دی ہے، لیکن اس کی ابتداء مغرب کے ایک چھوٹے خطہ یعنی ہالینڈ سے ہوئی، سب سے اول یہیں کے علماء نے عربی، ترکی اور فارسی زبانوں خصوصاً عربی اور اس کے علوم کی طرف توجہ کی، اور اس کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دیں، ۱۵۷۵ء میں لیڈن یونیورسٹی قائم ہوئی، اور بہت جلد یورپ میں الٰہیات اور پروٹسٹنٹ مذہب کی تعلیم کا مرکز بن گئی ۱۵۹۰ء میں پروفیسر اسکالیگر (Scaliger) فقہ اللغۃ کے چیر مین مقرر ہوئے۔

اس زمانہ میں یورپ میں تجارت کا سب سے زیادہ مذاق اہل ہالینڈ میں تھا، اس سلسلہ میں انھیں بحرمتوسط کی ساحلی اسلامی حکومتوں سے واسطہ پڑتا تھا، اس تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں انھیں عربی کے ترجمان اور اس کی تعلیم کی ضرورت محسوس ہوئی، انھوں نے تجارتی مراسلت کے لئے پروفیسر اسکالیگر کی طرف رجوع کیا، یہ عربی زبان بہت واجبی جانتے تھے، اور یورپ میں اس زمانہ میں عربی لغت اور قواعد کی کتابیں ناپید تھیں، اس لئے پروفیسر مذکور کو بڑی زحمت پیش آتی تھی، انھوں نے اپنے ایک ہونہار اور لائق شاگرد اربینس (Erpenius) کو عربی اور بعض دوسری مشرقی زبانوں کے سیکھنے پر آمادہ کیا، اس نے پیرس جا کر ایک مصری سے عربی زبان اور وائنا میں فارسی، ترکی اور حبشی زبان سیکھیں، اور جامعہ لیڈن میں مشرقی زبانوں کا استاد مقرر ہوا، چند دنوں کے بعد اس نے مشرقی زبانوں کی کتابوں کی اشاعت کے لئے ایک چھوٹا سا مطبع قائم کیا، اور ۱۶۱۳ء میں

عربی قواعد کی ایک کتاب شائع کی جو مدتوں یورپ میں عربی تعلیم کا ذریعہ رہی، ۱۸۴۴ء میں فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا، ارپنیس کے ایک لائق شاگرد جولیس (Julius) نے بڑی محنت اور ذوق وشوق سے مشرقی زبانوں کی تعلیم حاصل کی، دومرتبہ مراکش اور ایشیائے کوچک کا سفر کیا، اور یہاں سات برس قیام کرکے عربی اور ترکی میں کمال حاصل کیا، اور واپسی میں جامعہ لیڈن کے لئے نادر مخطوطات کا تحفہ لے گیا، جولیس پورا طالب علم تھا، مشرقی زبانوں کے علاوہ ریاضیات کا بھی استاد تھا ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر میں چینی زبان سیکھنے کی طرف توجہ کی، اس کو عربی، فارسی اور ترکی سے بڑا شغف تھا، سب سے پہلے اسی نے عربی لاطینی لغت لکھا جو کئی صدیوں تک یورپ میں مستشرقین کا مرجع رہا، پروفیسر فریٹاگ (Freytag) کے مشہور عربی لاطینی لغت کی تالیف کے بعد علماء نے ادھر توجہ کی، یہ لغت بالکل عربی لغات کے نمونے پر لکھا گیا تھا، لاطینی میں عربی لغات کی تشریح تھی، گو یہ کوئی بڑا جامع لغت نہ تھا، لیکن اپنے زمانہ کے اعتبار سے غنیمت تھا۔

پروفیسر جولیس کی توجہ اور دلچسپی سے یورپ میں لیڈن یونیورسٹی مشرقی زبانوں کی تعلیم کا مرکز بن گئی، اس کے نامور شاگرد وارنر (Levin Warner) نے قسطنطنیہ کا سفر کرکے عربی زبان سیکھی اور ترکوں کی معاشرت اور ان کے اوضاع واطوار کا مطالعہ کیا، اس کی ناوقت موت نے اسے وطن واپس ہونے کی مہلت نہ دی، لیکن اس نے عربی، فارسی اور ترکی کی بہت سی نادر قلمی کتابیں جامعہ لیڈن کے لئے تحفہ بھیجیں، جنھوں نے ''عطیہ وارنر'' کے نام سے یورپ میں اتنی شہرت حاصل کی کہ شائقین دور دور سے اسے دیکھنے کے لئے لیڈن آتے تھے۔

اس دور کے نامور مستشرقین میں ایک پروفیسر ایڈرین ریلینڈ (Adrian Reyalnd) استاذ جامعہ اترشٹ (Utreogt) ہیں، یہ ہالینڈ کے سب سے فاضل مستشرق تھے، فلسطین کا جغرافیہ اور اسلامی تعلیم گاہوں پر ان کی تصانیف ان کے علمی کمال کا ثبوت ہیں، ان کا نمایاں اور ممتاز وصف ان کی بے تعصبی اور انصاف پسندی ہے، ان کے پیشرو مستشرقین سخت متعصب تھے، اور ان کی تصانیف اسلام کے خلاف اندھے تعصب سے خالی نہ ہوتی تھیں، جن کا مقصد اسلام اور اس کی تعلیمات کو سمجھنا نہیں، بلکہ محض مسیحیت کی مدافعت اور اسلام پر اعتراض کرنا تھا، پروفیسر ریلینڈ کی روش اس سے بالکل مختلف تھی، ان کا مقصد انصاف اور بے تعصبی کے ساتھ اسلام کی تعلیم کا مطالعہ، اور اس کو اصلی اور صحیح ماخذوں سے لے کر اصلی شکل میں پیش کرنا تھا، وہ علانیہ کہتے تھے کہ میں راسخ العقیدہ مسیحی ہوں، لیکن میرا مذہب دوسرے مذاہب پر طعن وطنز کا سبب نہیں بن سکتا، ان کا مقولہ تھا

کہ ہم سب انسان ہیں، جن سے غلطی کا ہو جانا بعید نہیں، خصوصاً مذہبی معاملات میں ہم حد اعتدال سے بڑھ جاتے ہیں اور اپنے جذبات کے ماتحت فیصلہ کر دیتے ہیں۔

ریلینڈ کے عہد کے بعد لیڈن یونیورسٹی میں ایک ہی گھر کے تین افراد البرٹ شلٹنس (Albert Shultens) اس کا لڑکا جان جیمز (John James) اور اس کا پوتا یکے بعد دیگرے شعبۂ عربی کے صدر مقرر ہوئے، اور ستر سال تک یہ عہدہ اس گھرانے میں رہا، ان میں جیمز اپنے عہد کا سب سے بڑا مستشرق تھا، اور البرٹ پہلا شخص ہے جس نے عربی زبان کے ذریعہ عبرانی کو سمجھنے کی کوشش کی، گو اس کا یہ نظریہ غلط تھا، لیکن اس کی بنیاد صحیح تھی، اتنا مسلم ہے کہ توراۃ کی اصل زبان عبرانی کے بہت سے الفاظ ایسے ہیں، جن کے صحیح معنی مرورِ زمانہ نے بھلا دیے ہیں، یہی وجہ ہے کہ توراۃ کے مختلف زبانوں کے ترجموں میں ایک ہی عبرانی لفظ کے مختلف بلکہ متضاد ترجمے ہو گئے ہیں، البرٹ کا نظریہ یہ تھا کہ قدیم عبرانی الفاظ کے معنی کو ان کے مقابل عربی الفاظ کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے، اس کے ثبوت میں اس کے پاس دلائل اور مثالیں بھی تھیں، لیکن یہ بڑا متعصب تھا، اس لئے عربی زبان کے مطالعہ میں اس نے کوئی اچھا اثر نہیں چھوڑا، اس کے بعد ہالینڈ میں استشراق کی رفتار سست پڑ گئی۔

گذشتہ صدی کے اواخر میں پھر اس کی تجدید ہوئی اور ایسی ہوئی کہ اس میدان میں اس کا قدم پچھلے دور سے بہت آگے بڑھ گیا اور ایسے نامور اور صاحب کمال مستشرق پیدا ہوئے، جن کے کارناموں کے سامنے گذشتہ مستشرقین کے کارنامے ماند پڑ گئے، ان میں ڈوزی (Dozi) ڈی گیج (Degoeje) اور اسنوک ہرگرونج (Snouck Hargronje) زیادہ ممتاز ہیں، ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مشرقی علوم کے مطالعہ کو طعن و تعصب سے پاک کر کے خالص علمی مقصد بنا دیا، ان کے علمی کارناموں نے مشرقیات میں ہالینڈ کا علمی پایہ بہت اونچا کر دیا، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اس میں یورپ کا کوئی ملک ہالینڈ کی ہمسری نہیں کر سکتا، ان علماء نے علم کی پیام رسانی کا پورا حق ادا کیا، اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک دائمی عظمت میراث میں چھوڑ گئے۔

ڈوزی ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوا، اور ۱۸۸۳ء میں وفات پائی، اس میں مختلف زبانوں کے سیکھنے کی فطری صلاحیت تھی، ادب اور عہد وسطی کی تاریخ سے اسے خاص دلچسپی تھی، فنونِ لطیفہ سے بھی ذوق رکھتا تھا اس کی خوش قسمتی سے اس کو لیڈن یونیورسٹی میں ویرس (Weyers) جیسا کامل استاد مل گیا، جس نے اپنے تلامذہ کے لئے علمی تحقیق کا ایک قابل تقلید طریقہ ایجاد کیا، اور ڈوزی کو عربی

زبان کے مطالعہ میں الفاظ اور معنی کے ساتھ ان کے اشتقاق کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی ہدایت کی، اس طریقۂ تحقیق کا نتیجہ وہ عربی اور فرانسیسی لغت ہے، جو عربی زبان کا خزانہ تصور کیا جاتا ہے، ڈوزی نے اپنے علمی مساعی اور محنت کا نصف حصہ اس بے مثل لغت کی تالیف و تحقیق میں صرف کیا، اس کی اہم تاریخی تصانیف میں فرانسیسی زبان میں اس کی قابل قدر کتاب ''اسپین میں مسلمانوں کی تاریخ'' ہے۔

ڈی گیج ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوا، اور ۱۹۰۹ء میں وفات پائی یہ ڈوزی کے ارشد تلامذہ میں تھا، مہارتِ فن، غیر معمولی ذہانت اور جدت طرازی اس کا نمایاں وصف ہے، آج عربی زبان کے طالب علموں کے لئے جو کتابیں ناگزیر سمجھی جاتی ہیں، ڈی گیج کے زمانہ میں ان کا نام ونشان نہ تھا، اور نہ مشرقی کتابیں یورپ تک پہنچی تھیں، جن سے تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھاتے، عربی کتابوں کے بیشتر قلمی اور نادر الوجود نسخے مشرق و مغرب کے کتب خانوں کی ردی کے انبار میں گم تھے، ان گنجہائے گرانمایہ کو گوشۂ گمنامی سے نکالنے میں ڈی گیج کی کوششوں کو بڑا دخل ہے، اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ گذشتہ نصف صدی کے اندر یورپ میں جتنی نایاب کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں سے اکثروں کی اشاعت میں کسی نہ کسی حیثیت سے ڈی گیج کی امداد ضرور شامل ہے، اس نے عربی تصنیفات کو بہترین تصحیح و ترتیب و تحشیہ اور فہرستوں کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا، اس کے بعد کے ان تمام مستشرقین نے جنھوں نے عربی کتابیں شائع کیں، اس کے طریقہ کی تقلید کی اور اس میں وہ سب اس کے احسان مند ہیں، ڈی گیج نے سب سے اول یعقوبی کے جغرافیہ کا وہ حصہ جو مغرب (شمالی افریقہ اور اندلس وغیرہ) سے متعلق ہے شائع کیا۔

اس کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے اس کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا، ابو جعفر طبری کی مشہور تاریخ ''تاریخ الامم والملوک'' کی اشاعت ہے، ان خدمات کے ساتھ مختلف اسلامی موضوعوں پر مقالات کا سلسلہ بھی جاری رہا، انسائیکلوپیڈیا برنانیکا کے نویں اور گیارہویں حصے میں متعدد مقالات اس کے قلم کے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ مشرقیات میں اس شغف و انہماک کے باجود ان دونوں فاضلوں کو مشرق دیکھنے کا کبھی موقع نہ ملا، بلکہ جولیس کے علاوہ اس دور کے کسی ہالینڈی مستشرق کو اسلامی دنیا سے تعلق پیدا کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

اسنوک ہرگرونج ڈوزی کا شاگرد رشید اور اپنے عہد کا صاحبِ کمال فاضل، مشہور عالم سیاح اور نامور سیاست داں تھا، اس نے البتہ اسلامی ملکوں کی سیاحت کی، اس کی پیدا کردہ روح

سے یورپ میں اسلامیات کے مطالعہ کے ذوق کو بڑی ترقی ہوئی، وہ ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوا، اور ۱۹۳۶ء میں وفات پائی، الٰہیات اور مشرقی زبانوں کی تحصیل کے بعد جزیرۃ العرب کی سیاحت کی اور مکہ کے نام سے اس سیاحت کا سفرنامہ شائع کیا، ۱۸۸۹ء سے لے کر ۱۹۰۱ء تک جاوا میں جہاں وہ مسلمانوں کے امور کے متعلق حکومت ہالینڈ کا مشیر تھا، اسلامیات اور جاوا میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلقات پر مطالعہ اور تلاش و تحقیق میں مشغول رہا، ۱۹۰۶ء میں لیڈن یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کا صدر مقرر ہوا، اس کو مشرق خاص طور سے مسلمانوں کے ساتھ بڑا تعلقِ خاطر تھا، برسوں اسلامی تعلیمات پر غور و فکر، مسلمانوں کے ساتھ روابط و تعلقات اور ان سے تبادلۂ خیالات کے بعد اس مغربی مقولہ کے برخلاف کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔" اس کو یقین کامل تھا کہ اسلام اور جدید یورپ میں ربط و اتحاد ممکن ہے اور یہ دور دونوں میں الفت و محبت کے رشتہ کو مضبوط کرنے اور ایک دوسرے کو بہتر طریقہ سے سمجھنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں و مناسب ہے۔

مستشرقین کی بین الاقوامی موتمر کا اٹھارہواں اجلاس

منعقدہ لائڈن ۷-۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء

از

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ

ہمارے عزیز دوست شیخ عنایت اللہ صاحب جو اپنے رشحات سے اکثر معارف کو سیراب کرتے رہے ہیں، وہ چند سال کے علمی سفر کے بعد اب وطن کو کامیاب مراجعت فرما ہوئے ہیں، شیخ صاحب مشرق ومغرب کی کئی زبانوں کے ماہر ہیں، اور آئندہ ان سے ہم کو بہت کچھ علمی توقعات ہیں، کانفرنس مذکور کا مختصر حال مارچ ۱۹۳۲ء کے معارف میں گو چھپ چکا ہے، مگر تفصیلی روداد یہ پہلی بار شائع ہو رہی ہے۔ ''معارف''

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا اٹھارہواں اجلاس گذشتہ سال ستمبر کے دوسرے ہفتہ میں بمقام لائڈن (ہالینڈ) منعقد ہوا تھا، جس کی مختصر کیفیت امیر شکیب ارسلان کے فرانسیسی رسالہ ''قومِ عرب'' کے حوالہ سے معارف بابت مارچ میں شائع ہو چکی ہے، راقم الحروف نے جو اس زمانہ میں لندن میں اقامت پذیر تھا، کانگریس مذکورہ میں بذات خود شرکت کی تھی، ایک مدت سے ارادہ تھا کہ اس کے مفصل حالات سے ناظرین معارف کی ضیافت طبع کا سامان مہیا کروں مگر افسوس کہ بوجوہات چند اپنے خیال کو تا حال عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

افتتاحی جلسہ

موتمر کی صدارت عمومی اسلامیات اور عربی زبان کے فاضل اور لائڈن یونیورسٹی کے مشہور عالم پروفیسر ڈاکٹر سنوک ہرخرنجے (Snouck Hurgronje) سے متعلق تھی، چنانچہ موتمر کا افتتاحی جلسہ ان کی صدارت میں لائڈن کے ٹاؤن حال میں ۷ رستمبر کو بوقت تین بجے سہ پہر میں منعقد ہوا، جلسہ کا آغاز ہالینڈ کے وزیر تعلیم کی تقریر سے ہوا، جس میں اس نے اپنی حکومت کی طرف سے شرکائے جلسہ کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ملک ہالینڈ کو مشرقی السنہ اور علوم کے ساتھ کئی صدیوں سے دلچسپی ہے، جبکہ ابھی اس نے ایک استعماری سلطنت کی حیثیت سے زور نہیں پکڑا تھا، چنانچہ اس عہد میں ولندیزی علماء کے درمیان عبرانی اور عربی کے کئی جید عالم پیدا ہوئے، اس کے بعد جب ولندیزی جہاز رانوں نے اپنے وطن کے لئے مشرق کی تجارت کا راستہ کھولدیا تو اہل ہالینڈ اور اہل ہند کے درمیان براہ راست تعلق پیدا ہو گیا اور اہلِ ملایا کے ساتھ تجارتی تعلقات پیدا کرنے کی خواہش نے ان دور دراز ممالک کی زبانوں اور وہاں کے باشندوں کے رسوم وعادات کے متعلق اپنی معلومات کے بڑھانے کی ضرورت پیدا کی، بہرکیف یہ سچ ہے کہ اہل ہالینڈ کے استشراق کو خالصۃً صرف انھیں مادی اغراض سے تحریک نہیں ہوئی، سترہویں صدی میں ہالینڈ میں مذہبی مشن کا کام شروع ہوا، اس مشن کی خواہش تھی کہ عیسائیت کی برکات کو اہلِ مشرق تک پہنچایا جائے چنانچہ بائبل کو جزائر ملایا کی زبانوں میں ترجمہ کرنے کی ضرورت پیدا ہوئی، اس طور پر وہ پادری لوگ جو ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے، دیسی زبانوں کی تحصیل و مطالعہ میں پیش پیش نکلے، اس کے بعد متعدد علمی انجمنوں نے مشرقی علوم والسنہ کی تحصیل وتحقیق کے کام کو جاری رکھا۔ اربابِ حکومت کے حلقوں میں یہ خیال مستحکم ہو رہا ہے کہ مشرقی لوگوں پر حسن وخوبی کے ساتھ حکمرانی کرنے کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ پہلے ان کو اچھی طرح سمجھا جائے۔

(وزیر تعلیم کے اس اظہار سے کہ گذشتہ عہد میں ولندیزی مشن کی تبلیغی مساعی کے ضمن میں بھی مشرقی السنہ کے درس ومطالعہ کو ترقی حاصل ہوئی ہے، امیر شکیب ارسلان کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں نے ان کی اصل فرانسیسی رپورٹ کو نہیں دیکھا مگر (اردو ترجمہ میں) ان کے روایت کردہ الفاظ کا اخیر جملہ یقیناً صحیح نہیں ہے، اور اس پر امیر موصوف نے ملاحظات کی جو عمارت کھڑی کی ہے، کم ازکم وزیر مذکورہ کی اصل تقریر میں اس کے لئے کوئی بنیاد نظر نہیں آتی)

خطبۂ صدارت

اس کے بعد صدر کانگریس پروفیسر ہر خر نجے نے فرانسیسی زبان میں ایک نہایت پر مغز اور برمحل خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا کہ "تقریباً نصف صدی کی بات ہے کہ اسی مقام پر میرے واجب التعظیم استاد کوئنان (Kuenen) نے اسی کانگریس کے چھٹے اجلاس کا افتتاح کیا تھا، یہ پہلی کانگریس تھی جس میں میں بعہد نوعمری شریک ہوا تھا، جبکہ میرا توشۂ علم قابلِ رحم طور پر نہایت قلیل تھا، اس کانگریس نے میرے دل و دماغ پر ایک گہرا نقش چھوڑا، اس شاندار محفل کی صف آخر میں، میں نشست اختیار کرتے ہوئے اگر مجھے کسی بات کی ضرورت تھی تو صرف اس امر کی کہ بزرگان محفل میری شرکت کی جرأت کو بنظر اغماض دیکھیں، اب جبکہ عمر رسیدگی نے مجھے اس کانگریس کی صدارت پر فائز کردیا ہے، مجھے آپ حضرت سے یہ درخواست کرنی ہے کہ از راہِ کرم آپ میری ان خامیوں اور کوتاہیوں سے چشم پوشی کریں جو بمقتضائے سن لازمی ہیں، نہ تو ان کا میرے پاس علاج ہے اور نہ ہی میں ان کو چھپا سکتا ہوں۔

اس کے بعد انھوں نے چھٹے اجلاس کا موجودہ اجلاس سے مقابلہ کرتے ہوئے اس حیرت انگیز علمی ترقی کا ذکر کیا جو پچھلے پچاس سال میں مشرقیات کے میدان میں رونما ہوئی ہے۔

چھٹی کانگریس میں صرف ۲۱۹ ممبروں نے شرکت کی تھی، جو تقریباً تمام تر یورپ کے علمی مراکز کے نمائندے تھے، ریاستہائے متحدہ امریکہ نے صرف دینیات کا ایک پروفیسر بھیجا تھا، مشرقی ممبروں میں صرف تین ہندوستانی عالم تھے، اور ایک عرب تاجر نوادر قدیمہ جو ان دنوں تجارتی غرض سے ہالینڈ میں آنکلا تھا، اس اثنا میں شعبۂ مشرقیات میں جو ترقی ہوئی ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے اس اجلاس کے ممبروں کی مطبوعہ فہرست دیکھنا یا اس جلسہ گاہ میں چاروں طرف نظر دوڑانا کافی ہے۔

ہمارے عہد میں اہل امریکہ اپنے علمی اور مادی ذرائع و وسائل کی بدولت ان لوگوں کی صف اول میں ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو مشرق کے درس و مطالعہ کے لئے وقف کر رکھا ہے، مزید براں ہمارے مشرق بھائیوں کی روز افزوں شرکت کار (جس پر ہماری مساعی کی کامیابی موقوف ہے) اس بات کی شاہد ہے کہ مشرقی اور مغربی دل و دماغ نے ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے کی قدر پہچاننے میں بہت حد تک ترقی کرلی ہے۔

اس کے بعد صدر جلسہ نے حسب ذیل الفاظ جرمن زبان میں ادا کئے، کیونکہ اس جملہ کے مخاطب اصلی جرمن لوگ ہی تھے، ''اہل جرمنی نے مشرقی تحقیقات میں جو حصہ لیا ہے، وہ اس وقت بھی ایسا ہی شاندار تھا جیسا کہ اب ہے، اس عہد میں ان کے علمائے خصوصی نے میدانِ علم میں جو لمبے لمبے قدم بڑھائے ہیں، ان کی بدولت انھوں نے تقریباً ہر شعبہ میں اول درجہ حاصل کر لیا ہے، اس لحاظ سے ہم اس بات پر اور بھی زیادہ متاسف ہیں کہ ہماری اس کانگریس کے جرمن ممبروں کی تعداد ان کی اہمیت کے تناسب سے بہت کم ہے، بہرکیف ہم تہِ دل سے ان جرمن شرکائے جلسہ کا خیر مقدم کرتے ہیں جو مشکلاتِ زمانہ کے علی الرغم یہاں اپنے شاندار وطن کی نمائندگی کر رہے ہیں، ہم امید کرتے ہیں کہ خارجی حالات کی بہتری سے عنقریب جرمن علماء کے لئے اعلیٰ علمی مقاصد کے حصول کا راستہ کھل جائے گا۔''

پھر دوبارہ فرانسیسی میں تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ'' ۱۸۸۳ء میں صنف لطیف ہمارے جلسوں میں تقریباً ناپید تھی، شرکاء میں ان کی تعداد ایک درجن سے زیادہ نہ ہوگی، وہ درجہ جو عورت نے فی زمانا زندگیٔ عامہ میں حاصل کر لیا ہے، ہماری کانگریس کے دفتر استقبالیہ سے بھی ظاہر ہے جس کا تمام عملہ جنس نازک پر مشتمل ہے، اور جو کانگریس کے ممبروں کو ہر قسم کی اطلاع بہم پہنچانے کے لئے مستعد ہے، اسی طرح ان عورتوں کی تعداد سے جن کے نام کانگریس کے ممبروں کی حیثیت سے مندرج ہیں یا جنھوں نے اپنے مضامین پڑھے ہیں، یہ بات ظاہر ہے کہ جنس نازک نے تحقیقات علمیہ کے مختلف شعبوں میں اپنے شایانِ شان جگہ پیدا کر لی ہے۔''

پھر مقرر نے اس ترقی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا، جو مشرقیات کے میدان میں پچھلے پچاس سالوں میں واقع ہوئی ہے اور کہا کہ ''مشرقی تحقیقات اتنے مختلف شعبوں میں تقسیم ہوگئی ہے کہ اس امر کا قوی خطرہ ہے کہ علمائے اختصاصین اپنے اپنے خاص شعبہ یا مضمون کے تنگ دائرہ میں اس قدر منہمک اور محصور ہو جائیں کہ وہ دیگر شعبوں کی کارگذاری اور نتائج تحقیق سے بہت حد تک بے خبر رہیں، اندریں حالات ہماری کانگریس منجملہ ان وسائل کے ہے جن سے اس قسم کے خطرات کا ازالہ اور تدارک مقصود ہے تاکہ ہم میں یہ خیال مستحکم رہے کہ مباحث کے تنوع اور انتشار کے باوجود ہماری تحقیقات ایک ہی سلسلہ میں منسلک ہیں۔''

اس خطبہ کے بعد افتتاحی جلسہ ختم ہوگیا اور شہر کی ایک مجلس کی طرف سے حاضرین جلسہ کی چائے وغیرہ سے تواضع کی گئی، اسی رات کو حکومت ہالینڈ کی طرف سے تمام شرکائے کانگریس کو

دارالسلطنت ہیگ میں ایک شاندار استقبالیہ محفل (Reception) میں مدعو کیا گیا۔

کانگریس کے مختلف شعبے

اگلے روز کانگریس کی کاروائی نو مختلف شعبوں میں منقسم ہوگئی جن کے جلسے چار پانچ روز تک علی التواتر مقامی یونیورسٹی کی مختلف عمارتوں میں منعقد ہوتے رہے، شعبۂ سوم (وسطی اور مغربی ایشیا) اور شعبۂ ہشتم (اسلام) کی تفریق کئی ایک ایسے اشخاص کے لئے تکلیف دہ اور مایوس کن تھی جو ایران اور اسلام کے متعلقہ مباحث کے ساتھ یکساں دلچسپی رکھتے تھے، کیونکہ ایک شعبہ کو چھوڑے بغیر دوسرے میں شرکت کرنا ممکن نہ تھا۔

کل (۴۷۵) اشخاص نے کانگریس میں بنفس نفیس حصہ لیا، جن میں سے (۱۱۰) (Associated) ممبر تھے، ان ایسوشی ایٹڈ ممبروں کی اکثر تعداد شرکائے کانگریس کی بیویوں پر مشتمل تھی، جو اپنے خاوندوں کے ہمراہ ہالینڈ کی سیر کو آئی تھیں، اگرچہ شروع شروع میں مستشرقین کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کا ارادہ ظاہر کیا تھا، مگر بہت سے لوگ خصوصاً جرمن علماء بوجہ اقتصادی حالات کی خرابی یعنی تنگی وعسرت کے شریک نہ ہوسکے، جرمن علماء کی قلت کی یہ بھی وجہ تھی کہ چند سالوں سے جرمن مستشرقین اپنے ہاں ایک علاحدہ کانگریس ہر دوسرے سال آسٹریا یا جرمنی کے کسی شہر میں منعقد کررہے ہیں، جس کا نام انھوں نے Orientalistentag یعنی یوم المستشرقین رکھا ہے۔

شعبۂ اسلام

چونکہ مجھے بذات خود زیادہ تر شعبۂ اسلام کے ساتھ دلچسپی تھی، اس لئے اکثر اسی شعبہ کے جلسوں میں شریک رہا، اگرچہ چند ایک مقالے شعبۂ سوم میں ایرانی اور ترکی مضامین پر بھی سنے، اس شعبہ کی صدارت عمومی لائڈن کے پروفیسر (Wensinck) سے متعلق تھی مگر مختلف ایام میں مختلف سربرآوردہ علماء نے اس کی صدارت کی، پروفیسر ہرخرینے نے بھی زیادہ تر اسی شعبہ کو اپنی شرکت سے مشرف کیا، اور تمام مقالات غایت توجہ سے سنے، آپ کی عمر اس وقت اسی سال سے متجاوز ہے، مگر ان کی سن رسیدگی ان کے معمولی مشاغل میں حارج ہوتے معلوم نہیں ہوتی، جن مصری یا عربی علماء نے اس شعبہ میں مضامین پڑھے ان کا تذکرہ معارف میں ہوچکا ہے، جس کی

تکرار یہاں غیر ضروری ہے، باقی مقالات میں سے مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ہر مقالہ کے بالمقابل اس رسالہ کا نام بھی درج کر دیا گیا ہے، جہاں وہ مقالہ شائع ہو چکا ہے، یا ہونے والا ہے۔

مضمون نگار	زبان	موضوع بحث	محل اشاعت
پروفیسر شاخت	جرمن	شریعت اور قانون، موجودہ مصر میں	Den Islam
،، ماسینیو	فرانسیسی	فرقہ نصیریہ کے تعلقات ایران کے ساتھ	Revue de eltadas Islamiquis
،، پیریس	،،	ابوالولید الحمیری الاندلسی اور اس کی کتاب البدیع فی وصف الربیع	
ڈاکٹر کرنیکو	انگریزی	بعض کتب جنکی اشاعت ہندوستان میں زیر تجویز ہے	
،، ہمدانی	،،	اسمٰعیلی دعوت کی تاریخ اور اس کا لٹریچر اواخر عہد فاطمیہ میں	جرنل ایشیاٹک سوسائٹی لنڈن، جنوری ۳۲ء
،، ہموجی	،،	کتاب المنتظم لابن الجوزی	،،
پروفیسر نالینو	اطالین	فقہ اسلامی اور رومن لا کے تعلقات	
،، گوٹائل	انگریزی	قرآن کا ایک مصور نسخہ (؟)	Re, Paris
گال بیاتی	اطالین	مکتبہ امبروزیانہ (میلان) اور اسکے قیمتی عربی مخطوطات	المشرق، بیروت
ڈیسولانار	فرانسیسی	اسلامی فن تعمیر کے مصطلحات	
ڈاکٹر پلسنر	جرمن	تاریخ العلوم فی الاسلام (بحوالہ صوان الحکمۃ لابی سلیمان السجستانی)	
،، کراؤس	،،	فرقہ مانویہ اور معتزلہ کے تعلقات کا مسئلہ	
پروفیسر بلنسید (میڈرڈ)	فرانسیسی	احصاء العلوم للفارابی	
،، لیوی دلاویدا	اطالین	جمہرۃ الانساب لابن الکلبی کا مجوزہ اڈیشن	اسلامک کلچر حیدر آباد
،، بجرک تاروچ	فرانسیسی	یوگوسلاویہ میں مطالعاتِ اسلامیہ کی کیفیت	
شیخ عنایت اللہ (بلغراد)	انگریزی	جغرافی طبعی ماحول کا اثر عربوں کے تمدن اور تاریخ پر	مسلم ریواول، لاہور

بعض مقالوں کا مختصر بیان

شعبۂ اسلام ڈاکٹر کرنیکو نے اپنے قیامِ ہندوستان کے حالات زبانی بیان کرتے ہوئے ان کتابوں کا ذکر کیا جن کو ہندوستان کی مختلف مجالس یا علماء شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں علی گڑھ اور دائرۃ المعارف حیدر آباد کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ ہندوستان میں لوگ زیادہ تر تصوف یا اس سے اتر کر فقہ کی کتابوں کی طرف مائل ہیں، باقی علوم وفنون سے دلچسپی بہت کم ہے، دائرۃ المعارف والے بغیر اعراب اور فہارس کے کتابیں چھاپتے ہیں، الدرر الکامنہ لابن حجر کی چار جلدیں وہاں چھپ گئی ہیں، میں نے ان کا انڈکس تیار کیا تھا، مگر ادارہ نے اپنی خوش فہمی (۱) سے فیصلہ کیا کہ بجائے انڈکس کے مولوی عبدالحیٔ صاحب مرحوم (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی ایک کتاب بطور پانچویں جلد کے شائع کی جائے، گورنمنٹ نظام عربی کتابوں کی طباعت پر زرِ کثیر صرف کرتی ہے، مگر لائق کمپوزیٹر اور تیز نظر مصحح نہ ملنے کے سبب سے نتیجہ خاطر خواہ نہیں نکلتا، علی گڑھ میں ایک مدت سے قانون مسعودی کی اشاعت کی تجویز درپیش ہے، میں نے وہاں کے ایک صاحب کے ساتھ مل کر اس کام کو ہاتھ لگایا تھا، مگر ان کی نااہلیت یعنی انگریزی سے ناواقفیت کے سبب کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا جب میں لوگوں سے پوچھتا کہ کس لئے پڑھتے ہو، تو جواب دیتے کہ حضور! نوکری کے لئے''۔ پھر یہاں کی ناقابل برداشت گرمی اور تکلیف دہ مچھروں کا ذکر کر کے کہا وہاں کے علماء کے جمود اور پروفیسروں کی کاہلی کا ایک قوی سبب اس قسم کے ناموافق حالات بھی ہیں، غرض ان کی تقریر ہندوستان اور ہندوستانیوں کی ایک ہجو مسلسل تھی، اگرچہ ان کی بعض باتیں بالکل سچ تھیں، تاہم اپنے ملک اور قوم کا محفل غیر میں یوں استخفاف ہوتے دیکھ کر دل قدرتی طور پر بہت کڑھا، اور اب بھی ان باتوں کا اعادہ کرتے دل کڑھتا ہے، مگر ابنائے قوم کی اطلاع اور عبرت کے لئے لکھتا ہوں، بعد میں جب میں نے ان سے پرائیوٹ ملاقات میں ان کے طنز آمیز پیرایۂ بیان پر احتجاج کیا تو انھوں نے اپنا لب ولہجہ بہت نرم کرلیا، البتہ یہ دیکھ کر ہمیں بغایت خوشی ہوئی کہ ہمارے محترم مولوی میمن عبدالعزیز صاحب راجکوٹی کے علم وفضل کا لوہا مانتے ہیں، مگر کہتے ہیں کہ مولوی صاحب نے

(۱) معارف: اس ''خوش فہمی'' کی وجہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ ہے کہ درر کامنہ کی ترتیب حروف تہجی پر ہے، اس لئے ایسی کتاب میں انڈکس کا اضافہ فضول سا تھا اور اسی سرمایہ کو کتاب مذکور کے استدراک و تکمیل میں صرف کیا، تاکہ ہندوستان کا حصہ بھی اس آٹھویں صدی کی یادگار میں مناسب جگہ پا سکے۔

اپنے آپ کو صرف ادب اور شعر میں محصور کر رکھا ہے، اب سنہ رواں کے آغاز سے ڈاکٹر صاحب موصوف بن (Bonn) یونیورسٹی میں اسلامیات اور عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر سموجی جو قوم کے ہنگرین اور گولٹ سیہر آنجہانی کے شاگرد ہیں، ابن الجوزی کی ضخیم تاریخ ''کتاب المنتظم'' کے قلمی نسخوں کا برٹش میوزیم میں ایک مدت سے مطالعہ کر رہے ہیں، چنانچہ آپ کا پراز معلومات مقالہ جواب رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے جرنل میں شائع ہو چکا ہے، اپنی اسی ذاتی تفتیش اور تفحص پر مبنی تھا، موصوف نے اس تاریخ کے خصائص اور اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کو بہت خوبی سے واضح کیا اور طبقۂ علماء سے درخواست کی کہ وہ اس کی اشاعت کی طرف جلد توجہ مبذول فرمائیں اور فی الواقعہ اس میں کچھ کلام نہیں کہ اس کی اشاعت سے ہمارے علم میں بہت بڑا اضافہ یقینی ہے، کام بہت بڑا ہے، جس سے شاید ایک تن واحد عہدہ برآ نہ ہو سکے، یورپ میں بھی تاحال اس کام کے سرانجام ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے، دائرۃ المعارف حیدرآباد کو چاہئے کہ وہ سلف کی اس یادگار کی کماحقہ اشاعت کا جلد انتظام کرے۔

ڈاکٹر پلسنر (Plessner) ڈاکٹر ہورووٹس آنجہانی کے شاگرد، اور ایک نہایت مستعد اور صاحب لیاقت نوجوان ہیں اور فرانکفورٹ یونیورسٹی میں معلم ہیں، کچھ مدت سے اسلامی علوم وفنون، ان کی تاریخ اور دیگر متعلقہ مسائل سے بحث کر رہے ہیں، جیسا کہ ان کے ایک مطبوعہ رسالہ سے ظاہر ہے، زیر نظر مقالہ میں انھوں نے ابوسلیمان السجستانی کا خاص طور پر ذکر کیا، جو ابن الندیم کا معاصر تھا، اور جس کی کتاب صوان الحکمۃ چوتھی صدی اسلامی کے علوم اور حاملانِ علم اور ان کی تاریخ کے متعلق ایک اول درجہ کی قیمتی دستاویز ہے، یہ کتاب ہمیں تاحال صرف متفرق اقتباسات کے واسطہ سے معلوم تھی، اس کے چند ایک نسخے حال میں دریافت ہوئے ہیں، ملاحظہ ہو اسلامیکا جلد چہارم، حال میں رٹر صاحب (Ritter) نے غالباً قسطنطنیہ میں ایک اور نسخہ کا پتہ لگایا ہے، یہ وہی کتاب ہے، جس کے ایک تتمہ کا فارسی ترجمہ ہمارے مخدوم مولوی محمد شفیع صاحب اورینٹل کالج میگزین میں شائع کر چکے ہیں۔

ہندوستانی مقالہ نگار

اسلامی شعبہ میں دو ہندوستانیوں نے اپنے مقالے پڑھے، ایک تو خاکسار راقم الحروف نے اور دوسرے ہمارے صدیق المحترم ڈاکٹر حسین ہمدانی (یا بقول امیر شکیب ارسلان ''یمن کے

علامہ ہمدانی'') نے، اگرچہ آپ نسلاً یمن کے مشہور و مقتدر قبیلہ ہمدان سے ہیں، مگر چونکہ آپ کا خاندان چند نسلوں سے مغربی ہند میں آباد ہے اور آپ کا مولد و منشا بھی ہندوستان ہی کا خطہ ہے، اس لئے ہم ان کو ہندوستانیوں ہی کے زمرہ میں شامل کر کے شرفِ انتساب حاصل کرتے ہیں، آپ ایک مدت سے اسمٰعیلی دعوت کی تاریخ، فرقۂ اسمٰعیلیہ کے مذہبی اور فلسفیانہ خیالات وعقائد کی نشو ونما اور ان کے مشہور داعیوں کے حالات کی ایسے قلمی خزانوں کی مدد سے تحقیق کر رہے ہیں، جن تک غیر اسمٰعیلیوں کی آج تک دسترس نہیں ہوئی، ان کی استعداد فائقہ اور غیر معمولی ذرائع معلومات سے امید واثق ہے کہ ان کے نتائج تحقیق کی اشاعت اس موضوع کے متعلق نہ صرف حیرت انگیز بلکہ انقلاب انگیز ثابت ہوگی، کانگریس میں انھوں نے جو مقالہ پیش کیا وہ بھی اسی قبیل کی تحقیقات کا ایک جز تھا، جو حاضرین نے اشتیاق اور غور وخوض سے سنا اور پروفیسر ماسینیو (پیرس) اور ڈاکٹر کراؤس (برلن) نے خوب دل کھول کر داددی اور پروفیسر مارگولیتھ نے تحسین کرتے ہوئے فاضل مقرر سے امید ظاہر کی کہ وہ اسمٰعیلی لٹریچر کی مزید تحقیق کر کے اہل علم کو ممنون کریں گے، ان کا یہ مقالہ بتمامہا ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے رسالہ میں چھپ گیا ہے، ڈاکٹر موصوف کے شوقِ تحقیق، علمی شغف اور باہمت ذات سے ہماری بہت سی علمی اور قومی توقعات وابستہ ہیں، اور ہمیں اس امر میں کچھ شک نہیں کہ وہ ابنائے قوم کی کماحقہ قدر شناسی اور اپنی مسلمہ لیاقت اور عزم راسخ سے ہندوستان کی علمی بزم میں خاص درجہ اور امتیاز حاصل کریں گے۔

ایرانیات

ایران سے متعلقہ تاریخی اور ادبی مضامین شعبۂ سوم (وسطی اور مغربی ایشیا) میں پڑھے گئے، افسوس کہ اس کے شعبۂ اسلام سے علاحدہ ہونے کے سبب سے اکثر مضامین کے سننے کا موقع نصیب نہ ہوا، اس شعبہ میں شاید سب سے زیادہ دلچسپ اور پر از معلومات مضمون فرانس کے فاضل پروفیسر منورسکی (Minorsky) کا تھا، جس میں انھوں نے ان تمام اہم تحقیقات کا ذکر کیا جو ایران کی تاریخ اور تاریخی جغرافیہ کے متعلق ۱۹۰۰ء سے لے کر تا حال رونما ہوئی ہیں اور ان اہم مطبوعات پر ایک نظر دوڑائی جو اس دور میں شائع ہو کر ایران کے متعلق ہمارے زیادتِ علم کا موجب ہوئی ہیں، انھوں نے کہا کہ ''۱۹۰۰ء تک ہمارا ذخیرۂ معلومات ایران کے اسلامی عہد کے متعلق بہت کم تھا، مگر گب میموریل فنڈ کے قیام اور پروفیسر براؤن اور ان کے رفیقوں اور شاگردوں کی علمی مساعی

کے طفیل ایران کے متعلق بہت سی اہم اور قیمتی کتابیں چھپ گئی ہیں، ابن مسکویہ کی اشاعت نے دسویں اور گیارہویں صدی کے متعلق بہت سی نئی تحقیقات کا راستہ کھول دیا ہے، موسیو محمد اقبال کی راحۃ الصدور نے ہوتسما کی شائع کردہ کتابوں پر عہد سلاجقہ کے متعلق بہت سے نئے معلومات کا اضافہ کیا ہے، اسی طرح تاتاریوں کے عہد کے متعلق بھی بہت سی عمدہ کتابیں (مثل جوینی اور رشید الدین کے) روز روشن میں آئی ہیں، مگر ۱۴۰۰ء سے بعد کی تاریخ تا حال نسبۃً تاریکی میں ہے اور ضرورت ہے کہ اس عہد کی طرف توجہ مبذول کی جائے، مثلاً مقامی تاریخوں تاریخ بیہقی اور تاریخ سیستان کو شائع کرنا بہت مفید ہوگا، اس کے ساتھ اس عہد کے تمدنی اور اقتصادی حالات کو خاص طور پر زیر نظر رکھنا ہوگا، کیونکہ ان امور پر تا حال بہت کم توجہ ہوئی ہے۔"

ایران کے تاریخی جغرافیہ کے متعلق پروفیسر منورسکی نے کہا کہ "اس مضمون پر روسی محقق بارٹولڈ (متوفی ۱۹۳۰ء) دلی سٹرینج اور سٹوارسٹھ (Schwartz) کی کتابیں بہت قابل قدر ہیں، اس قسم کی مطبوعات میں سے سب سے جدید اور تازہ کتاب "حدود العالم" ہے، جس کا سنہ تالیف ۳۷۲ھ ہے، مگر مؤلف کا نام معلوم نہیں، بارٹولڈ نے اس کو ۱۹۳۰ء میں لیننن گراڈ سے شائع کیا، اب میں اس کا ترجمہ گب میموریل سیریز میں شائع کرنے والا ہوں۔"

اسی شعبہ کے ایک جلسہ میں مدرسۃ السنہ شرقیہ لندن کے مدیر و ناظم اور ہمارے کرم فرما پروفیسر سر ڈینی سن روس نے اعلان کیا کہ "میں شٹائن گس کی فارسی انگریزی لغت کا تتمہ مرتب کرنے پر مامور ہوا ہوں، میں بہت ممنون ہوں گا اگر فارسی کے علما مجھے ایسے الفاظ اور محاورے وقتاً فوقتاً ارسال کریں جن سے ان کو اپنے دورانِ مطالعہ میں سابقہ پڑے اور وہ مذکورہ بالا لغت میں موجود نہ ہوں، میں خاص طور پر ایسے جدید الفاظ اور محاورے شامل کرنا چاہتا ہوں، جو زمانۂ حال کے فارسی اخبارات اور رسائل میں استعمال ہوتے ہیں، مجھے خود اہل زبان سے اچھی خاصی مدد ملی ہے اور بہت سا ذخیرہ الفاظ کا جمع کر لیا ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ مجوزہ تتمہ حتی الامکان مکمل ثابت ہو۔

ترکی نمائندہ

ناظرین معارف کو علم ہوگا کہ چند سالوں سے ترکی میں غازی مصطفےٰ کمال کی سرپرستی میں ایک تاریخی انجمن قائم ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ ترکی اقوام کی قدیم اور جدید تاریخ کے متعلق وسیع پیمانہ پر تحقیق کی جائے اور ترکوں کے تمدن اور تاریخ کے متعلق جو غلط آراء اور خیالات پھیلے ہوئے

ہیں ان کے ازالہ کی کوشش کی جائے، اس انجمن کی طرف سے رشید صفوت بک نے جو ترکی پارلیمنٹ کے ممبر بھی ہیں، کانگریس میں شرکت کی اور اپنا مضمون جو "ترکیات" (Tureology) کے موضوع پر فرانسیسی زبان میں تھا، شعبۂ سوم میں پڑھا، انھوں نے ترکی کے اندر اور غیر ممالک میں بھی اثری تحقیقات میں عملاً حصہ لیا ہے، چنانچہ اپنے مقالہ میں اپنے وسیع مطالعہ اور پختہ خیالات کا ثبوت دیا اور ترکی تاریخی انجمن کے اغراض و مقاصد کو بیان کرتے ہوئے ترکی اقوام کی تاریخی اہمیت پر زور دیا، افسوس کہ اطناب کے خوف سے ان کا خلاصۂ کلام درج کرنا ممکن نہیں۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ترکی قوم میں دوسرے تمدنوں کے اخذ و قبول اور نقل کا مادہ تو ضرور موجود ہے، مگر قوت ایجاد و اختراع مفقود ہے، فاضل مقرر نے اپنی تقریر کے آخر حصہ میں اس خیال کی جس پیرایہ میں تردید کرنی چاہی وہ ناظرین کے لئے دلچسپ ہوگا، آپ نے کہا کہ "جس طرح ہماری تاریخ علوم و فنون، تجارت و صنعت اور ہماری عادات و رسوم کی تشریح میں لوگوں سے غلطیاں ہوئی ہیں، اسی طرح ہم محسوس کرتے ہیں کہ عقل و فکر (فلسفہ) کے میدان میں ترکوں کے کارناموں کے متعلق بعض غلط خیالات کو یکسر تبدیل کرنے کی اشد ضرورت ہے جس طرح Grotis اور Leibnizz Descartes صرف اس وجہ سے رومن مصنفین میں شمار نہیں کئے جا سکتے کہ انھوں نے اپنی کتابیں لاطینی زبان میں تصنیف کیں، اسی طرح فارابی، ابن سینا، غزالی اور دیگر سینکڑوں حکماء اور شعراء کے عظیم الشان مصنفات کے متعلق ہم دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ دراصل ترکی تہذیب کا سرمایۂ افتخار ہیں، عام طور پر ان کو دوسری قوموں میں صرف اس لئے شمار کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کی مروجہ زبانوں مثل عربی یا فارسی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا"، ملک و قوم کے امتیازات سے قطع نظر کرتے ہوئے ہمارے لئے یہ بات دیکھنا دلچسپی بلکہ مسرت کا موجب ہے کہ قرونِ وسطی کے اسلامی عہد نے تہذیب و تمدن کا وہ شاندار اور بیش بہا ترکہ چھوڑا ہے کہ آج تاریخ کی عدالت میں عرب، ایرانی، ترک سبھی اپنے اپنے حقِ وراثت کے دعاوی پیش کر رہے ہیں۔

رشید صفوت بک سے ایامِ کانگرس میں ایک سہ پہر کو لائڈن کے ایک قہوہ خانہ میں بہت پرلطف صحبت رہی، وہ انگریزی سے ایسے ہی بے بہرہ تھے جیسا کہ میں ترکی سے ناآشنا، مگر فرانسیسی اور قدرے فارسی بول سکتے تھے، چنانچہ آدھی فارسی اور آدھی فرانسیسی میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی، مجھ سے پوچھتے تھے کہ کیا وجہ ہے کہ باوجود اس عقیدت و محبت کے جو ہندوستانی مسلمانوں کو ہم سے ہے، ہندوستانی شرفا ترکی میں سیاحت کے لئے نہیں آتے، سوال اگرچہ قدرے مشکل تھا تاہم میں

نے یوں جواب دینے کی کوشش کی کہ اول تو زبان کی مشکل ہے، ہندوستانیوں میں ترکی جاننے والے خال خال ہیں اور دوسری قوی وجہ یہ ہے کہ آج کل انقلابِ زمانہ سے مغرب قبلۂ حاجات بنا ہوا ہے، ہر ذی استطاعت شخص ادھر ہی کو اپنا قبلہ راست کرتا ہے، نیز پوچھتے تھے کہ ہندوستان میں تیموری مغلوں کا کیا حشر ہوا، تختۂ حکومت تو مٹ چکا مگر ان کی نسل تو کلیۃً معدوم نہ ہوئی ہوگی، میں نے اس کا بھی اپنی معلومات کے بموجب جواب دیا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دورِ زمانہ نے پیس ڈالا، کارواں گذر گیا، گرد باقی ہے، اردو زبان کی ابتدا اور نشو ونما کے متعلق بھی دلچسپی کا اظہار کیا، کہا کہ لفظ تو ترکی ہے، معلوم نہیں اس کی ابتداء اور تشکیل میں ترکی زبان کا کتنا حصہ ہے، اگر علماء اردو اور ترکی گریمر کا باہمی مقابلہ کریں تو شاید اردو کے دھندلے عہد پیدائش پر کچھ روشنی پڑ سکے۔

اندلسی نمائندہ

اس مشرقی کانگریس جیسی بین الاقوامی علمی محافل کے مقاصد اولین میں سے یہ امر ہے کہ مختلف ممالک کے علماء ایک جگہ جمع ہوکر نہ صرف بذریعہ اپنے مقالات کے اپنے اپنے خاص مضامین کے متعلق اپنی کارگذاری سنائیں بلکہ باہمی تعارف اور ذاتی ملاقات حاصل کریں تاکہ باہمی شناسائی اور مبادلۂ خیالات سے علمی کاموں میں سہولت اور ترقی پیدا ہو، اس لحاظ سے ہمارے لئے یہ بین الاقوامی اجتماع بہت مفید ثابت ہوا، بہت سے علماء وفضلاء سے ذاتی میل جول اور گفت وکلام کا موقع ملا، جن کی فرداً فرداً ملاقات کے لئے ہزاروں کوس کے سفر اور زرِ خطیر کے صرف کی ضرورت تھی، جن فضلاء سے مل کر ہمیں کمال مسرت ہوئی، ان میں اندلسی شرکائے کانگریس کا ذکر ضروری ہے، اسپین کی خانہ جنگی اور عام شورش اور بدنظمی کی وجہ سے مجھے سفر اندلس کی پرشوق آرزو کو حسرت کے ساتھ خیرباد کہنا پڑا تھا، اس لئے ہسپانی علماء کی ملاقات لائڈن میں بسا غنیمت معلوم ہوئی، ہسپانی علماء میں جنھوں نے کانگریس کے شعبۂ اسلام میں شرکت کی، پروفیسر بلنسیہ (Palencia) اور پروفیسر غومز (Gomez) قابل ذکر ہیں، اول الذکر میڈرڈ کی مرکزی یونیورسٹی میں عربی کے استاذ ہیں، ابھی چند سال ہوئے کہ وہاں اپنے استاذ Ribera کے جانشین ہوئے، نہایت مستعد اور محنتی شخص ہیں، اگرچہ عمر تا حال چالیس برس کے قریب ہوگی، مگر ان کی تالیفات کی فہرست کئی صفحوں پر پھیلتی ہے، ان میں ہسپانی اور عربی دستاویزیں، تراجم اور مستقل تصانیف سبھی کچھ شامل ہیں، مستعربین کے متعلق دستاویزیں بمعہ ترجمہ اور حواشی کے چار ضخیم جلدوں

میں شائع کی ہیں، جب میں نے ان سے ذکر کیا کہ اس خاکسار نے ان کی ''تاریخ ادب اندلسی'' کا اپنے ملکی رسالوں میں تذکرہ کیا ہے اور ایک آدھ فصل کا ترجمہ بھی بطور نمونہ کے شائع کیا ہے تو وہ بے حد متعجب ہوئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا آپ لوگ بھی ہمارے ملک کی تاریخ وتمدن سے دلچسپی رکھتے ہیں، میں نے جواب دیا کہ ہم لوگ نہ صرف دلچسپی رکھتے ہیں، بلکہ لفظ اندلس میں ہمارے لئے وہ جادو بھرا ہے کہ فرطِ عقیدت سے اس کے متعلق معمولی سی تحریر کو بھی سرآنکھوں پر رکھتے ہیں اور آپ کی تالیف تو ماشاء اللہ ہر طرح قابل قدر ہے اور فی الواقعہ ان کو اس بات سے کمال مسرت ہوئی کہ ان کی تحریر کردہ کتاب ایک دور دراز مشرقی ملک میں قدردانی اور استحسان کی نگاہ سے دیکھی گئی ہے اور نہایت خوشی کے ساتھ مجھے اس کے انگریزی اور اردو ترجمہ کی اجازت دی۔

آج کل وہ اس مضمون کا مطالعہ کر رہے ہیں کہ مشرقی تہذیب وتمدن نے مغرب پر کیا اثر ڈالا ہے، اس موضوع کے متعلق میں نے ان کو چند ایک جرمن مصادر اور مواد کے حوالے دیے، جن کا ان کو علم نہ تھا، جس سے ان پر اچھا اثر پڑا اور ان کو معلوم ہوا کہ ہندوستانی لوگ بھی کچھ جانتے ہیں، اگرچہ بظاہر یہ مضمون پامال اور فرسودہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ عموماً ایک ہی بات کو کئی اشخاص بغیر مزید تحقیق وتنقید کے بار بار بیان کرتے آئے ہیں، مگر اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں اور تمدن کی مختلف شاخوں کے متعلق نئے اور غیر مستعمل مواد کی بنا پر مزید تحقیق وتفتیش کی ابھی بہت گنجائش ہے، اگرچہ اسی موضوع پر پچھلے سال انگریزی میں ایک اچھی جامع کتاب (The Legacy of Islam) شائع ہو چکی ہے، مگر پروفیسر بلنسیہ کو امید ہے کہ وہ اس مضمون پر مزید معلومات بہم پہنچا سکیں گے۔

اب ان کے ایک تازہ مکتوب سے معلوم ہوا کہ اسپین کی جدید جمہوری حکومت، میڈرڈ میں مشہور ومعروف عربی داں پروفیسر آسین کی ادارت اور نگرانی میں ایک مدرسہ عالیہ مشرقی السنہ اور علوم کا قائم کرنا چاہتی ہے، اور اگر اس سال حکومت کی جانب سے ضروری رقوم کی منظوری مل گئی تو امید قوی ہے کہ ایک مرکزی ادارہ کے قیام سے عربی علوم وفنون کے مطالعہ کو اسپین میں بہت ترقی حاصل ہوگی اور اس وقت ملک کے اطراف وجوانب میں نوجوان مستعد کام کرنے والوں کی جو قوتیں منتشر اور پراگندہ ہیں وہ ایک مرکز پر جمع ہو کر مفید نتیجہ پیدا کریں گی۔

دوسرے اندلسی نمائندے پروفیسر غومز (Gomez) تھے جو غرناطہ میں عربی کے استاذ ہیں، نوعمر آدمی ہیں، تحقیق کا اچھا شوق ہے، کانگریس میں ایک مقالہ بھی پڑھا، مراکش میں مدت

تک قیام رہا، عربی اچھی خاصی بول لیتے ہیں جب وہ اپنے آپ الاندلسی الغرناطی کہتے تو میرے دل پر ایک خاص اثر پیدا ہوتا جس کا زبان قلم سے ادا کرنا ممکن نہیں۔

دیگر محافل

کانگریس کے معمولی جلسوں کے علاوہ کئی دیگر محفلیں سہ پہر یا رات کو برپا ہوئیں اور درحقیقت شرکاء کو اس قسم کی صحبتوں ہی میں ایک دوسرے کے ساتھ اطمینان اور فراغت کے ساتھ بے تکلف گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا، ورنہ دن کے جلسوں میں علمی قیل وقال اور مقالوں کی تگ ودو میں باہم ملنے جلنے کی کم ہی فرصت ملتی تھی، شرکاء کے باہمی تعارف کی سہولت کے لئے یہ انتظام تھا کہ کارکنان کانگریس کی طرف سے ہر ایک ممبر کو دھات کا ایک خوبصورت چھوٹا سا مطلا تمغہ دے دیا گیا تھا، جو اس ممبر کے کوٹ پر آویزاں رہتا، اس تمغہ پر کانگریس کا پورا نام اور سن انعقاد (۱۹۳۱ء) چھپا تھا، اور ساتھ ہی طرفِ بالا میں واضح ہندسوں میں اس ممبر کا خاص نمبر شمار کھدا تھا، ایک علاحدہ کتاب میں تمام ممبروں کے نام مع ان کے اعداد وشمار کے درج تھے، جس سے ہر فرد کی شخصیت بآسانی معلوم ہوسکتی تھی۔

پہلے ہی روز شب کو حکومت ہالینڈ کی طرف سے دارالسلطنت ہیگ کے ایک محل میں تمام ممبران کانگریس کو دعوت دی گئی، جہاں وزیر مستعمرات نے ایک مختصر سی تقریر میں شرکائے کانگریس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ''مستشرقین کی علمی مساعی اور اجتماع صرف اس لئے مفید اور اہم نہیں ہیں کہ اس سے علم کی ترقی ہوتی ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ ان سے مشرق ومغرب کی باہمی مفاہمت بڑھتی ہے۔'' سہ پہر کی چائے کے بعد یہ دوسرا موقعہ تھا جس میں تمام ممبروں نے جمع ہوکر باہمی شناسائی پیدا کی اور ایک دوسرے کے لطفِ ملاقات سے بہرہ اندوز ہوئے، حاضرین محفل کی مختلف قسم کے ہلکے سامان خورد ونوش بلکہ مغربی رسم کے مطابق مے ناب سے بھی تواضع کی گئی، ناظرین معارف کی تسکینِ خاطر اور ان کی ثقاہت کی رعایت سے اس بات کا اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بطور بدل کے زاہدانِ خشک کی خشکی دور کرنے کے لئے آئس کریم بھی کافی مقدار میں مہیا تھی، غرض دو ڈھائی گھنٹے کے بعد یہ شاندار اور پرلطف محفل جس کے ہر گوشہ کو لالۂ رخانِ مغربی نے اپنی جلوہ باری سے جنتِ نگاہ بنا رکھا تھا، ختم ہوگئی۔

اسی قسم کا ایک اجتماع ایک اور رات کو شہر لائڈن کی میونسپل کمیٹی کی دعوت پر شہر کی پکچر گیلری

میں قرار پایا، جس میں ممبرانِ کانگریس کو باہمی ملاقات کا مزید موقع ملا۔

جلسۂ طعام

ایک شب ممبرانِ کانگریس کا مجموعی ڈنر (Dinner) ہوا، جہاں دو تین گھنٹے خوب خوش گپی میں گذرے، کلام بعد از طعام یعنی (After Dinner Speeches) میں جو مغربی ضیافتوں کا دلچسپ لازمہ ہیں، انگریز، فرانسیسی، جرمن اور اٹالین نمائندوں نے اپنے اپنے ملک وقوم کی طرف سے حکومت اور اہالیانِ ہالینڈ کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا، یہ جلسۂ طعام اس لحاظ سے بھی ہمارے لئے یادگار ہے کہ ڈنر کے بعد ایک پر لطف محفلِ رقص وسرود قائم ہوئی، مگر اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ یہ محفل کانگریس کے سرکاری پروگرام میں شامل نہ تھی، اگرچہ کانگریس کمیٹی کی ینگ پارٹی (نوجوان جماعت) اس بات پر مصر تھی کہ محفلِ رقص کو باقاعدہ طور پر کانگریس کے پروگرام میں جگہ دی جائے مگر کانگریس کے معمر صدر یعنی پروفیسر ہرخرینے نے آغاز ہی سے اس خیال کی سخت مخالفت کی اور اس تجویز کو قبول کرنے سے اس بنا پر قطعی انکار کر دیا کہ اس قسم کا رقص وسرود کانگریس ایسے جلسۂ علماء کی متانت وثقاہت کے بالکل منافی ہے، مگر یار لوگوں نے اپنے شوق کو پورا کرنے کی یوں ترکیب نکالی کہ صدر جلسہ اور دیگر ثقہ حضرات کے رخصت ہونے پر اسی ہوٹل کے رقص خانہ کا (جہاں جلسۂ طعام منعقد ہوا تھا) راستہ لیا اور نصف شب تک طرب انگیز موسیقی کی دمسازی میں اپنی خوش لباس، دلفریب اور نازک ادا ساتھیوں کی پر کیف معیت میں ناچا کیے، چونکہ خود کانگریس کے نوجوان سکریٹری ڈاکٹر کریمر (Kraemer) اور ہمارے معمر مگر جوان دل ڈائرکٹر سر ڈینی سن روس نے لطف اندوز ہونے میں پیش قدمی کی، لہٰذا ہماری شرکت بھی ایسے محترم مقتداؤں کی اقتداء میں جائز ٹھہری، امیر شکیب ارسلان بھی ایک طرف بیٹھے قہوہ نوشی میں مصروف اور نوجوانوں کی عیش کوشی کو بنظر عفو دیکھ رہے تھے، ان کے پرسکون مگر پراندیش چہرہ سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا اب بھی وہ عرب اقوام اور عرب ممالک کی قسمت پر غور کر رہے ہیں۔

دیگر جلسے

ایک شب فنونِ لطیفہ کے لئے وقف تھی، پروگرام کے تین حصے تھے، پہلے مدراس کے ایک پروفیسر ستیہ مورتی نے ہندی اور مغربی موسیقی کا مقابلہ کرتے ہوئے ہر دو کی امتیازی خصوصیات کو

دکھلایا، اور اپنے مطلب کو ہندوستانی راگ گا کر اور ہندوستانی آلاتِ موسیقی استعمال کر کے واضح کیا۔

اس کے بعد جاوا کے چند طالب علموں نے جو ہالینڈ کی یونیورسٹیوں میں تحصیل علم کر رہے ہیں، اپنے ملک کے ناٹک کا ایک عمدہ نمونہ پیش کیا، جس میں سین اور آلاتِ موسیقی سب جاوی تھے، اس ناٹک کی بخلاف مغربی ناٹک کے مجھے یہ خصوصیت نظر آئی کہ تمام کھیل کے دوران میں ایک خاص قسم کا ساز بجتا رہا، جس نے ایکٹر کی تمام حرکات و سکنات کا ساتھ دیا، جب ایکٹ میں پھرتی یا تیزی آجاتی تو ساز بھی تیز ہو جاتا۔

اس کے بعد ایک جاوی شخص نے ایک تماشا دکھلایا جس کو عربی میں طیف الخیال اور ترکی میں ''قرہ گوز''، فرانسیسی میں The atred, Ombres یا Ombreschinoises اور جرمن میں Schattenspiel کہتے ہیں، اس کی مختصر کیفیت یوں ہے کہ ایک سفید پردہ تان کر اس کے پیچھے تیز روشنی کرتے ہیں، پھر اس روشنی اور پردہ کے درمیان چمڑے سے بنی ہوئی چوڑی چپٹی پتلیاں حائل کر کے پردہ پر عکس ڈالتے ہیں اور مطلوبہ قصہ کہانی پیش کرتے ہیں، اصول تقریباً وہی ہے جو موجودہ سینما کا ہے، یہ کھیل غالباً مشرق اقصیٰ (چین) میں ایجاد ہوا اور مدت تک اس کا رواج اسلامی ملکوں (۱) میں بھی رہا۔

جنس لطیف کی شرکت

مشرق میں عورت چراغ کاشانہ ہے، مغرب میں شمعِ خانہ ہو یا نہ ہو، مگر رونقِ محفل ضرور ہے، مشرقی اور مغربی معاشرت کا یہ وہ بین فرق ہے جس کا ظہور کانگریس کی تمام کاروائی میں از اول تا آخر بدرجۂ اتم ہوا، اور جنس لطیف نے اپنی شرکت سے ہر جلسہ اور محفل کو پر لطف بنایا اور ہمیں ''معارف'' کی متانت اور سنجیدگی سے اعتذار کرتے ہوئے اس امر کا اعتراف ہے کہ ہم ان کی جلوہ بار شرکت سے ناخوش نہیں ہوئے، خود صدر نے اپنے افتتاحی خطبہ میں مشرقی معاملات میں عورتوں کی روز افزوں دلچسپی کا ذکر کیا تھا، پہلے ہی روز جب ''انفرمیشن بیورو'' یا ایوانِ استقبال میں داخل ہوئے تو

(۱) معارف: غالباً اسی تماشے کا نام پانچویں صدی کے عہد سلجوقی میں ''فانوسِ خیال'' تھا، خیام اسی زمانہ کا شاعر کہتا ہے:

این چرخ فلک کہ ما درو حیرانیم ''فانوس خیال'' از و مثالے دانیم
خورشید چراغ آں، و عالم فانوس ما چوں صوریم کاندرو گردانیم

آنکھوں نے ایک خیرہ کن منظر دیکھا، تمام دفتر کا انتظام عورتوں کے ہاتھ میں تھا، کانگریس کا ٹکٹ اور پروگرام اور دیگر متعدد کاغذات انھیں کے دستِ سیمیں سے وصول پائے، ان کی خوش اسلوبی، کشادہ پیشانی، اور لطف آمیز توجہ سے ہمیں یوں معلوم ہوا کہ گویا ہم اغیار کے درمیان نہیں ہیں، دیگر محافل میں بھی میزبانی کی خدمات انھیں خوش سلیقہ نازنینوں سے متعلق تھیں، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ گرمی محفل انھیں کے دم سے تھی، جب ان سے میل جول بڑھا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے اکثر عمائدِ شہر اور پروفیسروں کی صاحبزادیاں یا شاگردیں تھیں، جنھوں نے اپنی انمول خدمات کچھ عرصہ سے کانگریس کو دے رکھی تھیں، ان کی زباندانی نے ہم سے بلا ساختہ خراج تحسین وصول کیا کیونکہ تقریباً سبھی انگریزی، فرانسیسی اور جرمن میں سے کم از کم دو زبانیں بول سکتی تھیں، حیف ہوگا اگر ہم ان کی مہمان نوازی اور لطفِ توجہ کے شکریہ میں ان کے ذکرِ جمیل کو اپنے بیان کا حسنِ خاتمہ نہ بنائیں۔

بعض عورتوں نے بعض شعبوں میں اپنے مضامین بھی پڑھے، خود ہمارے شعبۂ اسلام کو ایک کافر ادا نے شرفِ حضوری بخشا، پہلے ہم نے خط و خال سے سمجھا کہ کوئی مصریہ ہیں، مگر تعارف سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ہوروٹس کی شاگرد اور فرانکفورٹ کے ایک یہودی خاندان کی چشم و چراغ ہیں، السنۂ سامیہ ان کا خاص موضوعِ درس ہے، اس ضمن میں عربی اور اہل عرب سے بھی دلچسپی ہے، میرے مقالے اور اس کے موضوع میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کے سننے کا شوق ظاہر فرمایا، اگرچہ میرے مقالہ کا وقت ایک روز صبح سویرے تھا، تاہم شرف استماع سے نوازا اور اس کی ایک کاپی مجھ سے طلب کی، ہم نے سمجھا کہ ہماری ناچیز محنت ٹھکانے لگی، اب ان کا ایک آرٹیکل مفضل الضبی پر انسائکلو پیڈیا آف اسلام میں شائع ہونے والا ہے۔

الغرض مشرقی کانگریس کا یہ پرلطف ہفتہ جس میں طرح طرح کے مشاغل اور گونا گوں مصروفیتیں یکجا جمع ہوگئی تھیں، بخیر وخوبی ختم ہوا۔

(معارف جلد ۳۰ شمارہ ۳ بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۲ء)

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

اس دفعہ مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا اجلاس گذشتہ ستمبر میں بروسل (بلجیم) میں ہوا، اس کے صدر ایم جین کپارٹ (ڈائرکٹر، رائل میوزیم) تھے۔

کانگریس مشرقیات کے مختلف علوم وفنون پر مشتمل ہوتی ہے، لیکن یہاں ہم صرف اسلامی شعبہ کا ذکر کریں گے، جس کی روداد ڈاکٹر کرنکو نے اسلامک کلچر (جنوری ۱۹۳۹ء) میں لکھی ہے۔

کانگریس کی زبان انگریزی، فرانسیسی، جرمن یا اطالوی ہے، لیکن اس سال اسلامی شعبہ میں خطبے عربی اور اسپینی زبانوں میں بھی پڑھے گئے، اس شعبہ میں مختلف موضوعوں پر مختلف اہل علم نے حسب ذیل مقالات پڑھے۔

اپسالا کے ڈاکٹر لوف گرن نے ہمدانی کی کتاب الاکلیل کے پہلے اور دوسرے حصہ پر ایک مقالہ پڑھا، اس کا نسخہ برلن کے سرکاری کتب خانہ میں پایا گیا ہے، اب تک اس کتاب کے صرف آٹھویں اور نویں حصہ کا پتہ چلا ہے، جن میں ایک تو بغداد سے شائع ہو چکا ہے، اور ایک ابھی وہیں زیر ترتیب ہے، جو کبھی یمن کے مشہور عالم نشوان الحمیری کی ملکیت تھا۔

رباط (مراکش) کے پروفیسر کولن نے ایک ایسی قدیم عربی کتاب پر مقالہ پڑھا جس میں پودوں اور دواؤں کا حال ہے، یہ کتاب گیارہویں صدی عیسوی کے کسی نامعلوم اندلسی مصنف کی تصنیف ہے، اس کتاب کا حال ابن بیطار جیسے نباتاتی کو بھی معلوم نہ تھا، لیکن غافقی نے اس سے استفادہ کیا تھا، پروفیسر کولن نے وعدہ کیا ہے کہ یہ کتاب بہت جلد چھپ کر شائع ہو جائے گی۔

پروفیسر گوئڈی (روم) نے اپنے ایک خطبہ میں الکندی کی تصانیف کے ان قلمی نسخوں کا

ذکر کیا، جو حال میں دستیاب ہوئے ہیں، ان میں سے بعض زیر طبع ہیں۔

ڈی۔ اے۔ ہمدانی نے بعض مشہور شہروں اور قصبوں کی تاریخوں پر مقالہ پیش کیا، جو استنبول میں ان کو ملی ہیں، ان میں سے ایک حاکم کی تاریخ نیشاپور ہے، جس میں عبدالغفار الفریسی نے السیاق کے نام سے کچھ اور حالات اضافہ کئے ہیں، دوسری تاریخ مرو ہے، جس کے مصنف کا نام السمعانی ہے۔

پروفیسر کریمر (لیڈن) نے عرب جغرافیہ نویسوں کی اہمیت دکھاتے ہوئے کہا کہ وہ اسلامی تمدن اور دنیا کے لئے ضروری ہیں، پروفیسر موصوف نے ابن حوقل کے جغرافیہ کو از سر نو ترتیب دیا ہے، اور ادریسی کی کتاب کا ایک جدید اڈیشن ان کی نگرانی میں شائع ہوگا، جو سائنٹفک اصولوں پر مرتب کیا جائے گا۔

ام کاہن (پیرس) نے شام اور اناطولیہ میں سلجوقی ترکوں کی حکومت پر ایک مقالہ پڑھا، اس حکومت کے چار دور قائم کئے ہیں، پہلا دور بازنطینی حکومت پر ترکوں کے حملہ سے شروع ہوتا ہے، دوسرا بازنطینی اور فاطمی قوت کے زوال سے، تیسرا ملک شاہ کی حکومت سے، اور چوتھا اس خاندان کے خاتمہ اور اناطولیہ میں سلجوقی سلطنت کے عروج سے شروع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کاسکل نے عرب کے ایام جاہلیت کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ دوسری صدی عیسوی میں نبطیوں کی سلطنت کے زوال پر عربوں کی تشکیل کا آغاز ہوا، اس وقت بھی ان میں لسانی اعتبار سے دو قسمیں تھیں، جو اب تک قائم ہیں۔

ام۔ مارکس (الجزائر) نے الحمراء (غرناطہ) کے آرٹ کے جمالیاتی پہلو پر ایک مقالہ پڑھا، اور شمالی افریقہ کی بعض عمارتوں پر اس کے اثرات دکھائے۔

پروفیسر گب (آکسفورڈ) نے ایک تقریر میں کہا کہ ماوردی کی تصنیف خلیفہ کے نظریہ کے متعلق قطعی رائے نہیں ہے، سنیوں کا بھی اس کے بارہ میں کوئی خاص نظریہ نہیں، لیکن ان کا خیال یہ ضرور ہے کہ ایک صاحب حکومت وقوت امیر المومنین کافروں کے مقابلہ میں شریعت کو محفوظ رکھتا ہے۔

ام۔ گبریل ہے اناطولیہ کے سلجوقیوں کے ان مقبروں پر ایک مقالہ پڑھا، جو مشرقی ایران کے مقبروں سے ملتے جلتے ہیں۔

پروفیسر بروکلمن نے مصر میں جدید عربی شاعری پر ایک مضمون پڑھا اور یہ دکھایا کہ شروع

میں یہ قدیم شاعری کے زیر اثر رہی، لیکن بیرونی خصوصاً فرانسیسی اثرات سے اس میں جدید عناصر پیدا ہو گئے ہیں۔

پروفیسر ڈینی سن راس نے تیمور اور بایزید پر ایک مقالہ پڑھا اور فارسی ماخذوں سے اس روایت کی تردید کی کہ انقرہ کی جنگ کے بعد تیمور نے بایزید کو لوہے کے پنجرے میں مقید کیا تھا۔

ڈاکٹر ریزی ٹانو نے اپنے مضمون میں یہ تجویز پیش کی کہ قدیم عہد کے غیر معروف عربی شعراء کے دیوان شائع کئے جائیں تا کہ پہلی صدی ہجری کے معاشرتی حالات معلوم ہوسکیں۔

پروفیسر میسے (پیرس) نے جلائری خاندان پر ایک مقالہ پڑھا، جو عراق اور ایران میں مغلوں کی سلطنت کے بعد برسر اقتدار ہوا، اسی سلسلہ میں مقالہ نگار نے کہا کہ اگر اس عہد کی بعض دستاویزیں اور شاہی فرامین جو پیرس اور دوسرے ممالک میں محفوظ ہیں شائع کردیے جائیں تو ان سے بہت سے نئے معلومات حاصل ہوں گے۔

ام بلیشر نے دیوان متنبی کی اس شرح پر روشنی ڈالی، جو العکبری کی جانب منسوب ہے، مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ شرح العکبری کی نہیں ہے، بلکہ اس کے ایک ہم عصر کی ہے۔

پروفیسر کاہلے (بون) نے ابن دانیال کے ڈراموں کے شائع کرنے پر زور دیا، جو اسکوریال کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں اور از منہ وسطیٰ کے عربی ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے۔

پروفیسر لیوی پرونکل نے ایک ایسی کتاب پر مقالہ پڑھا، جو ان کو فاس میں ملی ہے اور جو سکوں کے اصطلاحات پر ہے، بظاہر یہ کتاب (Mermide) حکومت کے ٹکسال کے کسی افسر کی لکھی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر اوپٹو (روم) نے تجویز کیا کہ مشرق کے اطالوی سیاحوں کے سفرنامے شائع کئے جائیں تا کہ مشرقی ممالک کے حالات معلوم کرنے میں آسانی ہو۔

مسٹر جی، گومع (لندن) نے ''الازرقی'' کے استناد پر ایک عرب نو آبادی دربند کا ذکر کیا جو ایران کے شمال میں واقع تھی۔

پروفیسر عطیہ (بون) کا مقالہ مصر کے قبطیوں پر تھا، اس کے بعض حصے مصر کے مسلمانوں کی عہد کی تاریخ سے بھی متعلق تھے۔

پروفیسر طہ حسین (قاہرہ) نے یہ دکھایا کہ جدید طریقہ پر عربی کس طرح پڑھائی جانی چاہئے۔

پروفیسر نیمت (بداپست) نے ہنگری میں مشرقی علوم وفنون کی تعلیم کا جو سامان ہے اس پر تبصرہ کیا۔

ڈاکٹر میر نے بیت المقدس میں عبرانی یونیورسٹی کے علمی کارناموں پر ایک تقریر کی اور اعلان کیا کہ اس کی طرف سے بلاذری کی کتاب الاشراف کی دوسری جلدیں بہت جلد شائع ہوں گی۔

الجزائر کے، ام، ویس لمارے نے اس صنعت پر مضمون پڑھا کہ کس میکنک طریقہ سے عثمانی مصحف خطبہ کے وقت ایک طاق سے چکر کھا کر منبر پر چلا آتا تھا، مضمون نگار نے یہ بھی بتایا کہ یہ طریقہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی رائج تھا۔

الجزائر کے ام پیرے نے مصر کے جدید ناولوں پر مقالہ پیش کیا، اس میں یہ بتایا کہ اول اول ۱۸۸۲ء میں ناول سیاسی اغراض کے تحت لکھے گئے، پھر رفتہ رفتہ مصر، شام اور عراق میں زیادہ تر ان کے موضوع معاشرتی مسائل ہونے لگے۔

(معارف جلد ۴۳ شمارہ ۳ بابت ماہ مارچ ۱۹۳۹ء)

استانبول کی موتمر مستشرقین عالم[1]

از

ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم

حال میں ترکی جانے کا اتفاق ہوا، خیال ہوا کہ اس علمی سفر کے حالات دلچسپی سے خالی نہ سمجھے جائیں گے، اس مقالے کے دو حصے ہیں (۱) موتمر مستشرقین کا حالیہ اجلاس (۲) ترکی کے کتب خانے۔

ناگزیر وجوہ سے محض ایک اطلاع کے طور پر یہ سطریں تحریر ہیں۔

یورپی جامعات میں مشرقی اور خاص کر اسلامی علوم کی تعلیم تو کوئی سو سال سے ہو رہی ہے اور مشرقیات کی انجمنیں بھی کئی مقاموں پر ایک صدی سے زیادہ عرصہ سے قائم ہیں، لیکن کوئی بین الممالک انجمن نسبتہً حالیہ چیز ہے، اور پچاس سال سے بھی کم عرصہ ہوا کہ ''موتمر مستشرقین عالم'' کے نام سے ایک یورپی ادارہ وجود میں آیا، ہر تین چار سال میں اس کا اجلاس ہوتا ہے، الجزائر کے بعد یہ دوسری دفعہ ہے کہ اس کا اجلاس گذشتہ ستمبر میں ایک اسلامی شہر (استانبول) میں ہوا، اس بائیسویں اجلاس میں ساری دنیا سے اہل علم جمع ہوئے اور ہر حیثیت سے یہ سب سے کامیاب اجلاس رہا، ۱۵ر تا ۲۲ر ستمبر ۱۹۵۱ء ایک ہفتے صبح اور شام ہر روز اس کی نشستیں ہوتی رہیں، کوئی تین سو

(۱) ہمارے محترم اور فاضل دوست ڈاکٹر حمید اللہ صاحب دارالمصنفین کے پرانے مخلص قدرداں ہیں، وہ جہاں بھی رہتے ہیں اس کو نہیں بھولتے، چنانچہ پیرس جیسے دور دراز مقام سے معارف کے لئے وقتاً فوقتاً علمی سوغات بھیجتے رہتے ہیں، ابھی چند مہینے ہوئے، ان کا ایک علمی خط معارف میں شائع ہو چکا ہے، اب انھوں نے موتمر مستشرقین عالم منعقدہ استانبول کی مختصر روداد اور ترکی سے متعلق متفرق مفید معلومات قلم بند کر کے بھیجے ہیں، اس موتمر کا دعوت نامہ دارالمصنفین کے نام بھی آیا تھا، مگر اس غریب ادارہ میں اتنے کثیر مصارف برداشت کرنے کی طاقت کہاں ہے، اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بھیجی ہوئی سوغات میں ناظرین معارف کو بھی شریک کیا جاتا ہے۔ ''م''

کے اجتماع میں پاکستان سے تو صرف ایک شخص جامعہ پنجاب کے معین امیر آئے، لیکن حیدر آباد اور ہندوستان نے توقع سے زیادہ دلچسپی لی، جامعہ کلکتہ کے استاذ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی سے ناظرین ناواقف نہیں، حکومت ہند کے پانچ نمائندوں میں یہ اکیلے مسلمان تھے، حیدر آباد سے ہر شخص اپنے مصارف سے شوق علم میں آیا تھا اور اس کی قدر بھی کی گئی، چنانچہ دونشستوں کے صدر حیدر آبادی نامزد ہوئے تھے، ڈاکٹر نظام الدین تو آئے لیکن پروفیسر محمد عبدالرحمٰن خان نہ آسکے اس کی بنا پر وہ صدارت نہ کرسکے، جامعہ عثمانیہ کے ڈاکٹر محمد غوث اور ڈاکٹر محمد یوسف الدین بھی آئے تھے، صدارت کے اعزاز مصر کے ڈاکٹر ابوبکر اور ڈاکٹر مراد کامل، نیز ایران کے پروفیسر علی اصغر حکمت کو بھی عطا ہوئے تھے۔

مقالے توقع سے اتنے زیادہ آئے کہ متعدد شعبوں کو کئی کئی ذیلی شعبوں میں تقسیم کرنا پڑا، چنانچہ اسلامیات کو ایک کی جگہ چار شعبوں میں بانٹا گیا، مزید براں مشرق بعید میں سے ملایا وانڈونیشیا کو الگ کر کے مستقل شعبہ بنانا پڑا، قدیم اناطولیا کو دو، ترکیات کو تین اور اسلامی فنون لطیفہ کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا۔

اجلاس مشترکہ یعنی جلسۂ عام میں ڈاکٹر نظام الدین (حیدر آباد) نے یہ بتایا کہ عربی فارسی مخطوطات کی اشاعت میں مشرق اور مغرب کس طرح تعاون کرسکتے ہیں، ڈاکٹر زکی ولیدی طوغان (استانبول) نے کہا کہ قرونِ متوسطہ کے مسلمان مؤرخ کس قدر ناقدانہ رویہ رکھتے تھے اور ڈاکٹر کرامرس (لانڈن) نے بتایا کہ اسلامی عمرانیات میں عام عمرانیات کے علاوہ کیا خاص اور زائد ابواب ہوتے ہیں۔

یہ تو ممکن نہیں کہ جملہ مقالوں کی (جو عربی، ترکی، نیز یورپی زبانوں میں تھے) فہرست دی جائے، ہمالیہ تلے کے مسلمانوں کی دلچسپی کی چیزیں شمار سے باہر ہیں، اس لئے مشتے نمونہ از خروارے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

۱- حران اور پرمچہ کے آثار قدیمہ (پروفیسر لائڈ، انقرہ)

۲- سباؤ معین (یمن) کی تازہ کھدائیاں (البرائٹ، بالٹی مور)

۳- زمانہ جاہلیت کی یمنی عورت (بیسٹن، آکسفورڈ)

۴- فینقی حروف تہجی معین (یمن) سے لئے گئے (گیورگیف بلغاریا، صوفیا)

۵- المدونہ میں کتاب الغصب (دے می لیا، روما)

۶- طوق الحمامۃ لابن حزم کے مشرقی مصادر (گراسیا گومسیس، مجریط، اندلس)

۷- الحکمۃ العروضیہ لابن سینا (پادری قنواتی، قاہرہ)

۸- جزیرہ مالٹا کی موجودہ زبان کا درجہ عربی بولیوں میں (کولین، پاریس)

۹- ہندو ثقافت کا اثر عربی ادبیات پر (رائے چودھری کلکتہ)

۱۰- تاریخ ابن ایاس کے چند نو دستیاب شدہ اجزاء (محمد مصطفےٰ، قاہرہ)

۱۱- انقرہ کے مخطوطات (بکر صدقی بائیکل، انقرہ)

۱۲- جمہرۃ الانساب لابن حزم شائع کردہ لیولی پرودان سال کی بے شمار غلطیاں (خلیل نیاچ، استانبول)

۱۳- سفرنامہ ابن فضلان قدیم جرمن معلومات کے ماخذ کے طور پر۔ (گراف، باڈماٹن برگ، جرمنی)

۱۴- اباضیوں کے ریت میں غائب شدہ شہر سیدراتہ کی دریافت (میڈم فان برشم، جنیوا)

۱۵- خلفاء فاطمیین کے آداب و مراسم (کانار الجزائر)

۱۶- عماد الدین اصفہانی کی الفتح القسی (ماسے۔ پاریس)

۱۷- الحاکم کی رصدگاہ مصر (آیدین سائلی، انقرہ)

۱۸- عربی و اسلامی طب (سارینلی، نیپلز)

۱۹- ابودلف کا رسالہ ثانیہ (مینورسکی، کیمبرج)

۲۰- ولی کشمیر میر سید علی ہمدانی (علی اصغر حکمت، طہران)

۲۱- فن تنقید کی ترقی میں قرآن کا حصہ (خلف اللہ، اسکندریہ)

۲۲- فقہ کی تاریخ (برون شوانگ، بورڈو، فرانس)

۲۳- اسلامی مشرق میں زراعت کا اثر زمین پر (ہلسکے، استانبول)

۲۴- زانی کے مزنیہ سے نکاح کی حرمت اسلام میں (شاخت، آکسفرڈ)

۲۵- ناصر خسرو کی جامع الحکمتین (کوربین، طہران)

۲۶- اسلام اور بنیادی حقوق انسانی (محمد غوث، حیدرآباد دکن)

۲۷- اسلامی قانون کی تاریخ پیدائش (گوئٹائن، اسرائیل)

۲۸- مقدمہ ابن خلدون کے نئے صحیح اڈیشن کی ضرورت (تادیت الطنجی، قاہرہ)

۲۹- اسلام اور سماجی بیمہ (محمد یوسف الدین حیدر آباد دکن)
۳۰- فتوت تاریخ اسلام میں (ماسینون، پارلیس)
۳۱- دیوان حافظ کا قدیم ترین نسخہ کلکتہ میں ہے (زبیر صدیقی، کلکتہ)
۳۲- قبلائی قان کا جاوا پر حملہ (داماے، انڈو چائنا)
۳۳- پندرھویں اور سولہویں صدی کی ترکی مردم شماریاں (عمر لطفی برکان، استانبول)
۳۴- ویانا (آسٹریا) میں ۱۷۶۶ء کی ترکی جبری فوجی خدمت (اینے پے کی دیس، ویانا)
۳۵- انیسویں صدی کے آغاز میں کودریکا یونانی کی جاسوسی ترکی میں، فرانسیسی وزیر خارجہ کی روشنی میں (ایضاً)
۳۶- جوامع التواریخ، مؤلفہ رشید الدین خاں کے حالاتِ فرنگ کے ماخذ (یان، اوتریشت، ہالینڈ)
۳۷- بی بی مریم کی تاریخ میں دوسری صدی عیسوی کا ایک ترکی قصیدہ (پیالتی، استانبول)
۳۸- قدیم چغتائی میں ایک ترجمہ قرآن مجید (فاخر عز، لندن)
۳۹- قرہ قویونلو اور آق قویونلو (مینورسکی، کیمبرج)
۴۰- ''سیاست نامہ'' کس حد تک اصلی ہے (یحییٰ الخشاب، قاہرہ)
۴۱- پرانے ایران کا جاگیرداری نظام (ویڈن گرین، اپسالا، سویڈن)
۴۲- تالمود اور حدیث کی مماثلتیں (بانیت اسرائیل)
۴۳- ایرانی سیاست اور یہود کی بابل سے واپسی (گالنگ، مائنس، جرمنی)
۴۴- بحرمیت کے پاس حال میں دستیاب شدہ قبل مسیح کا نسخہ توریت (فاندر پلوگ، نیمیکن، ہالینڈ)
۴۵- اتھنس کی فاتحہ جامع مسجد (ماتھیسکو، اتھنس)
۴۶- مسلمان مصوروں کی سوانح عمریاں مرتب کرنے کی ضرورت (مایر، اسرائیل)
۴۷- فاطمی دور کے منقش مٹی کے برتن (زکی حسن، قاہرہ)
۴۸- قدیم غزنی میں ترکی فنون لطیفہ (ایٹنگ ہازوین، واشنگٹن)
۴۹- ترکی اثر مغلیہ فنونِ لطیفہ پر ہند میں (بلیے براون، پارلیس)
۵۰- استانبول کے قبرستانوں کے کتبے (معین اطانچ، استانبول)

۵۱- عربی خط کا ولولہ خیز درجہ فن لطیف میں (مدحیہ، استانبول)

۵۲- ماخذ ہائے فقہ کا جدید مطالعہ (قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس کے علاوہ دیگر ایک درجن ماخذ، راسخ العقیدہ فقہا کے ہاں (ناچیز راقم الحروف)

موتمر نے متعدد قراردادیں بھی منظور کیں کہ مختلف حکومتوں سے خواہش کی جائے کہ وہ اپنے ہاں کے کتب خانہ ہائے عمومی کے مخطوطات کی فہرستیں شائع کریں اور فوٹو لینے کے انتظامات کریں، مخطوطہ کتابوں کے علاوہ دستاویزوں کے مطالعہ پر اہل علم توجہ کریں اسلامیات کا خصوصی مطالعہ کرنے والوں کی ایک خصوصی انجمن بنالی جائے اور آئندہ اجلاس انگلستان میں ہو (جو تین یا چار سال بعد ہوگا)۔

موتمر مستشرقین کے سلسلہ میں استانبول کے علاوہ درجن بھر دیگر ترکی شہروں میں بھی علمی نمائشیں کی گئی، جن میں قلمی کتابیں، تصویریں، قدیم آلات وغیرہ وغیرہ بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں جمع کی گئی تھیں۔

آئندہ سال ۱۳۷۲ھ ۵ر جمادی الآخر کو مولانا روم کی وفات پر پانچ صدیاں گذر رہی ہیں اور ۱۶۵۳ء عیسوی میں فتح قسطنطنیہ کی پانچ صد سالہ سالگرہ سرکاری طور پر ترکی میں منانے کا انتظام ہو رہا ہے۔

یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ مکتوب مبارک نبوی بنام مقوقس موجود ہے اور عجائب خانہ توپ قپوسرا ے میں کمرہ آثار مبارک میں ایک سنہری صندوق میں عزت واحترام سے محفوظ ہے۔

ترکی حکومت نے مہمانداری کے جو انتظامات کئے تھے اس پر سارے یورپی وامریکی شرمندہ تھے، کہ ان کے ہاں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا۔(۱)

(۱) معارف: اس کے مقابلہ میں ہم ہندوستانیوں کی میزبانی کا حال یہ ہے کہ ابھی گذشتہ اکتوبر میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا جو اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا اور جس میں ہندوستان کے علاوہ بیرونی ملکوں کے بعض نمائندے بھی آئے تھے، اس میں میزبانی کا جیسا انتظام تھا، اس کو دیکھ کر گردن شرم وندامت سے جھک جاتی تھی کہ بیرونی ملکوں کے نمائندوں کا سوال تو الگ رہا، خود ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے بلند اور ستھری معاشرت کے لوگوں نے اہل لکھنؤ کی میزبانی اور سلیقہ وتمیز کے متعلق کیا راے قائم کی ہوگی، مگر اس میں اہل لکھنؤ کا شکوہ بے کار ہے اس لئے کہ لکھنؤ جن لوگوں سے عبارت ہے وہ اس میں دخیل ہی نہ تھے۔

موتمر کے شعبہ ہائے اسلامی نے جہاں اور قرار دادیں منظور کیں وہیں یہ بھی تھی کہ دائرۃ المعارف جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد، دکن) کی خدمات کو وہ قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور توقع کرتے ہیں وہ روز افزوں پھلے پھولے گا اور اپنی خدمت علم کو سدا جاری رکھے گا۔

(معارف جلد ۶۹ شمارہ ۳ بابت ماہ مارچ ۱۹۵۲ء)

کیمبرج کی موتمر مستشرقین عالم

از

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

''محترم جناب اڈیٹر صاحب معارف ۔ اعظم گڑھ

سلام مسنون: معلوم نہیں تازہ موتمر مستشرقین کی روئداد

آپ تک پہنچی یا نہیں، بصورت نفی مندرجۂ ذیل تذکرہ شاید ناظرین کی

دلچسپی کا باعث ہوگا۔''

تمہید و مبادیات اگر چہ بعض حالات نے مجھے موتمر میں شرکت کے لئے کیمبرج جانے کا موقع نہ دیا، لیکن مختلف لوگوں سے جو چشم دید حالات سنے اور موتمر کے جو سرکاری نشریات دیکھے، ان کی روشنی میں یہ معلومات ناظرین کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔

موتمر کا گذشتہ اجلاس استانبول میں ہوا تھا، جس کی دو روئدادیں معارف میں چھپ چکی ہیں، وہاں کی قرارداد کے مطابق تازہ اجلاس انگلستان میں ہوا، اس کی دعوت رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے دی تھی، اور ملکۂ برطانیہ نے سرپرستی قبول کی تھی، اور اس کے لئے کیمبرج کا انتخاب ہوا، جس کی وجہ غالباً اس کا جامعاتی قرونِ متوسطہ کا ماحول بھی ہے اور شہر کا حسن بھی، کیونکہ آکسفورڈ اب ایک صنعتی شہر بن گیا ہے جس کی پرانی ہیئت بدل گئی ہے، یہ موتمر کا تیئسواں اجتماع تھا، جو ۲۱ تا ۲۸ راگست ۵۴ء کو منعقد ہوا، آئندہ اجلاس تین سال بعد جرمنی میں ہوگا۔

جو فرنگی استانبول کے اجتماع میں وہاں کی اسلامی مہمان نوازی دیکھ چکے تھے، وہ کیمبرج کی ''ترقی یافتہ'' اور ''مہذب'' مہمان نوازی پر اگر زبان سے اعتراف نہ بھی کریں تو دل میں ضرور شرمائے ہوں گے، کالجوں کے اقامت خانے رہائش کے لئے مفت تھے اور اسی کے باورچی اور ملازم بھی تھے، پھر بھی قیام و طعام کا اقل ترین خرچ تیس شلنگ روزانہ لیا گیا، جو عام ہوٹلوں سے بھی

گراں تھا۔

دعوت نامے میں سب سے پہلے یہ درج تھا کہ پروٹسٹنٹ، کیتھلک اور یہودی عبادت کا انتظام کن مقاموں پر کس کس وقت ہوگا، جب موتمر میں شرکت کرنے والے عربی نام والے صاحب بہادروں کو خود ہی فکر نہ ہو تو اسلام کو کون پوچھتا، جب مدعی خود سست ہو تو گواہ کیوں چست ہوگا؟

برسوں کی بے تعلقی کے بعد پہلی مرتبہ اس دفعہ روس سے بھی دس بارہ نمائندے آئے تھے، انتخاب اگر چہ ایسے لوگوں کا کیا گیا تھا جو انگریزی اچھی جانتے تھے، لیکن عصبیت یا خودداری کہ انھوں نے اپنی مادری زبان ہی میں سارے مقالے سنائے مگر ان کی اس جدت کو اور لوگوں نے رشک کی نظر سے دیکھا کہ ان مقالوں کے انگریزی ترجمے بھی وہ طبع کرا کے ساتھ لائے تھے اور حاضرین میں مفت تقسیم کردئے گئے تھے، عموماً ہر شعبے میں ان نمائندوں نے حصہ لیا، فانوسی تقریروں کے ذریعہ مزید دلچسپی پیدا کی گئی، اگر چہ فنی نقطہ نظر سے ان رنگین فلموں کی سب نے داد دی لیکن اس کا منشا چونکہ علم سے زیادہ دعایہ اور پروپیگنڈا تھا، اس لئے ہر شخص کا ردعمل اس کے حوصلے کے مطابق تھا، ان میں سے ایک ''بزرگ'' کی تحقیق واستنباط یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل مکہ جس ''اللہ'' کی پوجا کرتے تھے وہ ایک بڑا سرمایہ دار تاجر سمجھا جاسکتا ہے، دوسرے ''بزرگ'' نے دو قدم آگے بڑھ کر یہ ارشاد فرمایا کہ مسیلمہ کذاب نے قرآن مجید کی نقالی کرکے اس کا منھ نہیں چڑایا تھا، بلکہ اصل میں مسیلمہ کذاب کے ''ادبی شہ پاروں'' کی نقالی کرکے پیغمبر اسلام نے قرآن مجید تیار کیا تھا، اگر خداوندان ماسکو کا منشا صرف خدا پرستی اور ہر ایک خدا کو ماننے والے دین کی مخالفت ہوتو البتہ ان ''تحقیقاتوں'' کو کسی نہ کسی حد تک درست کہا بھی جاسکتا تھا، لیکن جو لوگ غیر جانبداری سے سیاسیات عالم کا مطالعہ کرتے ہیں اور جنھیں نہ روس سے دشمنی ہے اور نہ امریکہ سے کوئی خوش عقیدگی وہ اس طرح کی بوالعجبیوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں، روس کا یہ منشا تو سمجھ میں آتا ہے کہ سویٹ علاقہ میں بسنے والے سارے مسلمانوں کو دہریہ اور اشتراکی بنایا جائے، اسی طرح اس کی اس سیاست کو بھی بااصول قرار دے سکتے ہیں کہ اپنے خفیہ کارندوں کے ذریعہ وہ ساری دنیا میں مذہب شکنی کے پرچار میں مشغول رہے، لیکن حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اپنے حریف امریکہ اور اس کے رفقا کا اثر گھٹانے اور ان اسلامی ممالک کو جو اس وقت حریف کے زیر نگیں تو نہیں لیکن زیر اثر ضرور ہیں، اپنا ہمنوا بنانے کی جب وہ کوشش کررہا ہے اور اس کے لئے حج کو ہر سال سرکاری اہتمام سے چند افراد بھیجے

جاتے ہیں، اور قاہرہ کے سفارت خانے میں کثرت سے مسلمانوں کو مامور کرکے ان کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ پابندی سے نماز با جماعت مسجدوں میں پڑھا کریں، ایسی حالت میں اپنے مخفی نمائندوں کے ذریعہ نہیں، بلکہ علانیہ و مسلمہ سرکاری نمائندوں کے ذریعہ، کیمبرج جیسے مقام پر ایسی حرکتیں کیوں کی جاتی ہیں جن سے روس کے حریفوں کو ایک مفت کا حربہ ہاتھ آتا ہے؟ یہ واقعہ ہے کہ آج کل سارے آزاد اسلامی ممالک امریکہ، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور بلجیم وغیرہ سے نالاں ہیں، ان حالات میں روس کے لئے یہ آسان تھا کہ وہ اپنے کو مظلوموں کا ہمدرد ظاہر ہی نہیں بلکہ ثابت بھی کرے، اس کے لئے ایک آدھ ووٹ اسرائیل کے خلاف کبھی کبھی دے دینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی اعلان کردہ سرکاری پالیسی پر عمل کرے کہ وہ آزادی اور ناطرفداری کا حامی ہے اور یہ پالیسی عملاً اندرونِ ملک کے مسلمانوں کے ساتھ برتی جائے اور بیرونِ ملک ان حماقتوں کا سدباب کیا جائے، جس کا کیمبرج میں مظاہرہ کیا گیا۔

تقسیم کار تقریباً نو سو نمائندوں کے اجتماع کے باعث کام کو بارہ شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا، جس کی سرکاری ترتیب یہ تھی۔

۱۔مصریات ۲۔سامی لسانیات ۳۔اشوریات

۴۔ایران، آرمینیا، وسطی ایشیا ۵۔آلتائی (ترکی) السنہ ۶۔ترکیات (تاریخ)

۷۔ہندیات ۸۔مشرقِ بعیدہ ۹۔الف اسلام (السنہ، ادبیات وفنون لطیفہ)

۱۰۔اسلام (تاریخ و مذہب ۱۱۔مشرق و مغرب کا تماس اور مشرقی ممالک کی عیسائیت

۱۲۔افریقہ

معلوم نہیں اس تقسیم کی ترتیب کس اصول پر کی گئی، ہم کو بے وجہ بدگمانی نہیں کرنی چاہئے۔

منتخب مقالے نظام العمل میں مقالے جس ترتیب سے درج ہیں اس کو برقرار رکھتے ہوئے چند ایسے عنوانوں کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے، جو معارف کے ناظرین کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ (رموز: گ انگریزی، ف: فرانسیسی، ج: جرمن):-

۱۔مسٹر غنیم (گ) سقارہ میں تیسرے مصری خانوادے کے نئے سیڑھی دار اہرام کے ایک احاطے کی دریافت

۲-E. J. Baamgartel (گ) خانوادہ داریت سے قبل کا مصری فن تعمیر

۳- عبدالرحمٰن بدوی (گ) قدیم مصری اصول تعمیر کے متعلق بعض لسانیاتی شواہد

۴- Y.Yadin (گ) تیسرے الفیہ قبل مسیح کے آغاز پر فلسطین و مصر کے حربی تعلقات

۵- مسٹر حسن (گ) ابوالہول کے راز نئی کھدائیوں کی روشنی میں۔

۶- W.F.Albright بنی اسرائیل کے خروج مصر سے متعلق چند ملاحظات۔

۷- J.Rykman (ف) وسطی عرب کے ثمودی کتبوں پر عارضی تبصرہ۔

۸- Y.C.M.Rykman (ف) وسطی عرب میں ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۲ء میں چٹانوں پر دستیاب شدہ سبائی کتبوں کی مختصر فہرست۔

۹- سینٹ جان عبداللہ فلبی (گ) سعودی عرب میں ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۲ء کی کتبات کی تلاش کی مہم کا جغرافی اور عام تذکرہ۔

۱۰- ایضاً ملکۂ سبا کے ملک کی تلاش (ایک فلم)

۱۱- G. M. Fitygerald (گ) بکسوس بادشاہوں کے قلعے اور جنگی رتھیں (حضرت یوسفؑ کے زمانے میں یہی شامی خانوادہ مصر پر حکمران تھا)۔

۱۲- H. Birkeland (گ) قدیم کلاسیکل عربی لہجے کا اتار چڑھاؤ (accent)

۱۳- J. Pirenne (ف) یونان اور سبا کے تعلقات، جنوبی عرب کی تاریخ اور واقعات کا زمانہ معین کرنے کی ایک نئی اساس۔

۱۴- W. Martin (گ) سامی السنہ کے صیغۂ امر کی اصلیت۔

۱۵- مسٹر مسقطی (گ) سامی السنہ کا صیغۂ جمع۔

۱۶- J. Schkirmann (گ) قرون متوسطہ کی عبرانی شاعری میں خوبصورت لڑکا (امرد پرستی)

۱۷- C. J. Edmonds (گ) عراق کے اہل حق۔

۱۸- T. J. Bibby (گ) ڈنمارک کی ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۴ء میں بحرین بھیجی ہوئی علمی مہم کا مختصر اور ابتدائی خاکہ۔

۱۹- Enricoceralli (گ) قرون متوسطہ کے مغربی افسانوی واقعات کا فارسی مخطوطات کے ایک نئے ذخیرے میں ذکر۔

۲۰- R. Steihl اور F. Altheim (ج) بہرام چوبین کا افسانہ

۲۱-R. Fryue (گ) کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس بن وشمکو کا اندوز نامہ۔

۲۲-مسٹر موقر (گ) ایران کی تازہ اثریاتی دریافتیں۔

۲۳-احمد آتش (ف) شاہنامہ فردوسی کی تکمیل کی تاریخ۔

۲۴-V. Minorsky (ف) اسلامی ایران کے جغرافیہ وتاریخ پر چند نشریات

۲۵-مسٹر تیمور (ج) سیواس میں ۱۳۲۶ء کا ایک عربی وترکی وقف نامہ۔

۲۶-مسٹر منصور اوغلو (گ) قدیم اناطولی ترکی کے شخصی ناموں اور لقبوں پر چند ملاحظات

۲۷-احمد امرے (ف) ترکی زبانوں اور انڈو یوروپی زبانوں کے تعلقات (اردو اور ترکی میں اتنی مشابہت ہے کہ اس کا لفظی ترجمہ گلابی اردو نہیں بلکہ فصیح اردو ہوتا ہے۔)

۲۸-عثمان طوران (گ) قرون متوسطہ کے ترکوں میں جہانگیری کا تصور۔

۲۹-فائق رزیت اونات (گ) مورخ نشری کی حیات وتالیفات پر جدید تحقیقاتیں۔

۳۰-خلیل اینالجی (گ) عثمانی سلاطین ترکی کی فتوحات اور مقامی امراء ومعززین۔

۳۱-زکی ولیدی طوغان (ج) ازبکیون کی رزمیہ نظم "خان نامہ" کی ممکنہ تاریخی اساس۔

۳۲-طیب گوکبیلگین (ف) سلطان سلیمان قانونی کے عہد کے علاقہ رومیلی کی تنظیم اور اس کا نظم ونسق۔

۳۳-بکر صدقی بائیکل (ج) سلاطین آل عثمان سے فیصلہ کن جنگ کے متعلق اوزون حسن کی تیاریاں اور جنگ کا آغاز۔

۳۴-Deny (ف) سترھویں صدی عیسوی کا ایک عالم ترکیات علی بابا البرٹ بابوفلکی۔

۳۵-اولوجان چغتائی (گ) عثمانی سلاطین کی بیویاں۔

۳۶-احمد دانی (گ) تاریخ ہند کا پس منظر آثار قدیمہ کی روشنی میں۔

۳۷-Asilva Rego (گ) پرتگالی دستاویز خانوں میں ہندی مواد۔

۳۸-Richard Whitehead (گ) جہانگیر کے کتبوں پر منطقۃ البروج کی علامتیں۔

۳۹-Alfrel Master (گ) ہندی اور اردو کی اصلیت اور اس کا آغاز۔

۴۰-F. P. Bargebarkr (گ) قصر الحمراء گیارھویں صدی عیسوی میں۔

۴۱-بیگم F E Day (گ) اموی ظروف اور برتن

۴۲-J. V. Mac mulan (گ) ابتدائی اسلامی کے کمبل؟

۴۳-ابوالعلی عفیفی (گ) ابن عربی کی تالیفات

۴۴-ولید عرفات (گ) کتب سیرت میں منقولہ نظموں خصوصاً حضرت حسان بن ثابتؓ کے اشعار کی صحت۔

۴۵-محمد خلف اللہ (گ) چوتھی صدی ہجری میں اعجاز قرآنی کا تصور۔

۴۶-مسٹر مزالی (ف) القزاز اوراس کی تالیف وسائس الشعر

۴۷-L.A.Mayeer (گ) اسلامی تعمیرات کے متعلق چند حقائق اور چند گتھیاں۔

۴۸-B.S.Rice (گ) عربی مخطوطات کے منقش سرورق کا ارتقاء۔

۴۹-بیگم Van Berchem (ف) صحرائے الجزائر کے ریگ میں دفن شدہ شہر سدراتہ کی کھدائی کے دوموسموں کا نتیجہ۔

۵۰-J. Walker (گ) اموی اصطلاحات سکہ سازی کے بعد کے اولین سکے۔

۵۱-J. Rabson (گ) اسناد اسلامی علم حدیث میں۔

۵۲-G. Vajda (ف) پاریس کے کتبہ خانہ عام کے چند عربی مخطوطات کے سماعات واجازات۔

۵۳-G. Weil (گ) خلیل کے علم عروض کی کلید۔

۵۴-C. Cahen (ف) بحر متوسط کے اسلامی ممالک کی معاشی اور سماجی تاریخ۔

۵۵-G. Wiet (ف) مملوک سلاطین کا ایک حکمنامہ مکہ معظمہ میں۔

۵۶-مسٹر مہدی (گ) ابن خلدون کے علم عمرانیات کی اساس قدیم کلاسیکل فلسفہ اور اسلامی فلسفہ میں۔

۵۷-M. Plessner (گ) طب اور سائنس پر عربی مخطوطوں کی ایک عالمگیر فہرست

۵۸-F. Gabrieli (ف) جغرافیہ ادریسی کے کامل نسخے کی اشاعت کی تجویز۔

۵۹-L. Massignon (گ) بی بی فاطمہؓ سے عورتوں کی عقیدت کا اصل منشاء۔

۶۰-مسٹر ادریس (ف) زیری سلاطین کے زمانہ میں مالکیوں کا شیعوں سے مناقشہ گیارہویں صدی عیسوی میں (شمالی افریقہ میں)۔

اس کی توقع کم ہے کہ یہ مقالے کبھی یکجا شائع ہوں گے، اکثر لوگ اپنے پسند کے رسالوں

میں اپنا مضمون دیدیتے ہیں اور بعض کے چھپنے کی کبھی نوبت ہی نہیں آتی، اس کی وجہ ارباب موتمر کے پاس رقم کی کمی ہے، کیا ترقی یافتہ مغرب میں علم کی کساد بازاری اس سے کم ہے جس کی اہل مشرق کے متعلق شکایت ہوتی ہے؟

شاید اس مختصر رپورٹ میں کسی کو کوئی کام کی چیز مل جائے، مجھے خاص کر نمبر (۵۷) اور (۵۸) سے دلچسپی ہوئی۔

(معارف جلد ۷۴، شمارہ ۶ بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۴ء)

موتمر مستشرقین عالم کا اجلاس میونک ۱۹۵۷ء

از

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

اس موتمر کا عموماً سہ سالہ اجتماع ہوتا ہے۔ استانبول اور کیمبرج کے اجلاسوں کی روداد سے معارف کے ناظرین واقف ہو چکے ہیں۔ اس کا چوبیسواں اجلاس ۲۸ / اگست سے ۴ / ستمبر تک میونک (مغربی جرمنی) میں ہوا تھا۔ مدعوئین میں تقریباً پندرہ سو فضلا تھے جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ مٹھی بھر مسلمان بھی تھے لیکن الحمدللہ انھوں نے بہت اچھا اثر چھوڑا۔ ترک، تونسی، شامی وغیرہ مختلف ملکوں کے مسلمانوں نے شعبہ وار اجلاسوں کی صدارت بھی کی۔ ہندی مسلمانوں میں دو ایک طالب علم جو یورپ میں موجود تھے، آ گئے تھے۔ باقی سرکاری نمائندگی تھی جس کے لئے اب مسلمان چنے نہیں جاتے، آئندہ اجلاس ۱۹۶۰ء میں حکومت روس کی دعوت پر لینن گراڈ میں ہونا طے پایا ہے۔

موتمر سے خواہش کی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کے لئے (جن کی کوئی مسجد شہر میں نہیں ہے اور جن کو ہفتے میں ایک بار نہیں بلکہ روزانہ پانچ بار نماز پڑھنی پڑتی ہے) کانگریس کے احاطے میں کوئی کمرہ خاص کر دے۔ منتظمین نے اسے خوشی سے منظور کیا۔

موتمر کا کام اتنا وسیع ہے اور اس میں حصہ لینے والے اتنے زیادہ ہونے لگے ہیں کہ مقالوں کو چودہ شعبوں میں بانٹنا پڑا اور ان کے اجلاس بہ یک وقت ہوتے رہے۔ آدھے سے زیادہ کام اسلام اور مسلمانوں یا اسلامی علاقوں کے ساتھ خاص تھا، جس سے دنیا میں ان کی اہمیت محسوس ہوتی ہے۔ جس کا اندازہ اس فہرست سے ہوگا۔

(۱) مصریات (۲) خط میخی اور مغربی ایشیا (عراق وغیرہ) (۳) توریت و یہودیت (۴) عیسائیت (۵) سامی السنہ (۶) اسلامی السنہ (۷) اسلامی تاریخ و فنون لطیفہ (۸) ترکیات (۹)

ایرانی وقفقازیات (۱۰) ہندیات (۱۱) وسطی ایشیا (۱۲) چین و جاپان (۱۳) جنوبی ومشرقی ایشیا انڈونیشیا (۱۴) افریقائی زبانیں۔

ان موضوعوں پر کوئی ساڑھے چار سو مقالے پڑھے گئے جن میں سے بعض میں فانوسی تصویریں بھی دکھائی گئیں، تقریریں صرف تین زبانوں میں منظور کی گئی تھیں، جرمن، فرانسی یا انگریزی، روسی نمائندوں نے اپنی تقریروں کو انگریزی میں چھاپ کر سب حاضرین میں تقسیم کرنے کی جدت کی تھی۔ یہ کام حکومتیں کر سکتی ہیں، کریماں را دست اندر درم نیست۔

یہ تو ممکن نہیں کہ سارے مقالوں کا خلاصہ دیا جائے محض عنوانات لکھنے کے لئے بھی کافی جگہ کی ضرورت ہے، اس لئے منتخب عنوانوں کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔

مصریات (۲۲ مقالے) ۱۔سلیم حسن (قاہرہ) اوناس میں جدید کھدائی۔

۲۔روڈالف آنتیں (فلاڈلفیا) مطرحینہ میں کھدائی۔

۳۔ژان درکوتے (خرطوم) ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۰ء میں سودان میں اثریاتی تحقیقات۔

۴۔لبیب حبشی (الاقصر) رعمسیس دومہ کے زمانے میں مصر اور لیبیا کے تعلقات۔

۵۔حسن ثابت (خرطوم) سلطنت نپتو کے خارجہ تعلقات۔

۶۔دی جے آذربیف (موسکو) قدیم مصر کے معاشی اور ثقافی اثرات باہمی بیرونی ممالک سے۔

اشوریات اور میخی خط (۵۵ مقالے) ۱۔معزز چیغ (استانبول) استانبول کے عجائب خانے میں ۱۹۵۰ء کے بعد سے تحقیقاتی کام حصہ اول۔

۲۔خدیجہ قزل آلی (استانبول) ایضاً حصہ دوم۔

۳۔ای اے اشپائزر (فلاڈلفیا) مسکین اشوری تمدن میں۔

۴۔سی جے گیاڈ (لندن) بنو تعدی کی حکومت عرب میں۔

۵۔ژورژرد (بصرہ) زیریں عراق کا قدیم جغرافیہ۔

۶۔سلیمان مصطفےٰ زبیں (تونس) قدیم مشرقی قربیہ کے فنون لطیفہ کے بعض اثرات افریقیہ کے اسلامی فنون لطیفہ میں۔

۷۔ڈبلیو ایف البرائٹ (بالٹی مور) قبل اسلام عرب کی سنہ وار تاریخ۔

توریت اور یہودیات دو مقالے ۱۔ایس ایم عبدالعال (لیڈس) سامریوں کے

عقائد و عبادات پر اسلامی اثرات۔

۲-الگزانڈر شرابیرر (بوداپسٹ) ہنگری میں ترکی دور کے عبرانی دفتر۔

عیسائی مشرق اور بیزیطین (۷ امقالے)

۱-فریدون دیر متکین (استانبول) آلیکسی اور مانویل کوسنین کے محلات کا صحیح محل وقوع۔

۲-سماوی ای جے (استانبول) خانوادہ پالیولوگ کے زمانے کا مذہبی فن تعمیر۔

سامیات (۲۳ مقالے)

۱-گونزاک ایکمان (بلجیم) جنوبی عرب کے کتبوں میں آسمان وزمین کا ذکر۔

۲-توفیق فہد (اسٹراسبورگ) قبل اسلام کے ازلام کعبے میں۔

۳-ژاکلین پیرئین (بلجیم) جنوب عرب کی تاریخ میں سلطنت قتبان کا اختتام۔

۴-استفان اسٹریلسین (وارسا) ایک یمنی الاصل حبشی روایت ''خط'' کے متعلق۔

اسلامیات، حصہ ادبیات (۳۴ مقالے)

۱-اڈالف گرومان (آسٹریا) قرآن کریم کے قدیم نسخوں کی تاریخ کا تعین۔

۲-صلاح الدین المنجد (قاہرہ) ادارۂ مخطوطات عربی اور اس کی کارکردگی۔

۳-یحییٰ خشاب (قاہرہ) نظام الملک اور سیاست نامہ۔

۴-جورج قنواتی (قاہرہ) قاضی عبدالجبار معتزلی کی المغنی فی اصول الدین۔

۵-آنماری شمل (انقرہ) اقبال کا جاوید نامہ۔

۶-محمد طالبی (پاریس) قراءۃ بالالحان۔

۷-عابد مزالی (تونس) تفسیر یحییٰ بن سلام۔

۸-دی آئی بلیائف (موسکو) الاوراق للصولی کا مخطوطۂ لینن گراڈ۔

۹-آرد التسر (آکسفرڈ) فارابی کی آراء المدینۃ الفاضلہ۔

۱۰-مادموازیل ڈالویرنی (پاریس) الکندی کے دو غیر مطبوعہ رسالے، علم مرایا اور سحر پر۔

۱۱-عباس زالیات (جرمنی) ابوحیان توحیدی کا ایک نایاب واحد مخطوطہ۔

۱۲-ایلویل سسٹن (ایونبرا) فارسی علم عروض۔

۱۳-باوزانی (روما) فارسی ادبیات میں ''ہندی انداز''

۱۴-محمد ابراہیم الکتانی (مراکش) ''المورد الاحلی فی اختصار المحلی'' اور المقدح المعلی فی

اکمال المحلی"۔

۱۵۔ فبلکس پریٹخا (مجریط اسپین) مخطوطہ کتاب الشطرنج ص ۲۲۳۴ عاطف آفندی استانبول

۱۶۔ امجد طرابلسی (دمشق) زجر النابح لابی العلاء المعری (از برٹش میوزیم)

۱۷۔ مجتبیٰ مینوی (طہران) کلیلہ ودمنہ کا اختصار از خلیفہ مامون۔

۱۸۔ ڈاکٹر فلوصی (بغداد) عراق کی جدید مختصر کہانیوں کے رجحانات۔

اسلامیات حصہ مذہب، تاریخ وفنون لطیفہ (۴۵ مقالے)

۱۔ صبحی لبیب (بامبورگ) قرون متوسطہ کے مصر میں قرض دینے کے اصول۔

۲۔ داؤد آیالون (اسرائیل) سلاطین مملوک کی بحری جنگیں۔

۳۔ صابر خان (کلکتہ) مسکویہ نے اپنی ہم عصر معاملات کن مصادر سے حاصل کیں۔

۴۔ انوار الحق (مدراس) اسلامی سیاسی تصورات کے اثرات قرون متوسطہ کے یورپ پر

۵۔ ایگناس خلیفہ (بیروت) ابن خلدون کا ایک غیر مطبوعہ رسالہ۔

۶۔ والٹر فشل (برکلے) ابن خلدون اور تقابل مذاہب۔

۷۔ علی زادہ (موسکو) رشید الدین خان کی جامع التواریخ۔ یہ عنوان دیا گیا تھا، لیکن جو مقالہ پڑھا گیا، اس کا عنوان تھا تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں آذربیجان کا نظام مالگزاری آراضی۔

۸۔ عثمان طوران (انقرہ) سلجوقی دور میں اسلام کی اشاعت۔

۹۔ موریس ڈیمانڈ (نیویارک) امریکی عجائب خانوں میں قدیم اسلامی ایرانی برونز کے برتن

۱۰۔ عباس مزدہ (طہران) قدیم ایرانی کانچ کے برتن ۱۵۰۰ ق م تا ۱۵۰۰ء

۱۱۔ ارنسٹ کیونل (برلن) برلین کے عجائب خانوں کی بعض نامعلوم تصویریں۔

۱۲۔ ڈی ایس رائس (لندن) جامع مسجد حران کے پتھروں میں اہل اسلام کے بعض کتبات

۱۳۔ امیر موریس شہاب (بیروت) آنجار میں ایک اموی قبل کی دریافت۔

۱۴۔ فواد مسنر گین (استانبول) حدیث کی روایت کے بعض پہلو۔

۱۵۔ اے جانس (جوگجا کرتا) اسلام جدید انڈونیسیا میں۔

۱۶۔ محمد حمید اللہ (پاریس) جمالیات اور فنون لطیفہ تعلیمات نبوی میں اس کو میونک کے ریڈیو نے ریکارڈ کر کے نشر کیا۔

۱۷-سلیم بیراقدار دوچ (بلگراڈ) جنوبی سلاف ممالک میں مشرقی میراث فنون لطیفہ میں
۱۸-صبح عبدالعال (کیمبرج امریکہ) حجاز میں پہلی صدی ہجری میں بڑی جاگیریں۔
۱۹-ای اے بیلائف (موسکو) ساتویں صدی میں اسلامی فرقہ بندیاں۔
۲۰-اوکتائی ارسلان آپا (استانبول) تبریز کے فن کار دربار استانبول میں۔

ترکیات (۲۶) مقالے

۱-احمد حمدی تانپنار (استانبول) ترکی شاعری میں مرثیہ۔
۲-جی یشکے (مونسٹر) وحید الدین محمد سادس۔
۳-ٹی بیلکلی ،وغلو (انقرہ) صلح نامۂ مدروس ۱۹۱۸ء کی ایک غیر مطبوعہ دستاویز۔

ایران وقفقاز (۳۷) مقالے

۱-اے جی مرزایف (موسکو) شہنشاہ نامہ کا مؤلف
۲-محمد باقر (لاہور) ایرانی قاموسیں۔
۳-علی سامی (شیراز) اصطخر اور پسر گادہ۔
۴-بی جی غفوروف (ماسکو) سامانی خانوادے کا عروج وزوال۔
۵-گل پاشا الفت (کابل) خوشحال کھٹک کی شاعری میں روزمرہ کی زندگی کے مناظر۔
۶-محمد مقری (پاریس) اہل حق کے ہاں حلول کا نظریہ۔
۷-عبدالغفور فرہادی رواں (کابل) مشرقی فارسی کے بعض پہلو۔
۸-سیر نجم الدین (کابل) شیخ سعدالدین احمد انصاری کی سوانح عمری۔
۹-ملیحہ طارق آخیا (انقرہ) سعادت نامۂ ناصر خسرو۔
۱۰-ای ای ابرٹلس (موسکو) فردوسی اور سلطان محمود غزنوی۔
۱۱-علی افقہ (طہران) ایران میں ادبی نشاۃ ثانیہ۔

ہندیات (۴۱) مقالے

۱-خواجہ احمد فاروقی (لندن) انیسویں صدی کی ہندی سماجی زندگی کے متعلق اردو فارسی معلومات۔
۲-ظل الوحید (کلکتہ) ہندوستان ہمیشہ غیر تبدل پذیر ہی رہا۔
۳-اربندا باسو (ڈرہام) جدید ہندی تصوف۔
۴-جی ڈیریٹ (لندن) ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۶ء میں ہندو قانون کی تبدیلیاں۔

وسطیٰ ایشیا (۲۵ مقالے)

۱-علی توچکی یاشی (پاریس) چند روسی نام جو آلتائی الاصل ہیں
۲-خالدہ دولو (لندن) سقائی اور لطفی کا تقابل۔
۳-سعادت چغتائی (انقرہ) بطر ۃ الواضح کا مخطوطہ۔

۴- جعفر اوغلو (استانبول) اناطولیہ اور رومیلی پر جدید تحقیقات۔

۵- اے ایم بیلینیسکی (موسکو) ساتویں اور آٹھویں صدی میں صغد۔

چینیات (۳۴ مقالے) ۱- ایل سی گڈرچ (نیویارک) عربوں کے شہر زیتون یعنی چو پر بخو پر نئی روشنی۔

جاپان اور کوریا (۱۱ مقالے) ۱- ڈونالڈ شیویلی (برکلے) سترہویں صدی کے جاپانی شہروں میں ناٹک۔

جنوب، مشرق ایشیا (۱۶ مقالے) ۱- جی ایف ہال (لندن) سفیر اور مستشرق۔

۲- ڈی المیدا (لزبن) جزیرہ تیمور کے فنون اور دستکاریاں۔

افریقیات (۲۸ مقالے) ۱- ایف ڈبلیو پارسن (لندن) عوسہ زبان کی صرف ونحو کے بعض پہلو

عمومی اجتماعات میں تقریریں ۱- کلوو شیفر (پاریس) راس شجرہ وغیرہ کی نئی کھدائی۔

۲- پروفیسر ارومان (استانبول) اناطولیا میں اسلامی فنون لطیفہ۔

۳- پرنس پیٹر ڈنمارک کے علمی مشن افغانستان میں۔

متفرقات موتمر کی طرف سے متعدد تحریکیں بھی منظور ہوئیں، ان میں سے ایک قابل ذکر یہ ہے کہ عرب ممالک میں اعلیٰ معیار کے جو روز افزوں مخطوطے شایع ہو رہے ہیں ان کو قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور مشرق ومغرب میں اس سلسلے میں تعاون کی توقع کی جاتی ہے۔

یہ غالباً پہلی مرتبہ مغرب نے مشرق کی ستایش کی ہے۔

جرمن انجمن مستشرقین کا مشہور رسالہ ZMDQ ایک سوسات برس سے جاری ہے، اس نے موتمر کے سلسلے میں ایک خصوصی نمبر شائع کیا ہے، جس میں ایک مقالہ تھا "جامعہ میونک میں مشرقیات کی تعلیم کی صد سالہ سرگزشت" ایک اور مقالہ عربی زبان کی لغتوں کے متعلق تھا۔

میونک کے کتب خانوں اور عجائب خانوں نے بھی اپنے ذخائر پر معلومات کی ایک باتصویر کتاب شائع کر کے تقسیم کی۔ یوروپ کے قدیم ترین عربی مطبوعات، قرآن وغیرہ کے قدیم مخطوطے میونک میں اور اس طرح کے دوسرے معلومات ان سے حاصل ہوتے ہیں، علاوہ دیگر معلومات مثلاً تصاویر، فنکارانہ مصنوعات غیر اسلامی خاص کر یہودی چیزیں وغیرہ۔

غرض یہ اجتماع جس میں ہر مذہب وملک کے لوگ، ہر رنگ اور ہر خیال کے افراد اور اہل علم کے علاوہ بہت سے تماشائی جمع ہوئے تھے، بہت دلچسپ تھا۔

(معارف جلد ۸۱ شمارہ ۳ بابت ماہ مارچ ۱۹۵۸ء)

موتمر مستشرقین عالم کا پچیسواں اجلاس ماسکو

از

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

تمہید جیسا کہ تین سال قبل (معارف مارچ ۵۸ء) میونک کے اجلاس کی روئداد میں عرض کیا گیا تھا کہ اس اجلاس میں مستشرقین نے حکومت روس کی دعوت کو بغلبۂ آرا منظور کیا تھا، چنانچہ یہ اجلاس ۹ تا ۱۶/ اگست ۱۹۶۰ء کو ماسکو میں منعقد ہوا، اس کے مختصر حالات ناظرین معارف کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

تاریخ ۱۸۷۰ء میں جب بسمارک کے زمانے میں فرانس نے جرمنوں کے مقابلہ میں سخت ہزیمت اٹھائی تو صلح کے بعد فرانس نے سارے یورپ پر حکومت کرنے کے (نپولین والے) خواب کے بجائے مشرق کی فتح بہتر اور سہل تر خیال کی۔ اس مقصد کے لئے مشرق کے متعلق ہر قسم کے معلومات کی ضرورت تھی تاکہ فوجی فتح کے بعد تسلط قائم رکھنے میں سہولت ہو، چونکہ ان فتوحات میں تنہا اجارہ داری کے بجائے بٹوارہ ہی قابل عمل تھا، اس لئے سارے یورپ نے پورے مشرق کے متعلق ہر قسم کے معلومات فراہم کرنے میں تعاون کیا اور ۱۸۷۳ء میں پہلی موتمر مستشرقین اسی شکست خوردہ مقام پاریس میں منعقد ہوئی (جنگ ہٹلری کے بعد بھی پہلی موتمر پھر اسی شکست خوردہ پاریس میں ۱۹۴۸ء میں ہوئی)۔

اس کے بعد دوسرا اجلاس لندن ۱۸۷۴ء (۳) سنٹ پیٹرسبورگ (حال لینن گراڈ) ۱۸۷۶ء (۴) فلارنس (اٹلی) ۱۸۷۸ء (۵) برلین (جرمنی) ۱۸۸۱ء (۶) لائڈن (ہالینڈ) ۱۸۸۳ء (۷) ویانا (آسٹریا) ۱۸۸۶ء (۸) اسٹاکھوم وکرسچیانا (سویڈن وناروے مشترکہ طور پر) ۱۸۸۹ء (۹) لندن ۱۸۹۲ء (۱۰) جنیوا (سوئستان) ۱۸۹۴ء (۱۱) پاریس (فرانس) ۱۸۹۷ء (۱۲) روما (اٹلی) ۱۸۹۹ء (۱۳) ہامبورگ (جرمنی) ۱۹۰۲ء (۱۴) الجزائر ۱۹۰۵ء (۱۵) کوپن ہاگن

(ڈنمارک) ۱۹۰۸ء (۱۶) اثینہ (آتھنس، یونان) ۱۹۱۲ء (۱۷) آکسفرڈ (برطانیہ) ۱۹۲۸ء (۱۸) لائیڈن (ہالینڈ) ۱۹۳۱ء (۱۹) روما (اٹلی) ۱۹۳۵ء (۲۰) بروسلز (بلجیم) ۱۹۳۸ء (۲۱) پارس ۱۹۴۸ء (۲۲) استانبول (ترکی) ۱۹۵۱ء (۲۳) کیمبرج (برطانیہ) ۱۹۵۴ء (۲۴) میونک (جرمنی) ۱۹۵۷ء (۲۵) ماسکو (روس) ۱۹۶۰ء، آئندہ اجلاس غالباً ۳ سال بعد ہوگا۔

تتمۂ تاریخ کے طور پر یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشہور فرانسیسی مؤلف موسیو چنازی نے اپنی کتاب "فرانسیسی شمالی افریقہ خطرے میں" لکھا ہے کہ ۱۸۷۰ء میں جرمنی نے فرانس کے معدنیاتی علاقے الزاس اور مورین چھین لئے تھے، اس لئے فرانس کی توجہ ہٹانے کے لئے ایک دن بسمارک نے فرانسیسی سفیر سے کہا "تونس ایک پکا ہوا میوہ ہے، تم نہ لو تو کوئی اور اسے توڑ لے گا، چنانچہ ۱۸۸۱ء میں فرانس نے اس پر امن اور دوست ترکی صوبہ پر حملہ کر دیا مگر تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر سارے اسلامی ممالک پر فرنگی قبضہ ہو گیا اور اب خدا کی قدرت کرشمے دکھا رہی ہے، اس موتمر کا مقصد اصلی ابتدا میں خواہ سیاسی رہا ہو مگر مستشرقین میں خالص علم دوستوں کی کمی نہیں۔

متفرقات ۱۹۶۰ء کے آغاز ہی سے روسی اجلاس کی دعوتیں اور اس کے متعلق دوسری اطلاعیں آنا شروع ہو گئی تھیں، اور بہت سے لوگوں کو موتمر سے زیادہ روس کے دیکھنے کی خواہش تھی اور یہ خیال تھا کہ سرمایہ پرستوں کی جہنم کی جگہ اشتراکی جنت میں ارزانی اور چیزوں کی افراط بہت زیادہ ہوگی، لیکن وہاں جا کر اچھے اچھے کھاتے پیتے لوگوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ قیام کے تین درجے تھے: درجۂ اعلیٰ میں تیس ڈالر (ڈیڑھ سو روپیہ) روزانہ، درجۂ متوسطہ میں ساڑھے ستاسی روپیہ روزانہ، اور درجۂ ادنیٰ میں ساڑھے سرسٹھ روپیہ روزانہ صرف قیام و طعام کا خرچ تھا، درجہ ادنیٰ میں دو دو تین تین آدمیوں کے لئے ایک کمرہ تھا۔ اسٹیشن سے ہوٹل اور واپسی کا ٹیکسی کا کرایہ پچاس روپیہ بتایا گیا تھا، اس کے باوجود میں نے ہمت کی تھی، لیکن بعد کے ایک اعلان میں بتایا گیا کہ ماسکو سے تاشقند، سمرقند، بخارا اور واپسی کا کرایہ کوئی بارہ سو روپے (ہوائی جہاز میں) ہوگا، اور تاشقند میں ایک دن اور سمرقند و بخارا میں صرف چند گھنٹے قیام ہوگا تو با دل نخواستہ میں نے نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ 'قل انتظروا انا منتظرون'۔ اس لئے ذیل کے معلومات مطبوعہ اعلانات پر مبنی ہیں۔

حاضرین میں جو نظام نامہ تقسیم کیا گیا تھا اس میں بتایا گیا تھا کہ یونانی، کیتھلک، پاپسٹ اور ارمنی عیسائیوں کے گرجے ماسکو میں کہاں کہاں واقع ہیں اور یہودی کنیسے کہاں ہیں، مسلمانوں

کے متعلق تھا کہ بے شارع یو یپولزوف میں مسجد ہے جس میں جمعہ کی نماز ایک بجے ہوتی ہے، اس میں ایک تاتاری النسل عالم امام ہیں اور اچھی عربی بولتے ہیں، کئی سو آدمیوں کی اچھی خاصی جماعت ہوتی ہے۔

سیر و دلچسپی کی چیزوں میں متعدد میوزیم تھے جن میں سے ایک مشرقی ثقافتوں کے لئے مختص ہے، اشتراکی حکومت کو اس سے ذاتی دلچسپی ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ زار کی حکومت گردی کے صرف چند ماہ بعد اسے قائم کر دیا گیا۔ مہمانوں کو ان عجائب خانوں کے علاوہ متعدد فلم، ناچ بھی مفت دکھائے گئے اور کریملن کے دارالامارۃ کی سیر بھی کرائی گئی۔

کانفرنس سے پہلے اخباروں، رسالوں میں مضامین چھپنے شروع ہو گئے تھے، روسی اکیڈمی علوم کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ "سوویرے مے نی ای دوستوک" (ہم عصر مشرق) نکلتا ہے، اس کی جولائی ۱۹۶۰ء کی پوری اشاعت موتمر سے مخصوص تھی۔ اس کے چند مضمون یہ ہیں: "عالم گیر اجتماع مستشرقین" از باواجان غفوروف۔ "ازبکستان میں مستشرقیت" از صاحت عظیم جان بیگم "سوویت مستشرقیت" از گمنام۔ تاجکستان کے دریائے وخش کا تالاب جو زیر تعمیر ہے اور جس سے تیرہ لاکھ ایکڑ زمین زیر کاشت آجائے گی۔ از سینگوف۔ "بابرنامہ باتصویر" از پوزنر ناظم عجائب خانہ ثقافت ہائے مشرقی۔ "بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کی نو سالہ سالگرہ" از غنی ایوا بیگم "افغانستان میں" از تولن شمسی ایف کوغیزی "سامرہ کی کھنڈر دیواروں میں" از وربیانِنس "لبنان کی سیر" از کاتین "ایران میں ارتجاعیت کا دور دورہ" از روما لوف "برطانوی بورنیو کا انجام" از ودِستکی "مشرقی مطبوعات کا ذخیرہ" از وانیشفائن "سرزمینی ریڈن کے اعتراف ہائے جرم" از وونڈانیتکی وغیرہ۔ یہ سارے مضامین باتصویر ہیں، خاص کر بابرنامے کی تصویریں ۴ صفحوں میں بہت نفیس چھپی ہیں۔

وہیں سے "پروبلمی دوستوکو ویدے نیا" (مسائل معلومات مشرقی) نامی ایک سہ ماہی رسالہ نکلتا ہے، اس کے سرورق پر پہلی سطر میں کچھ چینی عبارت ہے، دوسری سطر دیوناگری خط میں पाच्वविला–समस्याय اور تیسری سطر میں عربی خط میں "مسائل الاستشراق" لکھا ہے۔ اس کے بہت سے مضامین دلچسپی کے قابل ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں حکومتی سرمایہ داری، ایران و افغانستان کی سیاست خارجہ اور معاشی ترقی، پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز پر ترکی کسانوں کی بغاوت، الروض المعطار لابن عبدالمنعم الحمیری کا مخطوطۂ مدینۂ منورہ اور اس میں مشرقی وسطی و شمالی یورپ کا تذکرہ، ایرانی رزمیہ نظموں کا اثر بعض روسی شاعروں پر، ہندی آریائی زبانوں میں بعض الفاظ کی

ساخت، موتمر مستشرقین عالم کے دونوں (تیسرے اور پچیسویں) اجلاس کی عہد آفریں اہمیت، ترکمان اشعار کی ایک نادر بیاض، ابوالفرج ہارون کی کتاب الکافی (فی النحو العبرانی) کی اہمیت، بہرام چوبین اور اس کی تاریخ کے ماخذوں کا تقابل، لینن گراڈ کی اکیڈمی علوم کا شعبہ شرق قدیم، چکوسلواکیہ میں ۱۹۵۹ء میں مستشرقیت، سید حبیب احمد وفا ایک انقلاب پسند شاعر اور عالم، ان کے علاوہ اور مضمون بھی ذکر کے قابل ہیں۔

سردیوچنکو نے ایک مقالہ میں بتایا ہے کہ اجنبی زبانوں کے الفاظ و اصوات کا تلفظ روسی خط میں کس طرح دیا جائے اور اس سلسلے میں عربی، اردو، ہندی، فارسی، ترکی، پشتو، منگولی، جاپانی اور کسی قدر چینی کا بھی ذکر ہے۔ (یہ واضح رہے کہ روسی میں ث، ع، غ، ح، ق، ذ، ص، ض، ط، ظ، نون غنہ تو کیا ج، ھ بھی نہیں ہیں، میرے نام جو دعوت نامہ آیا تھا اس پر پتہ میں "موخام مادخامی دول لاخ" لکھا ہوا تھا۔

پیٹراچیک نے براتسلاوا (واقع چکوسلواکیا) کے مخطوطات عربی پر ایک مقالہ میں بتایا ہے کہ اس میں بوسینا (یوگوسلاویا) کے مسلمانوں کی تاریخ پر بعض اہم ومفید کتابیں اور دستاویز موجود ہیں اور ان مخطوطات کی ایک توضیحی فہرست تیار کر لی گئی ہے، اس مضمون میں اس کے علاوہ جن مخطوطوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے وہ ہیں: روضات الجنات فی اصول الاعتقادات، ازہار الروضات، نور الیقین، عقیدۃ اہل السنۃ، مفتاح العلوم للجرجانی، کافیہ لابن حاجب، مرقاۃ الوصول لملاخسرو، آداب البحث للآبھری، الذکر فی زیارۃ اہل المقابر، تبشیر الغزوات فی سبیل اللہ۔

تیرہ صفحے کے ایک طویل مقالے میں جرمن شاعر گوئٹے کے "مغربی مشرقی دیوان" کے اقتباسات دے کر ان کی نئی (اشتراکی) تعبیر کی گئی ہے، اس دیوان سے سر اقبال مرحوم بہت متاثر تھے، اور بجا طور پر تھے اس میں شاعر نے مسلمانوں اور خاص کر رسول اکرم کی بڑی توصیف کی ہے، وہ ایک پورا دیوان ہی حضور اکرمؐ پر لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن حالات نے موقع نہ دیا، اس نے ایسی بہت سی نظمیں اور تشریحی یادداشتیں اپنی زندگی ہی میں شائع کیں، ایک نظم کو اس نے چھپائے رکھا تھا جو اس کے مرنے کے بعد اس کے کاغذوں میں ملی، اسے بھی اس کے ورثہ نے شائع کیا، اس میں رسول اکرمؐ کی پیروی کی اہمیت وافادیت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ گوئٹے اس زمانہ (۱۷۴۹ تا ۱۸۳۲ء) کا شخص ہے، جب یورپی زبانوں میں اسلام اور سیرت پاک پر صحیح اور اچھی کتابیں گویا لکھی ہی نہیں گئی تھیں۔ اس لئے اس کو اس کے خیالات ورجحانات کے باعث اس کے

عہد اور اپنے ماحول کا باغی سمجھا جاتا تھا۔

بونگارولیوین نے مشہور سنسکرت کتاب ارتھا شاستر مؤلفہ کاوٹلیا کے تازہ شائع شدہ روسی ترجمے پر سولہ صفحے کی تنقید کی ہے۔ یہ کتاب اصول حکمرانی اور محصول اور ٹیکس کے مسائل پر ہے، اس کا انگریزی اور جرمن ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اس کتاب کا مصنف اور ماکیاویلی اطالوی مصنف ''پرنس'' اخلاق وانصاف پر حکمراں کے ذاتی مفاد کو مرجح سمجھتے ہیں، کنفوشس نے بھی چینی میں اس موضوع پر جو کتاب لکھی ہے اس کے ترجمے موجود ہیں، امام ماوردی کی احکام السلطانیہ اور ان کے ہم عصر حنبلی امام ابویعلی الفراء کی اسی نام کی کتاب احکام سلطانیہ چھپ چکی ہیں، اول الذکر کا تو جامعہ عثمانیہ نے اردو ترجمہ بھی چھاپا تھا، کاش کوئی علوم سیاسیہ کا ماہر (مثلاً پروفیسر ہارون خاں شروانی) ان کتابوں کا تقابلی مطالعہ کر ڈالتے، فالحق یعلو و لایعلیٰ علیہ۔ ابویعلی نے مصارف زکوٰۃ پر جو بحث کی ہے اس پر عش عش کرنا پڑتا ہے۔

بعض مہمان بھی کارگزاری دکھانے میں پیچھے نہ رہے، مثلاً چکوسلواکیا کی طرف سے مہمانوں میں دو کتابیں تقسیم کی گئیں ایک انگریزی کا پندرہ روزہ اخبار ''نیواوریئنٹ'' اس کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے، دوسری فرانسیسی میں ''مستشرقیت چکوسلواکیا میں'' اس میں عربیات، ایرانیات، مصریات، چینیات، ہندیات وغیرہ وغیرہ پر مستقل باب ہے، اس کے علاوہ چکوسلواکی کتابوں اور عالموں کے حالات اور تعلیم گاہوں کی موجودہ حالت کا ذکر ہے، عربیات کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ۱۶۱۴ء میں یہاں ''تردید قرآن'' کے نام سے ایک کتاب چھپی تھی جس میں ضمناً قرآنی آیات کا چکوسلواکی زبان میں ترجمہ تھا، یہ قدیم ترین چکوسلواکی ترجمۂ قرآن ہے۔

نظم ونسق موتمر کا افتتاح نائب وزیراعظم میکویان نے کیا جو علمی سے زیادہ سیاسی نقطۂ نظر کا حامل تھا، لیکن موتمر کی صدارت روس کے ممتاز عالم اور بلند مرتبہ عہدہ دار باواجان غفوروف نے کی (جن کے ایک مضمون کا اوپر ذکر آیا ہے) ان کی مادری زبان فارسی ہے۔ تین سال قبل موتمر میونک میں جو روسی وفد آیا تھا اس کے نگراں اور صدر بھی یہی تھے۔

اگرچہ دو ہزار مرد اور عورتیں موتمر میں شریک ہوئے لیکن مقالوں کا اعلان صرف (۷۶۶) افراد کے متعلق تھا، اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ماسکو نہ جا سکے۔ مثلاً یہ ناچیز، ایسے لوگوں کی تعداد کافی تھی، لیکن جو مقالے پیش ہوئے ان کی تعداد بھی کئی سو تھی، جن کو انیس شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا، ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) مصریات (۲) اشوریات و بابلیات

(۳) سامی السنہ، عبرانی، بائبل (۴) خطبات

(۵) بیزنطیات (۶) عرب ممالک (صدر نشین زاہدوف، ۴۳ مقالے)

(۷) عربی زبان (۲۵) مقالے (۸) ایرانیات (صدر نشین علی زادہ)

(۹) الف۔ افغانیات (۱۰) وسط ایشیا (صدر نشین مومنوف)

(۱۱) ترکیات و منگولیات (صدر نشین عظیموف) (۱۲) تاریخ ترکی

(۱۳) قفقازیات (صدر نشین محمدوف) (۱۴) ہندیات

(۱۵) جنوب مشرقی ایشیا (انڈونیسیا وغیرہ) (۱۶) چینیات (مگر خود چین سے کوئی شخص نہ آیا کیونکہ چینی اپنے کو عالمگیر قوم سمجھتے ہیں، محض مشرقی نہیں)

(۱۷) کوریا (۱۸) منگولیا (۱۹) سیاہ افریقا

اس تقسیم میں بائبل کے لئے تو ایک شعبہ رکھا گیا تھا، لیکن اسلام کے لئے نہیں، یہ مقالے عربی، روسی، جرمن، فرانسیسی یا انگریزی میں تھے، ان سات آٹھ سو مقالوں میں سے صرف ان چند کا ذکر کیا جاتا ہے جس سے معارف کو دلچسپی ہوسکتی ہے، لیکن مجھے یہ علم نہیں کہ ان میں سے کتنے واقعی پڑھے گئے۔

مقالے

۱-اے ملامت (اسرائیل) حضرت سلیمانؑ کے تعلقات مصر سے۔

۲-اے آلٹ مان (امریکہ) یہودی اسلامی مباحث کا ذکر الباقلانی کے ہاں۔

۳-اے ریل بارسبا (امریکہ) یہودی خاندان میں میمون کی طبابت اور ان کا طب عربی کو یورپ پہنچانا۔

۴-محمد احمد حسین (قاہرہ) حروب صلیبیہ میں استعماری عنصر۔

۵-امین الخولی (قاہرہ) دریائے نیل اور دریائے والگا (روس) کے تعلقات۔

۶-محمد الفاسی امیر جامعہ رباط (مراکش) مراکشی مخطوطات۔

۷-لوی ماسین یوں (فرانس) عرب شہروں کی تشکیل۔

۸-ٹی لیویتسکی (پولینڈ) شمالی افریقہ کے اباضی (خوارج) تاجر قرون متوسطہ کے سوڈان میں

۹-کلود کاہن (فرانس) وقف کی حقیقت و آغاز۔

۱۰-ڈیوڈ نیوبل باربور (برطانیہ) انگلستان کے بادشاہ جان کی سفارت مراکش کے

''میرالویمن'' (امیر المومنین) کے نام۔

۱۱- سلیمان مصطفےٰ زبین (تونس) مغرب اقصیٰ کی اسلامی معماری میں محراب۔

۱۲- اولیگ گرابر (امریکہ) مقامات حریری کا باتصویر نسخہ۔

۱۳- ڈی ایس ایس (برطانیہ) خران میں جولائی تا اگست ۱۹۵۹ء میں اثریاتی کھدائی۔

۱۴- جارج وکینس (کنیڈا) نصیر الدین طوسی کا تذکرۂ سقوط بغداد۔

۱۵- جے کرامرس (جرمنی) ابوعبیدہ، ابن درید اور غلام ثعلب کے بعض نو دریافت شدہ مخطوطے۔

۱۶- جارج اسکانلون (قاہرہ) قرون متوسطہ کے اسلامی فن حرب کے ماخذہائے معلومات

۱۷- نابیہ ایبوٹ (امریکہ) عربی بردی (پاپیروس) اور ابتدائے اسلام کی کتب حدیث

۱۸- محمد حمید اللہ (فرانس) تقویم ہجری (اس میں امام بیہقی کے ایک مخطوطے کی اساس پر بتایا گیا ہے کہ ابتدائے اسلام کے مولفوں کے ہاں اس تقویم کا شمار بیعت عقبہ یعنی ۱ھ قبل ہجرت سے یکم محرم ۱ھ ہجری سے نیز ربیع الاول ۱ھ ہجری کے بعد کے آغاز ۔ھ یعنی محرم ۲ھ ہجری سے غرض تین مختلف سنہ پائے جاتے تھے۔ روایتوں میں سنین کے اختلاف کا اصل باعث یہی معلوم ہوتا ہے، مثلاً غزوہ بنی المصطلق کی تاریخ موسیٰ بن عقبہ کے ہاں شعبان ۴ھ ہے تو ابن اسحاق کے ہاں شعبان ۹ھ اور واقدی کے ہاں شعبان ۵ھ۔ نہ کہیں جھوٹ ہے نہ سہو بلکہ طریق شمار کا فرق ہے اور بس۔ ایسی اور بھی مثالیں دی گئی ہیں اور زمانہ جاہلیت کے سال کبیسہ اور نسئی پر بھی بعض نامعروف ونظر انداز حقایق کو اجاگر کیا گیا ہے۔)

۱۹- مجید خدوری (عیسائی ہیں، امریکہ) الرسالۃ مؤلفہ امام شافعی۔

۲۰- مادام کراچ کوفسکی (روس) سولھویں صدی کے بعض نادر مخطوطات قرآن۔

۲۱- ڈی ایم دنلاپ (برطانیہ) لزبن کی اکیڈمی علوم (پرتگال) کے عربی مخطوطات۔

۲۲- آرارنالدیز (فرانس) عربی صرف ونحو اور اس کا اثر تفسیر قرآن پر۔

۲۳- ٹی شوموفسکی (روس) پندرہویں صدی عیسوی کا ایک عربی دائرۃ المعارف بحریہ (غالباً ابن ماجد اسد البحر کے رسائل کے متعلق۔

۲۴- سید مہدی روحانی (ایرانی مقیم فرانس) کیا فلسفے کا آغاز ایران سے نہیں ہوا؟

۲۵- محمد عبداللہ شعبان (امریکہ) الفتوح لابن اعثم میں خراسان کا ذکر۔

۲۶-احمد علی کوہ زاد (افغانستان) تاریخ افغانستان پر انیسویں صدی عیسوی کے بعض مخطوطات۔

۲۷-آیسو بوماچی (اٹلی) غزنوی حکمراں مسعود اول کا تخت۔

۲۸-عبدالغنی مرزایف (روس) صفوی دور کے فارسی ادبیات کا نیا ماخذ (اس میں محمد بدیع ابن محمد شریف ملیحا المتولد ۱۰۵۳ھ کی مذکر الاصحاب کے روس میں سات نسخے ہونے کا ذکر کیا گیا ہے)

۲۹-یوزیف ایلغباین (برطانیہ) برٹش میوزیم میں بلوچی مخطوطے۔

۳۰-محمد نظام الدین (حیدرآباد، دکن) البیرونی کے کارنامے سائنس میں۔

۳۱-ہیرولڈ لامب (برطانیہ) سمرقند میں تیموری عہد کے اواخر کے تبدل پذیر ثقافتی اثرات

۳۲-اے مختاروف (روس) زرفشاں دریا کے بالائی حصے میں بابر کے نام کا ایک کتبہ۔

۳۳-اومیا کوف (روس) پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز پر وسطی ایشیا کے مغربی یورپ سے تعلقات۔

۳۴-جواد الماس۔ قصۂ یوسف مؤلفہ علی، بلغاری تاتاریوں کا ایک علمی کارنامہ۔

۳۵-عمر لطفی بارکان (ترکی) مسجد سلیمانیہ استنبول اور اس کے اوقاف کی تعمیر کا انتظام۔

۳۶-جی یشکے (جرمنی) اتاترک نے جمہوریت کا منصوبہ کب تیار کیا؟

۳۷-عزیز احمد (مقیم لندن) سید احمد خاں و جمال الدین افغانی کا اثر جدید ہندی مسلمانوں کے تصورات سیاسی پر۔

۳۸-شیخ عنایت اللہ (پاکستان) عربوں کا عمل دخل افریقا میں۔

(معارف جلد ۸۶ شمارہ ۵ بابت ماہ نومبر ۱۹۶۰ء)

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا چھبیسواں جلسہ

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

اس سال مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا چھبیسواں جلسہ ۴رجنوری ۱۹۶۴ء سے ۱۰رجنوری ۱۹۶۴ء تک دہلی میں منعقد ہوا، اب تک اس کے جلسے برابر یورپ میں ہوتے رہے، ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہوا کہ ایشیا میں اس کا جو اجلاس پہلی دفعہ کیا گیا، اس کے لئے نظر انتخاب ہندوستان کے دارالسلطنت پر پڑی، خود حکومت ہند میزبان تھی، اور اس کانگریس کے صدر حکومت ہند کے لائق اور فاضل وزیر پروفیسر ہمایوں کبیر تھے، جنھوں نے اس کانگریس میں نہ صرف اپنی قابلیت اور لیاقت کا سکہ جمایا بلکہ ہندوستان کے علمی وقار کو بھی بلند کیا۔

کانگریس میں امریکہ، کنیڈا، میکسیکو، برطانیہ، روس، فرانس، رومانیہ، پولینڈ، ہالینڈ، اسٹریا، ترکی، آسٹریلیا، تنگانائیکا، مصر، عراق، شام، لبنان، اسرائیل، کوریہ، جاپان، ایران، پاکستان اور ہندوستان کے بارہ سو نمائندے شریک تھے، اکثریت ہندوستان کے نمائندوں کی تھی، جنھوں نے مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں کی نمائندگی کی۔

کانگریس کے جلسہ کا انتظام ہر لحاظ سے قابل تعریف تھا، اور اس کے لئے حکومت ہند مبارکباد کی مستحق ہے، نمائندوں کو ہر طرح کی سہولت پہنچائی گئی، ان کے اعزاز میں چائے اور کھانے کی بڑی بڑی دعوتیں ہوئیں، بیرونی مہمانوں کے لئے ہندوستان کے تاریخی مقامات کی

سیر و سیاحت کا بھی انتظام تھا، علمی ضیافت کا بھی پورا سامان تھا، کانگریس کا اجلاس دہلی کی مشہور عمارت وگیان بھون میں ہوا، اس کے افتتاح سے پہلے ہر نمائندہ کے ہاتھ میں حسب ذیل کتابیں تھیں جو منتظمین کی طرف سے مفت تقسیم ہوئیں۔

(۱) ہندوستان میں مشرقی علوم (Oriental Studies in India) (۲) ہندوستان کے آثار قدیمہ، تاریخی یادگاریں اور میوزیم حصہ اول و دوم (۳) دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقے (۴) ہندوستان کے اہم مخطوطات (۵) کانگریس میں پڑھے جانے والے مقالات کے خلاصے دو جلد (۶) ''ہندوستان میں مشرقی علوم'' اس کے اسلامی علوم وفنون کے باب میں دارالمصنفین کی علمی سرگرمیوں کا بھی ذکر تھا، جس کا خلاصہ یہ ہے:

''دارالمصنفین شبلی اکیڈمی ہندوستان کے اہم ترین اداروں میں سے ہے، یہاں سے اب تک اردو زبان میں تقریباً سو کتابیں سیرت، خلفائے راشدین، اسلامی ممالک کی تاریخ، عرب و ہند کے تعلقات، ہندوستان میں تصوف اور ہندوستان کی تمدنی تاریخ وغیرہ پر شائع ہو چکی ہیں، اس علمی ادارہ کی بنیاد مولانا شبلی اور ان کے لائق شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی نے ڈالی، اور انھوں نے جو علمی روایت بنائی اس کو استوار کر کے ان کے جانشین مولانا مسعود علی ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور دوسرے نوجوان اہل علم کی جماعت قائم کیے ہوئے ہے، فی الحال اس کی اہم علمی سرگرمیوں میں ۲۵ جلدوں میں ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ بھی شائع کرنا ہے، جن میں اس عہد کے ہندوستان کے معاشرتی، مذہبی اور تہذیبی پہلوؤں پر تحقیقات ہوں گی، حال ہی میں مولانا ابوالحسن ندوی کی تاریخ دعوت وعزیت دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے، بزم صوفیہ، اقبال کامل، اسلام اور عربی تمدن، حکمائے اسلام، تبع تابعین، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے، گجرات کی تمدنی تاریخ بھی قابل ذکر ہیں، معارف اسلامی علوم وفنون کا بڑا معیاری ماہانہ رسالہ ہے، اسلامی ممالک میں جتنی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ان پر اس میں تنقیدیں اور تبصرے بھی شائع ہوا

کرتے ہیں، اس میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر جو ناقدانہ مضامین ہوتے ہیں، ان کے اعلیٰ معیار کو شاہ معین الدین احمد ندوی اور ان کے رفقائے کار قائم رکھے ہوئے ہیں، اس کے لئے وہ تعریف وستائش کے مستحق ہیں۔''

اسی کتاب میں عربی اور فارسی علوم کے باب میں دارالمصنفین کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

''دارالمصنفین جو شبلی اکیڈمی کے نام سے بھی مشہور ہے، ۱۹۱۵ء میں مولانا شبلی کے علمی مشن کو پورا کرنے کے لئے قائم ہوا، اس کی مطبوعات کے ترجمے مصر، ترکی، ایران اور افغانستان میں ہوئے ہیں، یہاں سے معارف شائع ہوتا ہے، جو اردو کا قدیم ترین معیاری ماہانہ رسالہ ہے، عربی اور فارسی ماخذوں سے جو کتابیں یہاں لکھی گئیں ہیں ان میں کچھ یہ ہیں: تاریخ سندھ از ابوظفر ندوی، بزم تیموریہ از سید صباح الدین عبدالرحمٰن، تاریخ اسلام از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، تاریخ اندلس از سید ریاست علی ندوی، حکمائے اسلام از مولانا عبدالسلام ندوی اور بزم مملوکیہ از سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔''

کانگریس کے اجلاس کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے اس کے گذشتہ اجلاس کے صدر روسی مستشرق ڈاکٹر بی گیفروف نے اپنا الوداعی خطبہ پڑھا، انھوں نے تین سال پہلے کانگریس کے اجلاس کی صدارت ماسکو میں کی تھی، اس خطبہ میں روس میں مشرقی علوم کے متعلق جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا بھی ذکر تھا، جس سے معلوم ہوا کہ منوشاستر، دھمیدا، جتکا مالا کے علاوہ کلام پاک، فردوسی کے شاہ نامہ سعدی کی گلستاں، نظامی کے خمسہ، عمر خیام کے رسائل، امیر خسرو کی شیریں خسرو کے ترجمے روسی زبان میں ہوئے ہیں، پھر ہندوستانی فلسفیوں میں رادھا کرشنن، رائے، چٹوپادھیا، ماہرین معاشیات میں مہال نوبس، واڈیا، مرچنٹ، نرائن، بالجیت سنگھ، مورخین میں سے ہمایوں کبیر، بنرجی اور سنگھ، ماہر لسانیات میں کامتا پرشاد گرو اور دوسرے مصنفوں کی تصانیف روس کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئیں، وہاں ہندوستان کی تاریخ بھی چار جلدوں میں لکھی جارہی ہے، جن میں موجودہ دور کی تاریخ دو جلدوں میں شائع ہوچکی ہے، آخر میں روسی مستشرق نے امن، آشتی، مساوات اور انسداد ظلم پر زور دیتے ہوئے اپنا خطبہ حافظ کے اس شعر پر ختم کیا۔

درخت دوستی بنشاں کہ کام دل بہ بار آرد   نہال دشمنی برکن کہ رنج بے شمار آرد

اس کے بعد جناب ہمایوں کبیر کا خطبہ ہوا جو بڑی خاموشی اور توجہ سے سنا گیا، یہ طویل

ہونے کے بجائے مختصر تھا، لیکن اس کے ایجاز میں بھی اطناب اور اجمال میں بھی تفصیل تھی، جوان کے انداز تحریر اور طرز ادا کی پختگی کی دلیل ہے، اس میں مستشرقین کے کارناموں پر پر مغز تبصرہ تھا، اور ہندوستان پر بیرونی اثرات کے ذکر میں صدر محترم نے بڑی فراخدلی کے ساتھ اس کا اعتراف کیا کہ عہد وسطی سے اسلام اور گزشتہ تین سو برس سے یورپ کی وجہ سے ہندوستان کی زندگی اور طرز فکر میں ایسی بنیادی تبدیلیاں ہوئیں ہیں جن کے نتائج دور رس اور صریحی ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ علوم مشرقی ہی کے مطالعہ سے مغربی ممالک میں تاریخ نویسی کا ایک نیا انداز پیدا ہوا، انگریز ہندوستان آئے تو ان کو تاریخ نویسی کے اسلامی طرز سے سابقہ پڑا، جو عیسائیوں کے مذہبی اور کراماتی انداز بیان سے بالکل پاک تھا، یہ صحیح ہے کہ مسلمان مورخوں نے معاشرہ کے ارتقاء یا تاریخی محرکات سے بحث نہیں کی ہے، لیکن انھوں نے صحیح واقعات قلمبند اور ان کے لئے دیانتداری کے ساتھ ماخذوں اور شہادتوں کو فراہم کرنے میں بڑا اونچا معیار قائم کیا، مسلمانوں کی تاریخ میں شخصیات، حربی تفصیلات اور درباری سازشوں کے واقعات ضرورت سے زیادہ ہیں، لیکن مارکس سے پہلے یورپ کے مورخین بھی انھی واقعات پر زور دیتے تھے، جو بادشاہوں، فوجی سرداروں اور سیاسی مدبروں کی سازشوں اور سرگرمیوں سے ظہور پذیر ہوتے تھے، مرزا ابوطالب (المتوفی ۱۸۰۶ء) پہلے ہندوستانی اہل قلم ہیں جنھوں نے تاریخی واقعات کے ظہور پذیر میں معاشرتی اور اقتصادی رجحانات کی اہمیت کا اندازہ لگایا۔

اس کے بعد جمہوریہ ہند کے صدر ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کا افتتاحیہ خطبہ پڑھا گیا جو اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے تھے، اس لئے ان کا خطبہ بھی جناب ہمایوں کبیر صاحب ہی نے پڑھا، جس میں ان کی عام تحریروں کی طرح مذہبی اور فلسفیانہ رنگ غالب تھا، مشرقی فضا پیدا کرنے کے خاطر سنسکرت کے اشعار بھی نقل کئے گئے تھے۔

اسی روز ساڑھے چار بجے شام کو راشٹر پتی بھون میں تمام مندوبین صدر جمہوریہ کی طرف سے چائے پر مدعو تھے، صدر کے بجائے نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے مہمانوں کا استقبال کیا، اور مہمان نوازی کے پورے مشرقی آداب کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے مہمانوں سے ملتے رہے۔

اسی دن ساڑھے چھ بجے شام کو وگیان بھون میں پنڈت جواہر لال نے مندوبین کو مخاطب کیا، اس میں انھوں نے بتایا کہ قدیم وجدید رنگ میں کیسے ہم آہنگی ہو سکتی ہے۔

۵؍جنوری کو نو بجے سے ۱۲؍ بجے دوپہر اور پھر ڈھائی بجے سے ۵؍ بجے شام تک مختلف شعبوں کے جلسے مختلف صدارتوں کے ماتحت علاحدہ علاحدہ کمروں میں شروع ہوئے، شعبوں کی تقسیم یہ تھی:

(مصریات (Egyptology) صدر پروفیسر اے ابوبکر (۲) سامیات (Semitie Studies) صدر ڈاکٹر اے فالکنسٹین (۳) ہٹیات اور کوکیشین اسٹڈیز (Hitite & Caucacian Studies) صدر پروفیسر بورس پی اوٹ رودسکی (۴) الٹیک اسٹڈیز اور ترکولوجی (Altaic Studies Turcology) صدر پروفیسر زکی وی توگان (۵) ایرانیات (Iranian Studies) صدر پروفیسر پورداؤد (۶) انڈولوجی اینڈ انڈس سویلزیشن:

(۱) ویدک اسٹڈیز۔ صدر پروفیسر پال تھیمے (۲) کلاسیکل سنسکرت۔ صدر پروفیسر ال اسٹرن پاش (۳) مذہب اور فلسفہ۔ سدر پروفیسر اولی ورلا کومب (۴) تاریخ اور کلچر۔ صدر پروفیسر اے ال بشام (۵) جدید ہندوستانی زبانیں۔ صدر پروفیسر ہرمن برجر۔

(۷) ساؤتھ ایسٹ ایشین اسٹڈیز۔ صدر پروفیسر لی۔ جے. زویٹ ملڈر (۸) مشرقی ایشیائی مطالعات۔ صدر پروفیسر کے اینوکی (۹) اسلامیت ۔ صدر ولفرڈ کینٹول اسمتھ (۱۰) افریقیات۔ (افریکن اسٹڈیز) صدر پروفیسر ار، ڈبلیو، لی چے

سب سے زیادہ مقالات انڈولوجی کے شعبے میں تھے۔ اس کے بعد اسلامیات کا نمبر تھا، اس میں جو مقالات پیش ہوئے اور پڑھے گئے، ان کی فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) جمہرۃ الاسلام شایزاری مختار الدین احمد علی گڑھ (۲) اسلام کے تہتر فرقے عبدالعلیم علی گڑھ (۳) عربی زبان کے کچھ مسائل، اے ال الہندی الہ آباد (۴) مرزا ابوطالب خاں انگلستان کا ایک ہندوستانی سیاح (۱۷۹۹-۱۸۰۳) ثروت علی، نئی دہلی (۵) ذوالقرنین ایس. اے علی دہلی (۶) مسلمانوں کے فلسفہ میں مسرت کا تخیل، عبدالحق انصاری، علی گڑھ (۷) موسوی خاں فطرت۔ محمد اظہر انصاری، الہ آباد (۸) سلاطین دہلی کے عہد کے مشائخ کے ملفوظات کی تاریخی اہمیت۔ سید حسن عسکری، پٹنہ (۹) خلیفہ المعتصم کی فوجی اصلاحیں۔ ڈی ایالون، اسرائیل (۱۰) عیسائیوں کی تصانیف کے ذریعہ وسطی عربی زبان کا مطالعہ جے۔ بلاؤ، اسرائیل (۱۱) عہد وسطیٰ میں جلد سازی۔ گلنار کے بوش، امریکہ (۱۲) لاہور میں مسلمانوں کی قدیم ترین اثری یادگاریں۔ عبداللہ چغتائی، لاہور (۱۳) عرب و ہند کے تمدنی تعلقات۔ پی، این چوپڑا، نئی دہلی

(۱۴) مالوہ کی ایک معاصر تاریخ مآثر محمود شاہی یو۔ان۔ڈے۔، دہلی (۱۵) تھیوڈوریٹس: ڈی۔ام۔ ڈنلوپ، امریکہ (۱۶) جنگ صلیبی کے عہد کے عربی دینار۔ انڈریوالیس، اہرن کروٹیز، امریکہ (۱۷) ہندوستان اور بحر روم کے درمیان تجارتی تعلقات کی عربی دستاویزات۔ ایس۔ڈی۔گوئٹن، امریکہ (۱۸) عربی کیمیا کی ہندوستانی اصل۔ محمد یحییٰ ہاشمی، شام (۱۹) معرفت الٰہی اور خواجہ بندہ نواز احمد حسین خاں، حیدرآباد، (۲۰) لفظ اسلام اور مسلمان کے متعلق غلط فہمیاں، محمد اجمل خاں، دہلی (۲۱) کتاب التاجی مؤلفہ ابواسحٰق ابراہیم الصابی۔ محمد صابر خاں، جھار گرام (۲۲) شاہ محب اللہ الہ آبادی اور تصوف۔ یوسف حسین خان، علی گڑھ (۲۳) حافظ احمد خاں۔ محمد یوسف کوکن، مدراس (۲۴) کیرالا اور عربی زبان کی خدمت۔ اے۔ پی۔ ابراہیم کنجو، فروک (۲۵) ابوعلی الہجری اور اس کی تصنیف کتاب التعلیقات والنوادر۔ ابومحفوظ الکریم معصومی، کلکتہ (۲۶) سیرت کے ماخذ کی حیثیت سے عہد نبوی کی شاعری کا ناقدانہ مطالعہ، ام۔اے۔ معید خاں، حیدرآباد (۲۷) مغل حکمرانوں کی سیاست پر نقشبندی اثرات۔ خلیق احمد نظامی علی گڑھ (۲۸) سلمان اور ایصال کا قصہ۔ ایس پائنز، اسرائیل (۲۹) مسلمان اور مغرب کی لڑائیوں کے جغرافیائی اور سیاسی اثرات از ابراہیم ان پالی اک، اسرائیل (۳۰) حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی ولادت اور وفات کی تاریخ کا ناقدانہ مطالعہ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن اعظم گڑھ (۳۱) غرۃ الکمال۔ غلام دستگیر، حیدرآباد (۳۲) شاہ ولی اللہ اور مذہبی خیالات کی نئی تشکیل۔ غلام دستگیر رشید، حیدرآباد (۳۳) سولہویں اور سترہویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کی تحریک جدید۔ ایس۔اے۔اے۔ رضوی، الہ آباد (۳۴) سندھ میں عربوں کے کارنامے۔ ایس۔ پی۔ جصدی، لکھنؤ (۳۵) مرہٹوں کے نظام عدل پر اسلام کے اثرات ڈی، ان ساتھے پونہ (۳۶) مرزا سلیمان کے سیاسی قتل کی اہمیت۔ آر۔ام۔ ساوری۔ کنیڈا (۳۷) عربی زبان کے ضرب الامثال۔ سیلہیم، فرنکفورٹ (۳۸) صحاح ستہ اور المزی۔ عبدالصمد شرف الدین بھیونڈی (۳۹) مولانا آزاد کی تفسیر کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات۔ ام۔ام۔ صدیقی حیدرآباد (۴۰) حی بن یقظان کی تالیف میں ابن طفیل کا مقصد۔ زڈ۔اے۔ صدیقی، علی گڑھ (۴۱) عربی زبان کی اہم کتابوں میں اقتصادی نظریے جوزف ڈی سوموگئی، کیمبرج (۴۲) جدید عربی ادب میں نسیف الیازجی کے مقام سے متعلق نئی روشنی۔ اے۔ال۔ طباوی، ایشر، انگلستان (۴۳) صفی قزوینی کے سفرنامۂ حج کا ایک نادر مصور قلمی نسخہ۔ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، بمبئی (۴۴) قرآن میں اسلام اور ایمان کا تخیل۔ ام۔اے۔ روف کوالالمپور، ملایا (۴۵) مرزا ابوطالب۔

ام.اے.صدیقی علی گڑھ (۴۶) عرب اور راس امید۔مقبول احمد علی گڑھ (۴۷) ملایا میں اسلام۔ ام.اے.رؤف، کوالالمپور، ملایا۔

معارف کے ناظرین کی دلچسپی کے لئے اور دوسرے مقالے جو مختلف شعبوں میں پیش کئے گئے، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

الف۔(۱) مصر کی قومی پارٹی میں محمد فرید کی قیادت کا جائزہ؛ مصطفی کامل، ہنولولو، ہوائی (۲) مشرق قریب میں اطالوی فن تعمیرات؛ سباتینو موسکاتی، اٹلی

ب۔ٹرکولوجی (۱) ترک اور منگول سلاطین کے عہد کی نمائندگی: ایمل اسین، استنبول (۲) عبدالکریم پانبسن کی ایک تصنیف: نورمن اٹزکوویز، امریکہ (۳) اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز کا ایک عثمانی قانون نامہ: مصطفی محمد، رومانیہ (۴) سترہویں صدی کی ترکی شاعری میں حافظ کے اثرات؛ نعیم الدین، ناگپور

ج۔ایرانیات (۱) ایرانیات کے مطالعہ میں تبدیلی کی ضرورت: سہراب باٹلی والا، بمبئی (۲) فارسی کی لوک کہانیوں میں درویش کا حصہ: ال.ای.ایل.ویل.سٹن، اڈنبرا (۳) اسلام سے پہلے کا ایران ابن خلدون کی نظر میں؛ والٹر جے فشل، برکلے، امریکہ (۴) بلوچی زبان کے جدید رجحانات: علی اکبر جعفری، طہران (۵) ہمایوں ایران میں؛ معصوم رضا کاظمی، پٹنہ (۶) ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۷ء کے درمیان ایران میں برطانیہ کی پالیسی؛ نیکی ارکڈی، کیمبرج (۷) تاجک اور فارسی زبانوں کی امتیازی خصوصیات؛ منیفر ڈلورنز، برلن (۸) اردو شاعری پر رومی کے اثرات: ایس.نعیم الدین ناگپور (۹) جدید فارسی میں افعال؛ ہربرٹ اچ پیپر، امریکہ (۱۰) عمر خیام ایک فلسفی اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے؛ اچ.بی.پول.کرشن نگر (۱۱) فارسی ادب میں شعر و شاعری کی تنقیدات: منیب الرحمٰن علی گڑھ (۱۲) مشرقی روح کی بلندی؛ ایران کا ایک مطالعہ؛ میگل النزورومیرو، میکسیکو (۱۳) ہرات کے سوال پر برطانیہ اور ایران کے تعلقات؛ پی.ان.ٹنڈن، لکھنؤ (۱۴) مکران پر کچھ تاریخی روشنی؛ نذیر احمد، علی گڑھ (۱۵) ہندوستان کے مغل حکمرانوں کے عہد کا ایک فارسی شاعر: سید حسن، پٹنہ (۱۶) فارسی زبان میں ہندوستان کا ادب العالیہ؛ ہیرالال چوپڑا، کلکتہ (۱۷) شیخ عراقی ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے؛ وائی ڈی اہوجہ دہلی (۱۸) شمس تبریزی؛ پی.زیڈ.فاروسفر، ایران (۱۹) فارسی لغت؛ ام میناوی، ایران (۲۰) ایرانی کھانے اے.اچ.زرین کوب ایران

د۔انڈولوجی (ہندوستانیات) (۱) دسویں صدی کے ایک ایرانی جغرافیہ نویس کی نظر میں

ہندوستان؛ بودھ پرکاش، چندی گڑھ (۲) پاتنجلی یوگ سوتر اور البیرونی کا ترجمہ: لی گب لم اور اس پائنز، اسرائیل (۳) گجرات کے عہد وسطی کی تاریخ نویسی کا پس منظر؛ سید اکبر علی ترمذی؛ نئی دہلی (۴) ماسٹر رام چندر؛ خواجہ احمد فاروقی، دہلی

۵؍جنوری کو ساڑھے چھ بجے شام کو مندوبین کی تفریح کے لئے ایک سنسکرت ڈرامہ اور رقص وسرود کا بھی سامان کیا گیا تھا، جن لوگوں کو اس سے دلچسپی تھی، وہ اس میں شریک ہوئے، ۶؍جنوری کو چھ بجے شام کو "انسانیت کی فلاح میں علوم مشرقی کا حصہ" کے عنوان پر ایک مذاکرہ تھا، ۹؍جنوری کو "مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلیاں" پر بھی ایک مباحثہ تھا، جس میں (۱) مولانا سعید احمد اکبرآبادی، علی گڑھ (۲) جناب سیف اللہ اسین سفیر ترکی (۳) جناب احمد حسن الفیکی سفیر متحدہ عرب جمہوریہ (۴) پروفیسر سید حسین نصر، ایران (۵) پروفیسر جے. ان. ڈی. اینڈرسن (۶) میر اقبال حسین (۷) مولانا فضل الرحمٰن (۸) پروفیسر محمد اجمل خاں (۹) اور خواجہ محمد احمد نے حصہ لیا، مذاکرہ کی بحث سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں قرآن اور حدیث کی رو سے صرف علماء ہی کے ذریعہ سے تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے۔ ۱۰؍جنوری کو ساڑھے بارہ بجے جناب ہمایوں کبیر صاحب کی طرف سے الوداعی دعوت تھی، پھر ڈھائی بجے سے پانچ بجے تک مختلف کمیٹیوں کی روداد یں پیش کی گئیں۔

کانگریس کی طرف سے اہم اور نادر مخطوطات کی نمائش بھی تھی، عربی میں حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:

(۱) کلام پاک کا آٹھویں صدی عیسوی کا ایک نسخہ، مخزونہ نیشنل میوزیم نئی دہلی (۲) مختصر الکافی (فقہ حنفی) مصنف ابوالفضل محمد بن محمد، کاتب احمد بن محمد بن احمد الدامغانی الانصاری ۴۱۷ھ (۱۰۲۷ء) مخزونہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد (۳) النکتۃ والعیون (تفسیر) مصنف ابوالحسن علی ابن محمد بن حبیب البصری (۴۵۰ھ-۱۰۵۸ء) کاتب جعفر بن علی بن ابی محمد۔ مخزونہ رضا لائبریری رامپور (۴) معونۃ المعین المختصر من سیاست الدنیا والدین (سیاست اسلامی) مصنف یوسف بن محمد بن اسحٰق الخراسانی مخزونہ سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، اس پر شاہ یمن اور مغل امراء کی مہریں بھی ہیں (۵) کتاب الفصول (طب یونانی) مصنف موسیٰ عبداللہ ۶۰۱ھ-۱۲۰۴ء) کاتب یوسف بن عبداللہ مخزونہ رضا لائبریری، رام پور (۶) کتاب المختصر فی فنون من الصنائع (صنعت) مصنف محمد بن قوامی بن صفی بن محمد ضیا ترک ناگوری عرف قاضی خاں (۸۷۷ھ-۱۴۷۲ء) مخزونہ اسٹیٹ

سنٹرل لائبریری، حیدرآباد (۷) فتاویٰ البیرانیہ (فتاویٰ) مصنف عبدالوہاب بن یزید بن ابی سعید البیرونی، مخزونہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد (۸) الاختصار والتجرید (حدیث) مصنف ابوعبداللہ محمد بن عثمان بن عمر الشافعی، مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ

فارسی مخطوطات میں دیوان حافظ، گلستاں، بوستاں، دیوان شمس تبریزی، دیول رانی خضر خاں (از امیر خسرو) آئین اکبری، شاہ جہاں نامہ، پادشاہ نامہ، طب شفا محمود شاہی کے نادر نسخے تھے، مصور نسخوں میں انوار سہلی، بابر نامہ اور تاریخ خاندان تیموریہ قابل ذکر ہیں، جن میں اکبری عہد اور جہانگیری عہد کے مصوروں کی تصویریں تھیں، ان مخطوطات میں تزک جہانگیری کا وہ قلمی نسخہ بھی تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خود جہانگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

دہلی میں انڈین انسٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا ایک اہم ادارہ قائم ہوا ہے جس کے سرپرست اور روح رواں حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ ہیں، اس کی طرف سے بھی ایک نمائش تھی، جس میں ان عمارتوں کا خاکہ دکھایا گیا تھا جو اس ادارہ کے لئے آئندہ بننے والی ہیں، پھر بہت سے قلمی نسخے بھی خوبصورتی سے سجے ہوئے رکھے تھے، ان میں ترجمہ تفسیر طبری از ابوبکر محمد بن فضل الامام کا ایک قدیم نسخہ چوتھی صدی ہجری کا تھا، احیاء العلوم کا ایک نسخہ ۵۴۲ھ کا مخطوطہ تھا لوائح جامی کے ایک قلمی نسخہ پر شاہ جہاں اور اس کے جانشینوں کی شاہی مہریں تھیں، مرزا صائب کے شاگرد قاسم نامی کی رباعیوں کا ایک مجموعہ بہت ہی خوشخط لکھا ہوا تھا، ہری سکھ رائے بن جیون داس کی تاریخ مجموعۃ الاخبار کی تین جلدیں بھی تھیں جس میں ہندوستان کے مغل حکمرانوں کے حالات ہیں۔

(معارف جلد ۹۳ شمارہ ۲ بابت ماہ فروری ۱۹۶۴ء)

موتمر مستشرقین عالم امریکہ میں

از

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

تمہید مجھے خیال پڑتا ہے کہ معارف نے سب سے پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں ''اٹھارہویں موتمر مستشرقین عالم، ترجمہ از فرنچ شکیب ارسلان'' کے عنوان سے اس ادارے کی سرگرمیوں سے اپنے ناظرین کو روشناس کرایا تھا، یہ میری طالب علمی اور نوجوانی کا زمانہ تھا، اس کے بعد سے بار بار اس موتمر کے اجلاسوں کی کاروائی پیش کی جاتی رہی، گزشتہ اجلاس تو دہلی میں ہونے کی وجہ سے اہل ہند اب اس سے خوب واقف ہو چکے ہیں۔

اب کی دفعہ ستائیسواں اجلاس امریکہ کی دعوت پر مچیگن یونیورسٹی میں ہوا ہے جو آن آربور نامی شہر میں ممالک متحدہ اور کنیڈا کی سرحد پر واقع ہے، اس بلد الجامعہ کا مطار بس میں ایک گھنٹے کے سفر پر شہر ڈیٹرایٹ میں واقع ہے جو موٹر سازی کا مرکز اور ابھی چند روز قبل گورے کالے ہنگامے میں اس بری طرح تباہ ہوا ہے کہ اربوں روپے کی جائداد آتش زدگی کے جنون کے نذر ہوئی ہے۔

مجھے اس سب سے ''مہذب'' ملک کا انتظام پسند نہ آیا، اگر شخصی مسئلے کو نظر انداز بھی کردوں کہ جامعہ مچیگن کا دعوتی ہونے کے باوجود مجھے ویزا ملنے میں چھ ہفتے کا انتظار کرنا پڑا (اور سفر سے اڑتالیس گھنٹے پہلے تک خبر نہ تھی کہ اجازت ملے گی بھی یا نہیں) یہ امر قابل ذکر ہے کہ موتمر کا افتتاحی اجلاس ۱۳/اگست کو ہو گیا، اور ہمیں دعوت دہندۂ جامعہ کی طرف سے مہیا کیے ہوئے خصوصی طیارے میں اس اجلاس کے ختم ہونے کے بعد آدھی رات کو پہنچایا گیا، (حالانکہ ابتدائی اطلاع یہ تھی کہ ہم اجلاس سے قبل کی رات کو پہونچیں گے، پھر بلا اطلاع ہوائی کمپنی نے تاریخ بدل دی) اسی طرح پاریس سے دو خصوصی طیارے مقرر کئے گئے، پھر بکثرت لوگوں کو یہ اطلاع دی گئی کہ جگہ نہ ہونے کے باعث ان کو طیارے میں نشست نہیں مل سکتی اور بالآخر روانہ صرف ایک طیارہ ہوا

یہ ہے مشتے نمونہ از خروارے، خیر۔

ہمارے پان امریکن کمپنی کے طیارے میں ایک سو ساٹھ مسافر تھے، یہ طیارہ پارلیس سے شام کے ساڑھے پانچ بجے اڑا، (پارلیس میں ان دنوں آٹھ بجے غروب آفتاب ہوتا ہے) چونکہ مغرب کی سمت میں جا رہے تھے اور طیارے کی رفتار چھ سو میل فی گھنٹہ اور بلندی ماؤنٹ ایوریسٹ سے بھی اونچی تینتیس ہزار فٹ پر تھی، نتیجہ یہ ہے کہ آفتاب نے ڈوبنے کا گویا نام ہی نہ لیا، جب ہماری گھڑیوں میں "آدھی رات کے بعد دو بجے تھے کہ طیارے میں سے سورج ڈوبتا نظر آیا، اگر کوئی شخص روزہ ہوتا تو سحری کے بعد افطار تک چوبیس گھنٹے ہو جاتے، (اگر افطار مقامی غروب کے حساب سے کیا جائے) مزید آدھ گھنٹہ بعد مطار پر اترے تو معلوم ہوا کہ مقامی وقت مغرب کے ساڑھے نو بجے ہیں، واپسی میں مشرق کی طرف پرواز کرنی ہے، اس لئے رات کے دس بجے اڑنے پر دو تین گھنٹے بعد آفتاب طلوع ہو جاتا ہے، اور کل دس گھنٹوں کی پرواز کے بعد امریکا کے حساب سے تو رات ہی کو، لیکن پارلیس میں دوپہر سے کچھ پہلے پہونچتے ہیں، نماز اور روزے کے اوقات کا کوئی حل ہمارے فقہا کو نکالنا ہوگا۔

جاتے وقت مختلف جزیروں وغیرہ کے علاوہ ایک مرتبہ ہماری توجہ اس پر منعطف کرائی گئی کہ ہمارے نیچے سمندر میں چار چار آئسبرگ (برف کے پہاڑ) تیر رہے ہیں کوئی چھ میل کی بلندی پر سے یہ ایک متوسط قد و قامت کے جہاز کی طرح نظر آ رہے تھے، اور سفید چمک رہے تھے۔

سفر اگرچہ پارلیس سے شروع ہوا، لیکن سارے مسافر فرانس کے باشندے نہ تھے، ان میں مختلف ملکوں کے فرنگیوں کے علاوہ متعدد ہندوستانی (جن میں ایک گیروے لباس میں بدھ مت کے لاما بھی تھے) مصری، لبنانی، مراکشی وغیرہ بھی سوار تھے۔

جامعہ مچیگن

جامعہ مچیگن جو شہر ان آربور میں واقع ہے، ممالک متحدہ امریکہ کی قدیم اور بڑی جامعات میں سے ایک ہے، اور موتمر مستشرقین عالم کے اجلاس کے لئے اس کا انتخاب بتاتا ہے کہ ملک میں اس کا کیا پایہ ہے، یہاں کچھ نہیں تو سو سال سے علوم مشرقیہ سے دلچسپی لی جا رہی ہے، وہاں کے ذیل کے شعبے اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔

(۱) مشرق قریبہ کی زبانیں اور ادبیات، جو عملاً عربی اسلام کے متعلق ہے اور مراکش سے بغداد تک کے رقبہ کی قدامت و معاصرت پر حاوی ہے۔ (۲) جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے مسائل کا مرکز، ایران، افغانستان، براعظم ہند، ملایا اور انڈونیشیا کے ذریعہ سے عجمی اسلام سے

اختصاص رکھتا ہے۔ (۳) روسی اور مشرقی یوروپ کے مسائل کا مرکز ضمناً ہی سہی ترکی اسلام سے متعلق ہے، ان کے علاوہ قانون، موسیقی، جغرافیہ وخرائط (نقشہ ہائے ممالک) حتی کہ نباتات اور آبی وسائل (مچھلی، پٹرول) وغیرہ کے شعبوں میں بھی مسلمانوں کے وطن سے بڑی بحث ہوتی ہے، مثال کے طور پر ڈاکٹر اسٹیورات نے چالیس سال تک راولپنڈی کے گورڈون کالج میں نباتیات کا پروفیسر رہنے کے بعد اپنی آخری زندگی مچیگن ہی میں شعبہ نباتات میں گزاری، اور وہاں کے ذخیرۂ نباتات کو ہمالیہ اور ہمالیہ تلے کے بے شمار پودوں کے اضافے سے ترقی دی۔

یہاں کا شعبۂ تعلیمات و تقابلی طریقۂ تدریس بھی قابل ذکر ہے، اس کی بہ کثرت سرگرمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ بمبئی اور بڑودہ کے اساتذہ تعلیمات مچیگن بلائے گئے اور ان کی جگہ مچیگن کے اساتذہ بمبئی اور بڑودہ میں کام کرنے لگے، اس طرح کا کام لبنان اور ازبکستان جیسے اسلامی علاقوں میں بھی ہوا، ازبکستان کے متعلق شائع شدہ رپورٹوں سے واضح ہے کہ روسیوں نے وہاں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے اور اہل ملک وہاں بیسویں صدی کی صنعت اور آلات وغیرہ اور نیز زراعت میں اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ اسے انقلاب انگیز کہا جاسکتا ہے اس شعبے کی سرگرمیوں کا منشا زیادہ تر بیرونی ممالک کے متعلق معلومات جمع کرنا ہے، جسے کوئی چاہے تو جاسوسی کہہ سکتا ہے۔

یہاں کے عجائب خانوں اور کتب خانوں میں بھی اسلامیات کا کافی ذخیرہ ہے، اگرچہ مخطوطات میں کوئی خاص نوادر نہیں ملتے ہیں، یہاں کی انجمن شرقیات (ایسوسی ایشن فار ایشین اسٹڈیز) بھی قابل ذکر ہے جو خود بھی کتب و رسائل چھاپتی ہے اور تنگدست علما کو تالیفیں چھاپنے میں مالی مدد بھی کرتی ہے اور آخر میں یہاں کے مسلمان طلبہ کی ایک بڑی انجمن ہے، اس کے پاس ایک بڑی عمارت ہے، جس میں ایک مسجد بھی ہے۔

شرکائے موتمر تقریباً پچاس ملکوں سے کوئی ڈھائی ہزار عورت مرد اہل علم نے شرکت کی اطلاع دی، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کتنے لوگ حقیقت میں آئے، مثلاً فہرست میں لبنان سے صلاح الدین المنجد کا ذکر تھا، مگر وہ نظر نہ آئے، دارالمصنفین کے فاضل وعزیز محترم مولوی صباح الدین (۱) کا اور میرا مقالہ دونوں ایک ہی وقت میں تھے میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ تشریف لائے یا نہیں، جم غفیر میں وہ نظر تو نہ آئے، ممالک متحدہ امریکہ اور کنیڈا میں متوطن یا ملازم مسلمانوں میں اب کافی اہل علم

(۱) معارف: اپنا مقالہ بھیج دیا تھا خود نہیں گئے تھے۔

نظر آتے ہیں، مثلاً کینیڈا سے آنے والوں میں عزیز احمد، محمد انوار الحق اور ایک احمقانہ نام والے ''عبدل ایس سیرت'' (شاید عبدالسلام کی خرابی ہے) فہرست میں نظر آئے، انوار الحق صاحب مدراس کے مشہور ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے فرزند ہیں، جب ولایت میں تعلیم پا رہے تھے تو بڑی داڑھی کے ساتھ باپ کے ہو بہو تھے، کینیڈا میں ان کی بیوی پروفیسر ہیں اور یہ خود تعلیم پا رہے ہیں، انگلستان سے آنے والوں کی فہرست میں میاں محمد سعید کا ذکر ملا، فرانس سے کچھ نہیں تو نصف درجن مسلمان آئے لیکن ان سارے فرنگستانی مسلمانوں میں نومسلم میرے علم میں نہ آئے، صرف ایک جرمن کے متعلق نجی اطلاع ہے کہ وہ کبھی کبھی جمعہ اور عیدین میں نماز میں شرکت کے لئے آجاتے ہیں، اگرچہ اپنے اسلام کا انھوں نے کبھی زبان سے اقرار نہیں کیا ہے، البتہ ایک فرانسیسی خاتون نے اقرار کیا کہ وہ مسلمان ہو چکی ہیں۔

پاکستان سے تو خیر مسلمان ہی آسکتے ہیں، لیکن ہندوستان سے دلی اور علی گڑھ وغیرہ سے کئی مسلمان آئے تھے اور ملاقات بھی ہوئی، بمبئی کے ڈاکٹر حسین ہمدانی مرحوم کے فرزند عباس ہمدانی بھی اپنی بیوی کے ساتھ آئے تھے، موروثی شغف فاطمیات کے متعلق جاری ہے۔

حیرت اس پر ہوئی کہ مالیزیا سے آنے والوں کی کافی اچھی فہرست میں سب کے سب چینی تھے، ایک بھی مسلمان کا نام نظر نہ آیا، اور اس پر حیرت تو نہیں دل کی سوزش ضرور ہوئی کہ حالیہ ہنگاموں سے قبل کے اسرائیل میں لاکھوں ہی مسلمان تھے، لیکن ان میں سے کوئی علما کی صف میں نظر نہیں آتا کہ موتمر مستشرقین کے لئے آئے، ان بیچاروں کا روزگار تو خاکروبی اور حمالی رہ گیا ہے، اللہ ان پر رحم فرمائے۔

روس کی سیاست میں بھی کافی انقلاب ہوگیا ہے اور وہاں کے بڑے سرکاری وفد میں بہ کثرت اسلامی نام ملے، اور ان کے القاب میں ''روسی اکادیمی علوم کا رکن'' بتاتا ہے کہ بڑے پائے کے لوگ ہیں، البتہ اکثر کے مقالوں میں عصر جدید کا عنصر زیادہ تھا، گویا ''علم کی خاطر علم'' سے کہیں زیادہ سیاست اور ملکی پالیسی کی خدمت پیشِ نظر معلوم ہوئی، مگر دم آخر روس نے حالیہ فلسطینی جنگ کے باعث موتمر کا مقاطعہ کیا اور روس سے کوئی نہیں آیا۔

یہ بات اتنی بری نہیں جتنی کانفرنس کے سربرآوردہ اور کرتا دھرتا ''برادران یوسف'' کا یہ رجحان کہ مسلمانوں کو تاریخ میں ظالم ہونا عربوں اور ترکوں کے جھگڑے کو تازہ اور تیز کرنا اور یہ سب بلادِ مقدسہ کی تازہ تجسس کی ادامت کی کوشش میں۔

مہمان نوازی کا انتظام امریکی مہمان نوازی واقعی یورپ کے مقابل بہت بہتر رہی، جامعہ کے طلبہ کے گھر میں جتنے لوگ سما سکتے تھے، (اور کئی سو لوگ وہاں رہ سکتے ہیں) ان کو رہائش اور خوراک مفت رہی، اور مچیگن سے واشنگٹن اور نیویارک نہ صرف مفت لے جایا اور وہاں پھرایا گیا بلکہ وہاں کا ہفتہ بھر کا قیام بہت اچھے ہوٹلوں میں مفت ہی رہا (بجز خوراک کے) حسب معمول ضیافتیں، ریسپشن، مچیگن کے گورنر کی آمد اور خیر مقدمی تقریر، اقوام متحدہ کی طرف سے بھی خیر مقدم عمل میں آئے۔

لیکن شروع میں کہا گیا تھا کہ موتمر کے انعقاد کے وقت سارے مقالوں کے خلاصے، ایک ایک صفحے پر، کتابی صورت میں چھاپ کر مفت بانٹے جائیں گے، تا کہ ارکان ان کا سرسری مطالعہ کر کے جس مقالے کو چاہیں اپنی شرکت کے لئے منتخب کر سکیں، اور یہ کہ کامل مقالے بعد میں چھاپے جائیں گے، اور موتمر کے ارکان کو حسب عادت مفت مہیا کئے جائیں گے، پھر جب اجلاس شروع ہوا تو اطلاع دی گئی کہ بیچارہ امریکہ اتنا غریب ہے کہ مقالوں کے خلاصے چھاپ نہ سکا، اور سارے مقالوں کو بھی چھاپنے سے قاصر ہے، صرف ایک ایک صفحے کے خلاصے آئندہ اجلاس تک چھاپ کر شائع کئے جائیں گے، اور اگر کوئی صاحب اپنا مقالہ یا اس کا ملخص کہیں اور چھاپ لیں، تو پھر "بخوشی" اس کا خلاصہ بھی اس روداد کی جلد سے حذف کر کے وہاں صرف حوالہ دے دیا جائے گا کہ فلاں جگہ چھپا ہے۔ وجہ؟ بتایا گیا کہ مصارف طباعت زیادہ ہیں، اور یہ امریکہ کی استطاعت سے باہر ہیں۔

قبل اس کے کہ موتمر کے مقالوں کا ذکر کروں، امریکہ میں اسلام کے متعلق کچھ مشاہدات عرض کروں گا۔

امریکہ میں اسلام ممالک متحدہ امریکہ میں کہتے ہیں کہ دو ہزار جامعات ہیں، سرکاری بھی نجی لوگوں کی بھی، مجھے شروع میں یقین نہ آیا، لیکن جب یہ دیکھا ایک شہر واشنگٹن میں جس کی آبادی آٹھ لاکھ سے بھی کم ہے، پانچ یونیورسٹیاں ہیں، تو دو ہزار کی تعداد کو قرین قیاس ماننا پڑا، امریکہ میں یہ قانون ہے کہ طلبہ کے ہر گروہ کو دینی اور ثقافتی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں، چنانچہ جس جامعہ میں مسلمان طلبہ ہوں وہاں انجمن طلبہ کے مکان میں ایک کمرہ مسلمانوں کو بھی ملتا ہے جسے وہ عام طور پر نماز گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، آن آربور کی جامعہ مچیگن میں سات آٹھ مسلمان طلبہ معلوم ہوئے، یہ اپنی "مسجد" میں جمعہ کی نماز بھی پڑھتے ہیں اور باری باری سے ہر طالب علم

خطیب وامام بنتا ہے، یہاں اور کنیڈا میں بہ کثرت جامعات میں مسلمان اساتذہ بھی نظر آتے ہیں۔

مسلمان طلبہ کی تعداد کم ہے اور سارے ملک میں منتشر ہیں، اس کا درماں یہ کیا گیا ہے کہ ''وفاقِ مسلم طلبہ ممالک متحدہ وکنیڈا'' کے نام سے ایک مرکزی انجمن بنائی گئی ہے اور ہر سال اس کا کسی نہ کسی جامعہ میں اجلاس ہوتا ہے، امریکہ کی آب وہوا میں عملیت وحرکت ہے، الحمدللہ یہ انجمن بھی کافی کارگذار ہے، مالی وسائل بھی ہیں، کتابیں رسالے بھی چھپتے ہیں، ان انجمنوں کے سربراہ یا تو عرب طلبہ ہوتے ہیں (زیادہ تر شامی) یا پھر ہمالیہ تلے کے براعظم کے دیگر ممالک کے مسلمان طلبہ، خاص کر سیاہ فام طلبہ ابھی کم نظر آتے ہیں۔

امریکہ میں گوری ماؤں کو بچے کم ہوتے ہیں، کالی رعیت کی تعداد قدرتی طور پر بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے، چھ سات بچے، اوسط تعداد ہیں، گوروں کالوں کی کشمکش کی تہ میں ایک راز یہ بھی ہے، اسی لئے حکومت سارے وسائل سے کوشش کررہی ہے کہ باہر سے آنے والے صرف گورے ہوں اور بہ کثرت ہوں جب انسان صریح ناانصافی کرتا ہے تو قدرت بالواسطہ کوئی اور تدبیر کرلیتی ہے۔

ہر فرنگی ملک کی طرح امریکہ میں بھی اسلام اب کافی تیزی سے پھیل رہا ہے، صوبہ مچیگن ہی میں پانچ مسجدیں ہیں، خاص کر شہر ڈیٹرائٹ کی مسجد میں کچھ نہیں تو دو ہزار کی جماعت ہوسکتی ہے۔

گوروں کالوں کی کشمکش دودھاری تلوار ہے، اس سے کالوں کو عیسائیت سے نفرت اور اسلام کی طرف کشش بڑھ رہی ہے، امریکہ میں کچھ نہیں تو پندرہ فی صد آبادی سیاہ فام ہے، (بعض صوبوں میں ان کی اکثریت بھی ہے، مچیگن میں وہ تہائی تک پہونچ گئے ہیں) ان سیاہ فاموں کو ایک زمانے میں جبراً عیسائی بنالیا گیا تھا، اب ان میں سے دو تہائی دوبارہ مسلمان ہوگئے ہیں، لیکن نسلی جھگڑوں کے باعث بارہا کالے مسلمانوں کی انجمنوں بلکہ مسجدوں میں بھی گورے مسلمانوں کا داخلہ بند ہے، گورے مسلمانوں میں بھی مماثل برائی نظر آتی ہے، اور اس کا حل اس وقت تک مشکل ہے، جب تک کہ نسلی کشمکش کا سیاسی حل نہ نکل آئے، اس حل میں اسلام بیشک ہاتھ بٹا رہا ہے، لیکن نسلی کشمکش صحیح اسلام کے پھیلنے میں ایک رکاوٹ بھی بن گئی ہے۔

امریکہ بڑا کٹر دین پرست عیسائی ملک ہے، عیسائیت کی تبلیغ پر جتنی دولت وہ صرف کرتا ہے، وہ سبق آموز ہے۔ اپنے قیام کے زمانہ میں واشنگٹن اور نیویارک میں میں نے دیکھا کہ ہوٹلوں کے ہر ہر کمرے میں میز کے خانے میں جہاں کچھ اسٹیشنری کاغذ لفافے اور اشتہار ہوتے

ہیں، وہیں بائبل کا ایک نسخہ بھی ہوتا ہے کہ مسافر اس کا مطالعہ کرے، عموماً امریکی بائبلوں کے شروع میں ایک انڈکس (اشاریہ) بھی ہوتا ہے کہ عیسائیت کی اچھی تعلیمات کن کن صفحوں میں ہیں، موتمر مستشرقین کے ارکان کو ایک رات ایک فلم دکھائی گئی ''یمن، حضرت موت اور مسقط وعمان کے آثار قدیمہ'' ان کھنڈروں کو کھودنے والوں کے ساتھ بتایا گیا کہ ہمیشہ مشنری ڈاکٹر بھی ہوتے ہیں اور وہ مقامی آبادی کا مفت علاج بھی کرتے ہیں اور ان کو باور کراتے ہیں کہ یہ طبابتی علم وحکمت عیسائی مذہب کی وجہ سے ہے، (اور غالباً انفرادی تبلیغ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ بیماری مسلمان ہونے کی وجہ سے ہے)۔

نیویارک میں مسلمانوں کے متعدد بلکہ بہ کثرت ادارے ہیں، ''اسلامک سینٹر'' جزیرۂ مانہاٹن میں دریا کنارے پرفضا مقام پر ہے اور اس کا امام ازہر (مصر) کی طرف سے آتا ہے، ڈاکٹر محمد عبدالرؤف ازہر کے بھی تعلیم یافتہ ہیں، اور کیمبرج ولندن کے بھی سند یافتہ، وہ ہردلعزیز ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ آج کل عید کی نماز کسی ہوٹل کے بڑے ہال میں پڑھی جاتی ہے، لیکن اب ایک مسجد کے لئے زمین خریدنے کا انتظام ہوگیا ہے، ''اسلامک مشن'' بروکلین کے محلہ میں ہے، جسے ایک مغربی مہاجر (بہ ظاہر طرابلس الغرب والے) اپنے مصارف پر چلارہے ہیں، کئی منزلہ مکان ہے، جن میں ایک بڑی مسجد بھی ہے، ایک ماہوار رسالہ بھی نکالتے ہیں کہہ رہے تھے کہ پچپن سال سے مقیم ہوں جب یہاں آیا تو نسلی کشمکش اتنی شدید تھی کہ ایک دن برسرراہ میری ہر چیز لوٹ لی گئی اور ننگ دھڑنگ ایک میل پیدل چل کر گھر واپس آیا اور پولیس نے دخل دہی غیر ضروری خیال کی، کوئی پچاسی سالہ یہ شیخ اب بھی تنومند اور سرگرمی سے اپنے کام میں مصروف ہیں۔

فرانس میں اسلام زیادہ تر تصوف کی راہ سے پھیل رہا ہے، تو امریکہ میں میرے ملاقاتیوں کے بیان کے مطابق عقل کی راہ سے۔ لیکن ہر جگہ ناصح بے عمل سے زیادہ مضر کوئی مبلغ نہیں پایا گیا۔

امریکہ میں عجائب خانوں اور کتب خانوں میں اسلامی چیزوں کی کمی نہیں اور وہاں ہر چیز بڑے پیمانہ پر ہوتی ہے، واشنگٹن میں ''لائبریری آف دی کانگریس'' کہنے کو تو پارلیمنٹ کا جز اور ارکان پارلیمنٹ کے استفادہ کے لئے ہے لیکن وہ ہر شخص کے لئے کھلی ہوئی ہے وہاں اب کتابوں رسالوں وغیرہ کی تعداد چون ملین سے کچھ زائد (ساڑھے پانچ کروڑ) ہوگئی ہے! دو وسیع عمارتیں ناکافی ثابت ہوگئی ہیں، اب ایک تیسری بڑی عمارت بن رہی ہے، اس میں اردو کتابوں کا بھی کافی ذخیرہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے تراجم قرآن مجید کے سلسلے میں یہاں کچھ تلاش کی تو انڈونیشیا، بنگال

وغیرہ کے متعدد تازہ ترین تراجم کا پتہ چلا، ان سے میں واقف نہ تھا، واشنگٹن کی مسجد جسے مسلمان ممالک کے سفیر چلاتے ہیں، بہت خوبصورت ہے، ساتھ ہی ایک مختصر دارالمطالعہ بھی ہے، پارلیس کی طرح یہاں بھی مسلمانوں سے زیادہ سیاح تفریح کے لئے آتے ہیں۔

امریکہ میں یہودیوں سے نفرت بڑی شدید ہے (لیکن وہ تجارت، صنعت، صحافت وغیرہ پر چھائے ہوئے ہیں) اور امریکہ ان کی تائید بہ ظاہر اس لئے کررہا ہے کہ وہ امریکہ چھوڑ کر فلسطین یا کہیں اور جا بسیں اور ان سے پیچھا چھوٹے۔

ایک عجیب وغریب معاملہ یہ مشاہدے میں آیا کہ امریکہ والوں کو یا تو سیاست و دفتریت سے دلچسپی ہے یا تجارت سے۔ کم ہی لوگ اعلیٰ تعلیم پاتے ہیں، اساتذہ اور بڑے انجینئر بہ کثرت باہر کے مستعار یا تازہ وارد لوگ ہیں، بیرونی زبانوں ہی کے لئے نہیں عام علوم کے لئے بھی مختلف ممالک کے مسلمانوں اساتذہ جابجا جامعات میں ملتے ہیں (ہندو بھی ہیں) یہ چیز ممالک متحدہ امریکہ میں بھی ہے، کینیڈا میں بھی، جنوبی امریکہ میں بھی آزاد پیشوں میں ڈاکٹروں کی بھی بڑی مانگ ہے، اور ان میں بھی بہت سے مسلمان نظر آتے ہیں۔

موتمر مستشرقین کی علمی کارکردگی

ستائیسویں بین الممالک موتمر مستشرقین اگست ۱۹۶۷ء کی (۱۳) سے (۱۹) تک شہر آن اربور میں منعقد ہوئی، چونکہ کوئی ڈھائی ہزار اہل علم کا مجمع ہوگیا تھا، اس لئے تقسیم کار کی ضرورت تھی، یہ تقسیم کچھ زیادہ علمی نہ تھی بلکہ بے تکی سی معلوم ہوتی تھی، چنانچہ

شعبہ (۱) مشرق قریبہ (۲) مشرق قریبہ اور عالم اسلامی (۳) جنوبی ایشیا قدیم زمانے میں (۴) جنوبی ایشیا جدید زمانے میں (۵) جنوب مشرقی ایشیا (۶) چین قدیم (۷) چین جدید (۸) جاپان (۹) کوریا (۱۰) وسطی ایشیا اور آلتائی (ترکی) امور (۱۱) اجتماعی مباحث (آبادی، فنونِ لطیفہ، دفتریت، مغربی تہذیب کا اثر مشرقی قوموں پر، موسیقی، قدیم امریکہ کا تعلق مشرق سے، کتب خانے۔ زراعت کی اصلاح مشرق میں، ادبیات میں انقلابی رجحانات، مشرقی علوم کے مطالعے کے ادارے مختلف ممالک میں وغیرہ)۔

ان میں سے نمبر ۲ اور نمبر ۱۰ کو غالباً سیاسی مصلحت سے جدا کیا گیا تھا، حتیٰ کہ ان کے اجلاس بھی الگ الگ عمارتوں میں رکھے گئے، جن میں باہم میل بھر کا فاصلہ تھا، نمبر ۳ میں ہندوستان اور نمبر ۴ میں انڈونیشیا و ملایا سے بھی اسلام کو گہرا تعلق ہے مگر انھیں الگ کیا گیا تھا، اسلام کی اہمیت

گھٹانے کی اس کوشش میں اس کی اہمیت بڑھ ہی گئی کہ ایک کی جگہ کئی شعبوں میں زیادہ تر اسلام ہی کا ذکر تھا۔

یہی نہیں ہر شعبے کے ذیلی شعبے بھی تھے اور سب بہ یک وقت جمع ہوتے تھے، مثلاً شعبۂ دوم کو بتیس ذیلی شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کم لوگوں کے مقالے کوئی شخص سن سکتا تھا۔

اسلامیات پر مقالے مسلمانوں ہی نے نہیں غیر مسلم اہل علم نے بھی پڑھے، ایک ہزار نہیں تو کئی سو مقالے اسلامی دلچسپی کے تھے، سب کی تفصیل افسوس ہے کہ ممکن نہیں، کچھ مقالے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر تھے، تو کچھ مسلمانوں کی تاریخ و تمدن کے متعلق، اسی طرح مسلمانوں کی بستیوں اور ملکوں کی پرانی تاریخ پر حتی کہ جس چیز کو مثلاً خالص یہودی تصور کیا جاتا ہے، اس سے بھی مسلمانوں کو گہرا تعلق ہے، مثلاً ''حضرت سلیمانؑ کے نظم و نسق کی بعض تفصیلیں''۔

نمونہ از خروارے چند، مقالوں کے عنوانوں کا ذکر کرتا ہوں، خدا ہی بہتر جانتا ہے یہ کب اور کہاں چھپیں گے۔

شعبۂ اول: (۱) معزز جیگ (ترکی): استانبول کے عجائب خانوں میں مساری کتبوں کا ذخیرہ (۲) مائکل روٹن (امریکہ): دریاؤں کا اثر عراقی تمدن پر (۳) ماری لویز بول (ڈنمارک) خریبۂ صیلون میں ڈنمارکی آثار قدیمہ کی کھدائیاں (۴) ماری لویز شومون (فرانس): ساسانی دور کے ماتحت بادشاہ و حکمراں حیرہ وغیرہ میں (۵) صبری تبریزی: شیطان اور شر ایرانی خرافات میں (۶) نیڈلر (کینیڈا): وادی حلفاء کے قریب جبل شیخ سلیمان کی چٹانوں پر چند قدیم کندہ تصویریں (۷) فرکوتر (فرانس): نوبیہ میں فرانسیسیوں کی آثار قدیمہ کی کھدائیاں (۸) پرائز (انگلستان): عربوں کی تاریخ نویسی قبل اسلام میں (۹) رابرٹ اسمتھ (امریکہ) فحل (اردن) میں آثار قدیمہ کی کھدائیاں (۱۰) شیشمان (فرانس): حضرت عزیرؑ اور قرآنی آیت **قالت الیھود عزیر ابن الله**

شعبۂ دوم: (۱) سید حسین نصر (ایران) شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی کی کتابیں (۲) برمان (امریکہ) ارسطو کی کتاب اخلاق کا اثر قدیم عربی کتب فلسفہ پر (۳) اینڈریس (جرمنی) یونانی سے عربی میں ترجمہ اور عربی اصطلاحات فلسفہ (۴) تحسین یازیجی (ترکی) عبداللہ انصاری کی ایک گمنام تالیف (۵) محمد باقر (پاکستان) قدیم زمانے میں فارسی کی ترقی، ہمالیہ تلے کے براعظم میں (۶) احمد برکات (سوئٹزرلینڈ) ہندوؤں کا حصہ فارسی نثر نگاری میں (۷) ٹائفل (بلجیم) عربی

معاہدات لسانیاتی نقطہ نظر سے (۸) نہاد چیتن (ترکی) زوزنی کی حماسۃ الظرفاء (۹) بائزیکس (جرمنی) ثعلب کی کتاب قواعد الشعر (۱۰) صلاح الدین البحیری (مصر) الناصر داؤد کے خطوط (۱۱) لوئی گاردے (فرانس) وحی کا اثر اخلاق اور سیاست پر (۱۲) لیون (انگلستان) مسلمانوں کے شہر ساتویں سے بارہویں صدی ہجری تک (۱۳) کیڈی (امریکہ) جمال الدین افغانی کا اثر حالیہ اسلامی بیداری پر (۱۴) سعید رمضان (سوئٹزرلینڈ) اسلام اور عربوں کی (جاہلانہ) قوم پرستی (۱۵)؟ (چیکوسلواکیا) صدرالدین عینی کی تالیفیں (۱۶) محمد خلف اللہ احمد (مصر) فصیح عربی کا اثر جدید عربوں کی زندگی اور فکر پر (۱۷) ام ملکوف (فرانس) ترکی کی پیشہ وارانہ انجمنیں (آخی) (۱۸) فاروق سومر (ترکی) ہیمنجی قبیلے کے سردار کی یادداشت (۱۹) مرزا قدیر بیگ (کینیڈا) ابن عربی پر مجدد الف ثانی کی تنقید (۲۰) سلمان تمیمی (عراق) خلافت کا اسلامی تصور (۲۱) عمر لطفی برکان (ترکی) ترکی میں سولہویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں کچھ معاشی وسماجی بحران (۲۲) کاہن (فرانس) قرون متوسطہ کے اختتام پر اسلامی معاشیات کی برتری یوروپی معاشیات پر (۲۳) سامی مکارم (امریکہ) الحاکم بامر اللہ (۲۴) ایس اے علی (ہندوستان) ابوالفیض فیضی کی ایک کم معروف فارسی لغت (۲۵) عبدالقادر قرہ خان (ترکی) سلطان سلیمان کے زمانہ کی ترکی شاعری (۲۶) ہائد (اسرائیل) ترکی کتب فتاویٰ (۲۷) روبوفسکی (ہنگری) لطافت نامۂ خجندی (۲۸) نہاد کیسکلک (ترکی) ابن عربی کی تازہ دریافت تالیف بلغۃ الحکمۃ (۲۹) جارج مقدسی (امریکہ) حنبلی مذہب اور تصوف (۳۰) احمد بن محمد ابراہیم (سنگاپور) سنگاپور میں مسلمانوں کے قانون شخصی میں تبدیلیاں (۳۱) محمود الحسن صدیقی (مکسیکو) قدیم اسماعیلی تبلیغی سرگرمی سندھ میں (۳۲) نبی بخش قاضی (پاکستان) احمد رومی کی دقائق الطریق (۳۳) ہانس کروز سے (جامعہ عثمانیہ) جھنڈا اسلامی فوج میں (لواء اور رایہ میں فرق) (۳۴) ناچیز محمد حمید اللہ (فرانس) نسی، ہجری سنہ اور ہجری و عیسوی تاریخوں کے تطابق پر ایک نئی جنتری کی تالیف کی ضرورت۔ اس کی تائید میں کانگریس نے بالاتفاق ایک قرارداد منظور کی اور تسلیم کیا کہ موجودہ جنتریاں ناقابل اعتماد ہیں۔

شعبہ چہارم: (۱) ڈاگمار برنشروف (جرمنی) ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں حیدر آباد دکن کا ایک شہر دائرۂ انتخاب (۲) سی ام نعیم (امریکہ) ہندوستانی پاکستانی کشمکش کا اثر اردو زبان اور ادب پر (۳) رفیق الرحمٰن (امریکہ) بنیادی حکومت عوام کا پاکستانی نظام اور پنچایتی راج کا ہندی نظام۔

شعبۂ دہم: (۱) زکی ولیدی طوغان (ترکی) برمکیوں کی اصل (۲) اہل خانم (ترکی) وسط ایشیا کی قدیم ترین ترکی مسجد میں فن معماری کی خصوصیتیں (۳) ماتراں (فرانس) الجزائر میں ترکی دور کے نظم و نسق کی خصوصیتیں۔

اختتامی جملہ اس ختم نہ ہونے والی فہرست کو ختم کر کے صرف یہ عرض کروں گا کہ آئندہ اجلاس کے لئے جو تین سال بعد ہوگا کوئی مقام طے نہ ہوا، ارجنٹائن کی دعوت آئی تھی، مسئلہ مجلس انتظامی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

(معارف جلد ۱۰۰ شمارہ ۵ بابت ماہ نومبر ۱۹۶۷ء)